

JANUARY 2011

سال نو مبارک

شعاع

پاک سوسائٹی

<http://www.Paksociety.com>

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

سُوال

MEMBER
APNS
CPNE

بانی و مدیر اعلیٰ: منجور گل رحمن
مدیر: رخصتہ جمیل
مدیر و نائبین: انور رحمان
مدیر و نائبین: امتیہ الصبیحہ
مدیر و نائبین: شاہین رشید
مدیر و نائبین: خالدہ خیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ سُوال

37 اردو بازار کراچی



نزلہ زکام، آنکھ کی خراش اور کھانسی!

Take No Tension
Take Sualin

with TOOT SIYAH efficacy



<http://pakfunplace.blogspot.com>

www.paksociety.com



زمرہ سالانہ بیگم ریاضی
پاکستان (سالانہ) ----- 500 روپے
اٹلیا، افریقہ، یورپ ----- 4000 روپے
امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ ----- 5000 روپے

مستقل سلسلے

- | | | | | |
|-----|-------------|-----|--------------|-------------------|
| 274 | خالہ جیلانی | 35 | رضیہ جمیل | خط آب کے |
| 280 | خالہ جیلانی | 264 | ساروشہ امینا | مُسکراہٹیں |
| 289 | ادارہ | 276 | عزول لوکان | ایٹنیہ خانے میں |
| | | 268 | شگفتہ جاہ | بالوں سے خوشبو لے |
| | | 284 | امت الصبور | بارخ کے چھوکنے |

جونری 2011
جلد 25
پرک 40

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

ماہنامہ شعاع کی ادارت و اشاعت: شہزادہ شمس الدین خان، شہزادہ شمس الدین خان، شہزادہ شمس الدین خان
Phone: 32721777, 32726817, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

ناولٹ

- | | | |
|-----|-------------|-----------------|
| 210 | زہن ممتاز | راز عشق |
| 246 | رخسانہ نگار | کوئی دستک ہو |
| 186 | قاری حجازی | ہم بہن آواز |
| 70 | ماہامدک | ایک حقیقت |
| 102 | مصباح گل | چاند کے پار چلو |

افسانے

- | | | |
|-----|-----------|-------------------|
| 59 | شریالاجہ | باوقانہ ہرکائی |
| 92 | رنا قاسم | دھڑکی کی شہ |
| 67 | مدد سحر | بھینگی جڑی کی شام |
| 128 | نجمہ ثاقب | پرکا کوا |
| 201 | شبنم لدھی | تیرا ہونے لگا ہوں |

نظمیں غزلیں

- | | | |
|-----|-----------|-----|
| 262 | جون ایلیا | غزل |
| 263 | احمد شائق | غزل |
| 262 | زاید مرق | نظم |
| 263 | عکاشہ سحر | غزل |

- | | | |
|----|-------------|--------------|
| 10 | رضیہ جمیل | پہلی شعاع |
| 11 | نعمان فاروق | حمد |
| 11 | پرویز سحر | نعت |
| 12 | ادارہ | نئی کی باتیں |

انٹرویو

- | | | |
|-----|------------|-----------------|
| 25 | ادارہ | کوئی تیا خوب ہو |
| 22 | اسلم شیخ | یادیں باتیں |
| 17 | ثابین رشید | دستک |
| 272 | دعا باشمی | شاعری |

ناول

- | | | |
|-----|-------------|-----------|
| 42 | غالیہ بخاری | دلور شہ |
| 232 | امتیہ ریاض | ستارہ شام |

مکمل ناول

- | | | |
|-----|-------------|--------------|
| 136 | نیلیہ برویج | کی کریم ناول |
|-----|-------------|--------------|

انتباہ: ماہنامہ شعاع اور اس کے تمام حقوق محفوظ ہیں، بلاشرکی امری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کاپی، ناول، یا سلسلہ کی کسی اجازت سے شائع کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی وی کی کاپی پر درآمد و مالی تحفظ اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی طرح سے شائع کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کر کے کسی صورت میں قانونی کارروائی میں ملوث کیا جاسکتا ہے۔



میرے خدا خیال کو ایسا کمال دے
اے والئی ہر دوسرا، قتل علی، قتل علی
نکر مجاز سے جو بشر کو نکال دے
تو ابتر، تو انتہا، قتل علی، قتل علی
تیرے مواسی کی طلب بھی نہ کر سکوں
تو ہے سراج شش جہات، تو رفتی گل کائنات
ہو نٹوں کو میرے صرف تو اپنا سوال دے
اے باعث ارض و سما! قتل علی، قتل علی
کر سرخرو مجھے حق و باطل کی جنگ میں
اے ساقی بیت الحرام، اے صاحب مالی مقام
باطل کا خوف بھی مرے دل سے نکال دے
بے تو ہی محبوب خدا، قتل علی، قتل علی
تیرے حضور میری جس سجود ریز ہو
ہے مقصد مقصود تو ہے حامد و محمود تو
میری زبان کو ذکر کے سانچے میں ڈھال دے
احمد، محمد، مصطفیٰ، قتل علی، قتل علی
جس روشنی سے تو نے بنائی ہے کائنات
کونی نہیں، کوئی نہیں، تجھ سا کہیں کوئی نہیں
اس روشنی سے راستہ میرا آج کل دے
تو شافع روز جزا، قتل علی، قتل علی
بخنے ہر ایک ذہن کو ہر لمحہ اک جلا
کیا قلب ہاں کیا شب لب پڑھتے ہیں مآثر کعب
نعمان کو تو حمد کا ایسا کمال دے
قتل علی، قتل علی، قتل علی، قتل علی

ہر روز مآثر

نعمان فاروق

نئے سال کا پہلا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
ایک سو صدی کا پہلا عشرہ اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ ابھی سال کا آغاز ہوا تھا کہ اختتام آ پہنچا۔ سال کو کیا
کہیں۔ یہ پورا عشرہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا۔ پتا نہیں وقت کی رفتار بڑھ گئی ہے یا تیز وقت از زندگی کا ساتھ
دیتے وقت گزرنے کا احساس مدت کیا ہے۔ جس کے پاس فرصت ہے کہ دو گھنٹی سکون سے بیٹھ کر کچھ سوچی کچھ
کئے۔ اللہ یہ چاہے دوڑتے سال احساسِ زلیاں میں اٹھا نہ کرتے جاتے ہیں۔ پچھلے ایک عشرہ میں ہم نے وقت ہی
پیسہ یاد بھی بہت کچھ گنوا دیا ہے۔ اس میں عیروں کی کرم فرمائوں کے ساتھ ساتھ ہماری اپنی کوتاہیاں بھی
شامل ہیں۔

گئے سال میں پنجاب سے نہ جھک تندر تیز ہوئی رہا اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کی لاتعداد داستانیں رقم کر گیا
اور تامل لاکھوں افراد نے سرو سامان اودے گئے ہیں۔
دوسری طرف دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نعرہ لگا کر وہ دہشت گردی کی ہمارے ہے۔ اس کا سب
بڑا باعث شاز پاکستان ہے۔

اگرچہ حالات کہیں سے بھی بہت خوش کن نظر نہیں آتے مگر کیا نہ خدا کا ارادہ ہے وہ خدا مطلق جاب ہے
ایک ہی میں نقش بدل سکتا ہے۔
فاز میں کوئی سال مبارک ہو۔ ہماری وصالے اللہ تعالیٰ ہماری خوش گما تیریں اور خوش گوار خواروں کو خوش
تعبیریں عطا فرمائے۔ گئے سال میں ہمیں جن کمینوں اور دواؤں میںوں کا سامنا کرنا پڑا، ان سے محفوظ رکھے۔ وطن عزیز
کے خصوم اور بدگناہ شہری دہشت گردی اور دہشت گردوں سے محفوظ رہیں۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- میں کی کر یار مناواں - نمید اور راجہ کا مکتب ناول،
- ماہ ملک، دشمنان لگاؤ دندان، ذہرہ ممتاز، فارحہ ارشد اور صباح گل کے ناول،
- شریا، نجم، سدھو سحر خان، ردا فاطمہ، نجم ثاقب اور نمیز لودھی کے افسانے،
- عالم بخاری اور آمد ریاض کے ناول،
- کوئی نیا خواب ہو ستار میں سے نئے سال کا خصوصی سروے،
- مشہور ڈی ٹیکہ اسلام شیع کی یادیں، باتیں،
- مشہور شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باری باتیں - امدادیت کا سلسلہ،
- شامی کی پوتی ہے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- شعلہ کا نئے سال کا شمارہ ہم نے پوری محنت سے ترتیب دیا ہے۔ اور اسے ہر لحاظ سے خوبصورت بنانے
کی کوشش کی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا بیان دنیا کی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا ہے۔

نیکی کا حکم دینے سے مراد مناسبات طریقے سے نیکی کی ترغیب دینا ہے۔ حاکم اپنی رعایا کو والد اپنی اولاد کو اور خاندان اپنی بیوی کو حکم دے سکتا ہے جس کی وہ تعمیل کرتے ہیں۔ دوسروں کو اس انداز سے حکم نہیں دیا جاتا سکتا۔ برائی سے منع کرنے کی طاقت اور طاقت سے منع کرنا (جیسے حاکم والدین اور خاندان وغیرہ) اور نہ دین سے سمجھانا ضروری ہے (جیسے عالم عوام کو سمجھانا ہے) اگر یہ بھی نہ ہو سکتا تو کلمہ سے نفرت ضروری ہے۔ گناہوں کا ارتکاب دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بن جاتا ہے لہذا توبہ کرنی چاہیے۔

برائی کو ختم کرنا

حضرت قیس بن ابی حازم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اللہ کی حمد و ثناء کی پھر فرمایا: اے لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو۔ "اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو سدا رکھو۔ جب تم ہدایت پر ہو تو گمراہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا:

آپ فرما رہے تھے۔

"لوگ جب برائی کو دیکھیں اور اسے ختم نہ کریں (اس سے منع نہ کریں) تو قہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب کی لپیٹ میں لے لے۔"

فوائد و مسائل:

عام لوگ مذکورہ بالا آیت کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ انسان خود نیکی پر قائم رہے۔ دوسروں کی کراہی سے اسے کوئی غم و غم نہیں۔ اس سے ان کے بارے میں ہر اس ہی ہو گی۔ "اگر کسی کو کلمہ سے روکنا کی کیا ضرورت ہے۔" حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے واضح فرمایا کہ آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اپنے آپ کو منہ پر رکھو تاکہ اگر کسی کی کراہی کا اثر نہ ہو جائے۔ لوگوں کو نیکی طرف بلانے اور گناہوں سے روکنے پر دوزخ تم خود ان سے متاثر ہو کر گمراہ ہو جاؤ گے۔ علاوہ ازیں لوگوں کو برائی سے روکنا نیکی پر قائم رہنے کا ایک لازمی حصہ ہے اس میں تسلی نہیں کے راستے سے انحراف ہے جو غضب الہی کا باعث بن سکتا ہے۔

کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا علم زیادہ وسیع اور گہرا تھا۔ خطبے میں عوام میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کی وضاحت اور صحیح ایمان کرنا چاہیے۔

اللہ کا عذاب

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بنی اسرائیل میں تقاضا اس طرح پیدا ہونے لگا کہ تو اپنے بھائی کو (ایک بار) کوئی گناہ کرتے دیکھتا تو اسے منع کرتا پھر اگلے دن اسے گناہ کرتے دیکھتا تو اس

کی وجہ سے وہ اس کا ہم نوا اور ہم راہ اور ہم راہ بننے سے نہ رکنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ایک دوسرے سے ملا دیے۔ ان کے بارے میں قرآن نازل ہوا اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ترجمہ: بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبانی لعنت کی گئی اس وجہ سے کہ وہ منافق بنائیں کرتے تھے اور حد سے بڑھ جاتے تھے اور وہ جو برے کام کرتے تھے ان سے ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے۔ وہ جو کچھ کرتے تھے جتنا بہت برا تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ کافروں سے دوستی کرتے ہیں۔ بہت برا ہے جو کچھ انہوں نے اپنے لیے آگے بھجوا دیا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے اور اگر وہ اللہ پر نئی پر اور نئی برائیاں ہونے والی شریعت پر ایمان رکھنے والے ہوتے تو ان (کافروں) سے دوستی نہ کرتے لیکن ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔"

عذاب سے بچنا

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے تھے آپ سنا ہے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: "میں (تم عذاب سے نہیں بچ سکتے) حتیٰ کہ غلام کا ہاتھ پکڑ کر (اسے علم سے روک دو نور) اسے حق قبول کرنے پر مجبور کر دو۔"

حق بات کہنا

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ نے اس میں یہ بھی فرمایا: "خبردار! کسی آدمی کو لوگوں کی فحشیت حق کہنے سے روک نہ دے جب کہ اسے (حق) معلوم ہو۔" یہ کہہ کر حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ روئے اور فرمایا: قسم ہے اللہ کی! ہم نے کئی (غلط) چیزیں دیکھیں

لیکن (انکار کرنے سے باز رہے)۔ فوائد و مسائل:

جب معلوم ہو کہ فلاں کام ناجائز ہو رہا ہے اور شریعت کا حکم یہ ہے تو حق بیان کرنا چاہیے مثلاً غلط کام کرنے والوں کو ہدایت نصیب ہو جائے یا کم از کم دوسرے لوگوں کو شرعی حکم معلوم ہو جائے اور وہ غلط کو حق نہ سمجھ لیں۔ جب جان چلے جائے یا سخت نقصان کا اندیشہ ہو تو خاموش رہنا جائز ہو گا۔ بہت ایسے موقع پر بھی افضل یہی ہے کہ عزمیت کا راستہ اختیار کر کے حق بیان کیا جائے اور اس راہ میں آنے والی مشکلات اور تکلیفوں کو برداشت کیا جائے جیسے امام مالک امام احمد بن حنبل اور امام ابن قسیر رحمۃ اللہ وغیرہ نے کیا۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کوئی شخص اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔" صحابہ نے کہا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کوئی شخص اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وہ ایسا کام ہو گا جتنا ہے جس کے بارے میں اللہ کی طرف سے اس پر ہونا ضروری ہے پھر وہ اس کے بارے میں بات نہیں کرتا (اور غلط کام سے منع نہیں کرتا) اسے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھے فلاں مسئلے میں بات کرنے سے کیا رکاوٹ تھی؟ وہ کہے گا لوگوں کا خوف تھا۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "تیرا زیادہ حق مجھ ہی سے ڈرنے کا تھا۔"

عذاب نازل ہونا

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جن لوگوں میں اللہ کی نافرمانی کی جائے جب کہ وہ (گناہ کرنے والوں سے) زیادہ طاقتور اور زیادہ زور آور ہوں اس کے بارے میں (مجرموں کو گناہ سے) منع نہ کریں

جن کی بات کرنا ہے۔
فوائد مسائل :

مسلمان بادشاہ ظالم بھی ہو تو اس کے خلاف بیعت نہیں کی جاتی لیکن اسے ظلم سے روکنا ضروری ہے۔ چونکہ ظالم بادشاہ کا مقابلہ اس طرح نہیں کیا جاتا جس طرح کافروں سے جنگ کی جاتی ہے اس لیے غلامی ہاتھ محض دلا کر اسے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اسے تبلیغ کرنا زیادہ جرات و بہادری کا کام ہے کیونکہ عام طور پر ایسے فرد سے کسی خطرہ ہوتا ہے کہ وہ قتل کر دے گایا قید کر کے طرح طرح کی تکلیفیں دے سکے۔

کنزور ایمان

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مروان نے عید کے دن منبر نکلویا (اور عید گاہ میں رکھا) اور نماز عید سے پہلے خطبہ شروع کیا۔ ایک آدمی نے کہا۔

”مروان! تو نے سنت کی مخالفت کی ہے۔ تو نے اس دن منبر نکالا (حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں یہ منبر نہیں نکالا جاتا تھا اور تو نے اس سے پہلے خطبہ شروع کیا) حالانکہ (اس دور میں) خطبہ سے ابتدا انہیں کی جانی تھی۔“

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اس شخص نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ میں نے رسول اللہ سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے۔ ”تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اور ہاتھ سے ختم کر سکتا ہو تو ہاتھ سے ختم کر دے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے (منع کرے اور سمجھائے) اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے (نفرت کرے اور اس کے خاتمہ کی خواہش رکھے) اور یہ سب سے کنزور ایمان ہے۔“

فوائد مسائل :

عید گاہ میں عید کا خطبہ منبر کے بغیر دینا مستنون ہے۔ عید کی نماز مسجد میں ادا کرنا بھی سنت کے خلاف

ہے۔ عید کا خطبہ نماز کے بعد دیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عسراؤں کو لکھ لکھ کر لے جاتے تھے۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے تنبیہ کر کے اسے لے لیا۔ افراتی فرمائی ”اس لیے غلامی کا منہ سے منع کر کے دلائی تاکہ کوئی چاہے۔“ حکمران کا فرض ہے کہ برائی کو روکے سے ختم کرے۔ اسی طرح ایک شخص اپنے گھر کے اندر اور گھر خارجہ وغیرہ میں برائی کو حکما ”ختم کرنے کا کام ہے۔ علماء کو وعظ و نصیحت کے ذریعے سے اور مسائل کی وضاحت کر کے برائی کا رستہ روکنا چاہیے اور جہاں مناسب حد تک کسی اور انداز سے دیا جاتا ہو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا چاہیے۔“ خاص طور پر مسجد اور مدرسے میں جہاں عالم کو پورا اختیار حاصل ہوتا ہے اسے اس اختیار سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کنزور آدمی دو ایمان کی کنزوری ہے۔ وہ اور ذریت ہونے کی وجہ سے منع کرنے کی جرات نہیں رکھتا اسے گناہ سے نفرت رکھنی چاہیے اور یہ سنت رکھے کہ اگر اللہ مجھے طاقت دے تو میں اس برائی کو ختم کروں گا۔

فرمان باری تعالیٰ ”مومنو! اپنی جانیں بچاؤ“ کا

مطلب

حضرت ابو امیہ شعبانی رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا میں نے حضرت ابو عبد اللہ عیسیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا آپ کا اس آیت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ فرمایا کوئی سن آیت؟ میں نے کہا ”نہ“ اسے ایمان دینا اپنی فکر کرو۔ جب تم راہ راست پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ ہے اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں۔“

انہوں نے فرمایا۔ ”تم نے یہ مسئلہ خبر رکھنے والے سے پوچھا ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ”بلکہ ایک دوسرے کو نیکی کا حکم دو اور ایک دوسرے کو برائی سے منع کرو حتیٰ کہ جب تو

تو اللہ تعالیٰ ان سب پر عذاب نازل کر دیتا ہے۔“

جس کو اللہ تعالیٰ دنیاوی طور پر دولت عزت اور قوت دے اس کی ذمہ داری ہے کہ نیکی کے فروغ اور گناہ کے سد باب کے لیے کوشش کرے۔ ہر شخص کو اپنی طاقت کے مطابق برائی روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دنیا میں اللہ کا عذاب آتا ہے تو نیک بھی اس کی توبہ میں آجاتے ہیں لیکن یہ عذاب اس وقت آتا ہے جب معاشرے میں گناہ کی کثرت ہو جائے۔

قیامت کا معاملہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا جب سمندر کا سفر طے کرنے والے مہاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا۔

”کیا تم لوگ مجھ کو عجیب باتیں نہیں بتاؤ گے جو تم نے حبش کے ملک میں دیکھیں؟“

ان میں سے کچھ نے جو ان افراد نے کہا۔ ”جی ہاں! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (ہم سنا میں نے) ایک بار ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے پاس سے ان کی ایک راہب بڑھیا گزری جس نے سر پہلی کا مٹکا اٹھایا ہوا تھا۔ وہ ان میں سے ایک جوان (لڑکے) کے پاس سے گزری تو اس نے اس (راہبہ) کے کندھوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دے دیا۔ وہ گمشدوں کے بل گری۔ ان کا مٹکا ٹوٹ گیا۔ جب وہ اٹھی تو اس (شریر لڑکے) کی طرف سر گری۔“

”اے دھوکے باز! تجھے چاہیے کہ جیسے اللہ تعالیٰ (حشر کے میدان میں) گری رہے گا اور تمام پہاڑوں اور پہاڑوں کو جمع کرے گا اور (انسانوں کے) ہاتھ اور پاؤں ان کے عملوں کی گواہی دیں گے۔ پھر تجھے بتا دے گا کہ کل (قیامت کو) اس (اللہ) کے پاس میرا تیرا معاملہ کیسے طے ہوتا ہے؟“

راوی نے کہا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہ واقعہ سن کر فرمایا۔ ”اس نے سچ کہا۔ اس نے سچ کہا۔ اللہ تعالیٰ اس قوم کو کیونکر پاک کرے گا جن میں بدعت دہرے کمزور کو حق نہیں دلوایا جاتا؟“

فوائد مسائل :

۱۔ ملہ کے مظلوم مسلمانوں نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے حبش کی طرف ہجرت کی تھی۔ پہلے گروہ نے رجب 5 ہجرت میں ہجرت کی اس کے بعد اگلے سال زیادہ افراد نے حبش کی طرف ہجرت کی۔ ہجرت مدینہ کے بعد یہ حضرت مختلف اوقات میں گروہوں کی شکل میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ سمندر کے مہاجرین سے مراد حبش کی طرف۔ ہجرت کرنے والے لوگ ہیں کیونکہ یہ حضرات بحر قلزم (بحرا من) پار کر کے حبش پہنچے تھے۔ سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی قیامت اور جنت جہنم کا ذکر موجود تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اگرچہ ان کیوں میں تحریف ہو چکی تھی، تاہم ان میں بہت سی سچ باتیں موجود تھیں۔ موجودہ بائبل میں یہ تحریر بہت زیادہ ہے اور صحیح نہیں بلکہ غلط طور پر ہے۔ پھر مسلم صحیح بات کرتے تو اس کی بھی تصدیق کرنی چاہیے۔ جس قوم میں کنزوروں پر ظلم کیا جائے وہ اللہ کی طرف سے سزا کی حق ہو جاتی ہے۔ اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں عدل و انصاف قائم رہے اور مظلوم کی مدد کرتے ہوئے ظالم کو پوری سزا دی جائے۔ موجودہ غیر مسلم معاشرے میں قانون اس قسم کے ہیں جن سے ظالم کو تحفظ ملتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں بھی انہی ظالمانہ قوانین کو رائج کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے ظلم پھیلتا ہے اور مظلوم تباہ ہوتے ہیں۔

افضل جہاد

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”سب نے افضل جہاد ظالم سلطان کے سامنے انصاف (اور

exhausting ہو جاتا ہے پورا دن کام کرنے کے بعد محسوس تو ہو جاتی ہے لیکن منہ آتا ہے صبح گیارہ بجے سے ہم کام شروع کرتے تھے اور رات کے گیارہ بجے ختم ہوتے تھے۔

”کتنا رانا ہے یہ سیرمل اور لوگ تنہا کرتے ہیں آپ کی رفتار میں؟“

”ہم نے اس کی رفتار ڈیڑھ گھنٹہ میں کر لائی تھی 2010ء کا یہ سیرمل بہت اچھا تھیک ٹیک مل رہا ہے۔ ہم اگر کسی دعوت پر جاتے ہیں تو لوگ بہت تعریف کرتے ہیں کہ تم اتنا محنت سے کام لے رہے ہو۔“

”ابن ابی ظہر نے یہی کہنا تھا کہ آپ کے ایک پرنسپل کم ہوتے ہیں تو میں بھی کہتا ہوں کہ آپ میری غلطی بتائیں گے تو میں انہیں دور کر سکوں گا۔“

”سہلا ڈراما ہے آپ کا“ آپ کا خود دل چاہا کلمہ کہنے کا یا کسی کے کہنے پر قیلا میں آئے؟“

”یہ شاید جون جولائی کی بات ہے اسکول کی چٹخیاں تھیں۔ پلا کے پاس ڈائریکٹر کا فون آیا کہ ہمیں اس سیرمل کے لیے ایک ایسا لڑکا چاہیے جو روٹی سے انگریزی پڑھتا ہو۔“

”میں نے کہا کہ تمہارا نمبر دے دوں، میں نے کہا کہ وہ دے دیں۔ پھر ان کا فون میرے نمبر پر آیا اور انہوں نے مجھے ساری تفصیل بتائی کہ تنہا قسطیں ہیں اور کہیں کہیں شوٹ کرنی ہے آپ کا کردار کیا ہو گا۔ میں

زورین خان نظامانی

زورین خان معروف فنکار فضیلہ قیصر اور قیصر خان نظامانی کے فرزند ہیں آپ انہیں آج کل ڈرامہ سیرمل ”قیہ تھائی“ میں قیصر قیصر کے بیٹے کے کردار میں دیکھ رہے ہیں یہ ان کا پہلا سیرمل ہے۔

”کیسے ہیں زورین؟“ اور یہ بتائیں کہ آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟

”میرے نام کا مطلب لیڈر ہے تو مجھے اپنا نام بہت پسند ہے کیونکہ بہت نوٹنگ اور منفرد نام کا نام ہے۔“

”ابن ابی ظہر نے یہی کہنا تھا کہ آپ کے ایک پرنسپل کم ہوتے ہیں تو میں بھی کہتا ہوں کہ آپ میری غلطی بتائیں گے تو میں انہیں دور کر سکوں گا۔“

”یہی میں 20 فروری 1997ء میں کراچی میں پیدا ہوا اور میں حبیب پبلک اسکول میں انہیں تعلیم کا طالب علم ہوں رہے ہو کہ مجھے میوزیشن پڑنا ہے ایک اچھا گٹارٹ اور گٹار بیٹا میرے ماہوں نے سکھایا ہے کیونکہ وہ خود بہت اچھے گٹارٹ ہیں۔“

”کیسے پر قیلا میں آئے؟“

”میں ہمارا بیٹا ہے جس کا نام Invitable ہے ہمارا انٹرست ہوا تھا کہ آئیڈیوٹم میں ہمیں سیکینڈ پرائز ملا تھا۔ اپنے اسکول میں بھی پر قیلا میں آئے۔“

”قیہ تھائی“ میں ماشاء اللہ آپ بہت اچھا پر قیلا میں کر رہے ہیں۔ آپ کو خود کیا لگ رہا ہے؟

”کام کرنے میں منہ تو آ رہا ہے لیکن تمہارا

بننا پر سن قرار دیا ہے۔ ایسی ذمہ داری اٹھانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ جس کی صلاحیت نہ ہو کیونکہ لوگ جو توقعات رکھتے ہیں وہ پوری نہیں ہوتیں تو ذمہ داری اٹھانے والے کو قصور وار سمجھتے ہیں اس طرح اس کی عزت خراب ہو جاتی ہے۔ بعض علماء مسجد مدرسہ یا انجمن کے انتظامی معاملات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں مثلاً ان میں علمی صلاحیت تو ہوتی ہے انتظامی صلاحیت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات خود مسجد یا مدرسہ کے متعلقین یہ تصور کر لیتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے عالم ہیں لہذا انتظام اچھے طریقے سے چلائیں گے۔ اس صورت میں ایسی ذمہ داری نہیں اٹھانی چاہیے جس کے بارے میں یقین ہو کہ اسے نبھانا مشکل ہے۔

سزاؤں کا بیان

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ ظالم کو سزا دیتا ہے۔ اگر سزا سے بچنا ہے تو چھوڑنا۔“

”پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔“

”آپ کے پروردگار کی پکار کا یہی طریقہ ہے جب وہ بستیوں کے رہنے والے ظالموں کو پکارتا ہے۔“

فوائد مسائل :

”مجرم کو اگر اللہ کی طرف سے فوری سزا ملے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چھوٹ گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ایک خاص وقت تک مہلت دیتا ہے پھر اچانک پکڑ لیتا ہے۔ مجرموں کو مہلت دینے میں اللہ کی صفت رحمت کا اظہار ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر بدایت قبول کر لیں اور اس طرح وہ عذاب سے بچ کر انعام کے حق میں جائیں۔ اللہ کے عذاب سے کوئی نجات نہیں پاسکتا۔“



دیکھ کر بھل کا حکم مانا جاتا ہے (ہر شخص بھل کر رہا ہے گویا بھل کی حکومت ہے) خواہش کی پیروی کی جاتی ہے دنیا کو ترجیح دی جاتی ہے اور ہر شخص کو اپنی رائے ہی اچھی لگتی ہے اور تیرے سامنے ایسی صورت حال آجائے کہ تو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو پھر خاص اپنی جان کی فکر کر اور عوام کی فکر چھوڑ دے کیونکہ تمہارے آگے صبر کا زمانہ آ رہا ہے۔ اس دور میں صبر اور حق پر قائم رہنا اس طرح (دشوار) ہو گا جیسے انکارے کو غصے میں لیتا۔ ان ایام میں (بیچ نیک) عمل کرنے والے کو (عام حالات میں) ایسی عمل کرنے والے کیسے پاس تو میوں کے برابر ثواب ملے گا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے عرض کیا گیا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم (مسلمان) کب تک کا حکم دیتا اور برائی سے منع کرنا چھوڑ دیتے ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب تمہارے اندر وہ (خرابی) ظاہر ہو جائے جو تم سے پہلی قومیں میں ظاہر ہوئی تھی۔“

”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پہلی امتوں میں کیا ظاہر ہوا تھا؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”حکومت کم عمر (یا بچکانہ ذہن رکھنے والے) افراد میں اور بے حیائی بیٹوں میں (جو ان تو بدکاری میں ملوث ہوں گے ہی) پورے بھی باز نہیں آئیں گے اور علم تمہارے ذیل لوگوں میں۔“

حضرت زید بن حبیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”تمہارے ذیل لوگوں میں علم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ علم فاسق (اور بد کردار) لوگوں میں ہو گا (جو علم پر عمل نہیں کریں گے)۔“

فوائد مسائل :

”مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے شواہد کی

سے سوا کچھ نہیں کر لیتے ہیں۔ چھٹیاں ہیں بوریو
 رہیں ہیں۔ یہ ایک نئی دوجائی کی توہیں پہلے سین میں
 کچھ سواری مشکل ہوئی اس کے بعد سب کچھ ٹھیک
 ہونا چاہیے۔
 ”آپ کا ڈراما دیکھ کر کسی نور نے بھی آفری اور
 کیا اسے جاری رکھیں گے۔ یعنی لوداکاری جاری رہے
 گی کیا؟“
 ”پلی ٹی وی والوں نے بلایا تھا لیکن چونکہ میرے
 پیچھے ہو رہے تھے اس لیے میں جا نہیں سکا۔ اگر کلام
 کروں گا بھی تو جون، جولائی کی چھٹیوں میں تاکہ میری
 پڑھائی متاثر نہ ہو۔“
 ”آپ کی ممائی اس فیلڈ میں اور پلا بھی آپ
 بتائیں کہ دونوں میں اچھا پکار مرکون ہے؟“
 ”دونوں اچھے پکار مرکون لیکن مجھے ممائی لوداکاری
 زیادہ اچھی لگتی ہے۔“
 ”جی جی مجھے تو تمہارے پلا کی لوداکاری پسند ہے۔
 اچھا یہ بتاؤ کہ شرارتیں کرتے ہو اور ڈانٹ مار پڑتی ہے؟“
 ”تھوڑی سی کرتا ہوں۔ زیادہ نہیں، بس سچاٹھنے



میں سستی ہوتی ہے جس کی وجہ سے تھوڑی ڈانٹ
 پڑتی ہے سارے تو بھی نہیں پڑی۔“
 ”کھانے پینے میں کیا پسند ہے اور کمر کا کھانا زیادہ
 اچھا لگتا ہے یا کھانا؟“
 ”کھانے میں کوئی سبزی بہت پسند ہے اور پیرانی
 بہت پسند ہے۔ ممائی بہت اچھی پکاتی ہیں تو مجھے کمر
 میں کھانا کھانے کا زیادہ مزہ آتا ہے اور پھر بھی اچھا لگتا
 ہے کمر میں ماما کے ہاتھ کے کھانے کا مزہ ہی کچھ اور
 ہے اب تو بازار کے برگر کامز نہیں آتا پہلے بیسلاز آتے
 ہی نہیں رہا۔“
 ”جیسے ملے تھے؟“
 ”چونکہ میرا بیلا ڈرامہ تھا اس لیے مجھے پیسے نہیں
 ملے۔ جب کوئی دوسرا سیریل کروں گا تب ملیں گے اور
 پاپائے بھی منع کر دیا تھا کہ بیلا سیریل سے اس لیے پیسے
 نہیں لینے۔ ویسے ٹکٹ کے طور پر مجھے منگے والا
 موبائل ملا ہے۔“
 ”آپ کی تو ممائی اور پلا اس فیلڈ میں ہیں اس لیے
 آپ آسانی سے آگئے اور اگر دوسرے بچے آنا چاہیں تو
 ان کو مشکل ہوگی؟“
 ”جی بالکل ہوئی اس لیے اگر کوئی ایسا سلسلہ رکھا
 جائے کہ جس میں لیسٹلڈ بچوں کا ٹوٹیشن لیا جائے اور
 انہیں کام کا موقع دیا جائے تو بہت سے بچے آسکتے ہیں
 اس فیلڈ میں۔“

تبسم عارف

”کیسی ہیں تبسم۔ اور آج کل آپ اسکرین پر
 نظر نہیں آ رہیں؟“
 ”ہاں جی نہیں ٹھیک ہوں اور بس ایسا ہی ہوتا ہے
 کبھی بہت زیادہ نظر آرہے ہوتے ہیں تو کبھی بہت سی کم
 نظر آ رہے ہوتے ہیں۔“
 ”ایسا کیوں ہوتا ہے؟“
 ”ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ایک ایک کر

کے سیریل چلتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بہت ہی
 سیریل تیار ہوتے ہیں وہ ایک ساتھ ہی کن ایئر آجاتے
 ہیں جس کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہمیں ہمیں
 اور کوئی ہے ہی نہیں تو آج کل خاموشی ایسی ہے کہ
 تیار سیریل کن ایئر ہونے میں تاخیر لگے گی۔“
 ”اور ذرا سیریل بھی ملتی کلام ہوگا؟“
 ”جی ہاں آگے کا شکر ہے۔ اچھا کلام چل رہا ہے۔ کچھ
 کمر ملو گے۔ واریوں کی وجہ سے بہت زیادہ کلام نہیں کر
 رہی۔“
 ”آپ کی بیٹی بھی تو اس فیلڈ میں ہے نا؟“
 ”نہیں۔ باقاعدہ نہیں ہے اور نہ ہی اسے اس
 فیلڈ سے کچھ زیادہ دلچسپی ہے۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اس
 نے کافی کمرشلز میں کام کیا تھا اور ایک آدھ ڈرامے میں
 بھی۔ لیکن اب وہ پڑھائی میں مصروف رہتی ہے
 اس لیے اس طرف توجہ نہیں دے پاتی۔“
 ”آپ کی طرف سے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے؟“
 ”نہیں، نہیں میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں
 ہے لیکن اس کا اس فیلڈ میں آنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں
 ہے۔“
 ”آپ کو میں نے کچھ پروگراموں میں کمپیئرنگ
 کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے یہ کلام کیا لگتا ہے؟“
 ”بہت زیادہ شہر میں آجائے تو پھر ہر کلام کرنے کو دل
 چاہتا ہے۔ مجھے کمپیئرنگ کی پیشکش ہوئی تو میں نے
 اس پیشکش کو قبول کر لیا اور مزہ کیا مجھے کمپیئرنگ
 کر کے لایو لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو فوری
 رسپانس ملتا ہے کہ لوگ کیا محسوس کر رہے ہیں۔“
 ”آپ کو کنڈرپانس ملا؟“
 ”اچھا ملا۔ تب ہی تو حوصلہ ہوا مزید پروگرام
 کرنے کا۔“
 ”آپ نے کافی ڈراموں میں کلام کیا ہے اب تو لوگ
 آسانی سے پہچان لیتے ہوں گے کیا وہ عمل ہوتا ہے
 لوگوں کا؟“
 ”لوگ تو ظاہر ہے مجھ سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔
 مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے ان سے مل کر اپنی پہچان بھلا

کے بری لگتی ہے، لوگ ڈراموں کی تعریف کرتے
 ہیں میرے کلام کی تعریف کرتے ہیں تو خیر ہوتا ہے اپنے
 آپ پر۔“
 ”آپ نے یہ نہیں کہا کہ پرائیویسی متاثر ہوتی ہے
 اور۔“
 ”نہیں نہیں۔ ایسا کہوں کون گی بلکہ جب میں
 فیملی کے ساتھ ہوتی ہوں لوگ مجھے پہچان لیتے ہیں تو
 مجھے بہت عجیب سا لگتا ہے اور اچھا بھی لگتا ہے۔ لوگ
 دو چار منٹ کے لیے تو ہمارے پاس آتے ہیں۔“
 ”نہ صرف پاکستان میں بلکہ ملک سے باہر بھی آپ
 فنکاروں کو سب ہی جانتے ہیں اس کا اندازہ مجھے
 ہے۔“
 ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے بھی ملک
 سے باہر جانے کا اتفاق ہو چکا ہے میں نے دیکھا ہے کہ
 لوگوں نے ہمیں بڑی آسانی سے پہچان لیا تو مجھے بہت
 اچھا لگا ہے۔“
 ”آپ نے کافی جوان بچوں کی ممل کے دل بھی کیے
 ہیں۔ عجیب نہیں لگتا کیا آپ کو؟“
 ”آج کل ڈراموں میں یکدم میں ہی اچھی لگتی
 ہیں۔ بہت بہت بڑے بچوں کی ممل ایک عجیب سی بات
 ہوتی ہے لیکن میں انہیں ان سے تھوڑی سی بڑی عمر
 کے بچوں کی ممل بننا کوئی عیب نہیں ہے۔“
 ”اور ممل اپنی جلدی بوڑھی ممل کماں ہوتی ہیں۔ میں
 تو سمجھتی ہوں کہ جو ڈرامے میں دکھایا جاتا ہے وہ بالکل

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بنوں کے لیے
 آسیہ سلیم قریشی کے 3 دیکھ ناول

کتاب کا نام	قیمت
دو ایسی عورتیں	500/- روپے
توڑ کر آئی	450/- روپے
تھوڑی دیر سا بچہ	400/- روپے

کتب و رسائل لاہور - 37 - 37735021 فون نمبر

”جی ہاں۔ میری بھی خیال ہے اب میری بیٹی
بھی تو بچہ ہے۔“

”بالکل۔ بالکل۔ اب سے ہوا میں کر رہی ہے۔“

معین اختر

”کیسے ہیں تمہیں؟“ اسکرین آپ کے لیے
 ادا ہے۔
 (پیشے ہوئے) ”ای بات تمہیں کہ میں اسکرین پر
 نہیں آتا۔ آتا ہوں مگر کم۔“
 ”اور تو کم کم آتے ہیں اگر انور مقصود آپ کو نہ
 جانیں تو آپ بالکل بھی نہ آئیں میں نے تھیک کہا
 ہے۔“

”بھئی انور مقصود کی تو کیا ہی بات ہے ان کی میری دوستی بہت پرانی ہے وہ مجھے بلا میں اور میں نہ جاؤں یہ کیسے ممکن ہے آج پوچھیں تو مجھے انور مقصود جیسا اچھا مزاج لکھنے والا کہیں نظر نہیں آتا“ ان کے مزاج میں



جتنی کرائی ہوتی ہے اسی اور میں نہیں ہوتی۔ آپ کو
 شاید اس بات پر بھی تعجب نہیں آئے گا کہ ہماری دوستی
 کو تقریباً 38 سے 40 سال ہو گئے ہیں ہم دونوں
 میں جیسی محبت سلطان قسطنطنیہ کی آج بھی ہے۔
 ”آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وقت بڑا سستو ہوتا
 ہے انسان کو سب کچھ سکھاتا ہے کچھ وضاحت
 کریں گے آپ اس بات کی؟“

”ہاں نہیں نے کہا تھا کہ وقت سب سے بڑا استاد ہے اور میں نے زندگی میں جو کچھ بھی سیکھا وقت سے ہی سیکھا ہے۔ میں جب اس فیلڈ میں آیا تو مجھے کچھ بھی نہیں آتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ مجھے سب کچھ آ گیا اور اس کے لیے میں اپنے رب کا شکر ادا کروں گا۔“

”اس قدر کامیابی کی وجہ؟“
 ”میں دل کا بہت صاف ستھرا ہوں کسی کے خلاف سازش کرنے کا یا کسی کے خلاف کوئی بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا“ اللہ نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے لیکن میرے دل میں کوئی غرور کوئی تکبر نہیں ہے اور اسی کا صلہ اللہ نے مجھے دیا ہے۔“
 ”آپ کے بچے کتنے ہیں اور کوئی ہے اس فیلڈ میں؟“

”بشاہ اللہ میرے پانچ بیٹے ہیں۔ وہ دریائیں اور تین بیٹے، سچ مانوس کوچوں کو اس فیلڈ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ ایک بیٹے کو تعویذ سے دلچسپی ہے۔ لیکن میں نے ابھی اس کو نے کی اجازت نہیں دی میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی برعالمی عمل کر لے۔“

”ملک سے باہر خصوصاً“ انڈیا جا کر پر فارم کرتے ہیں تو کیا تاثرات ہوتے ہیں آپ کے؟“

”میں جب ملک سے باہر جانا ہوں کسی بھی حیثیت سے تو اپنے آپ پر بہت بھاری ذمہ داری محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ میں اپنے ملک کا نمائندہ ہونا ہوں۔ اس لیے میں بہت خیال سے رہتا ہوں کہ میرے کسی عمل سے میرے ملک پر کوئی حرج نہ آئے“

رسول مسیحؐ

شاہین رشید

ابتدائی زندگی :-

میں یکم اکتوبر 1969ء میں لیاری کے ایک علاقے مبارک آباد میں پیدا ہوا۔ میرا نام میری ماں نے رکھا اور "اسلم" نام رکھنے کی بھی ایک وجہ تھی کہ جس زمانے میں میں پیدا ہوا اس زمانے میں "اسلم" ہلو ان پرلوانی میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ بس ان ہی سے متاثر ہو کر میرا نام رکھا گیا۔

میرے والدین کا تعلق ہندوستان سے ہے کیونکہ ان کا جنم ہندوستان میں ہوا۔ ہندوستان کے شہر راجستان سے ان کا تعلق راجہ والدین آپس میں دور کے رشتے دار ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت ہجرت کر کے کراچی آئے۔ یہاں کراچی میں ہی ان کی شادی ہوئی۔ میرے دادا راجہ ہستان میں گاڑیوں کا کام کرتے تھے یعنی آپ انہیں انجینئر کہہ سکتی ہیں۔ سمجھنی اور دلی میں ان کا بہت اعلیٰ کاروبار تھا۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجاؤں کی گاڑیاں ٹھیک ہونے کے لیے ان ہی کے پاس کیا کرتی تھیں تو جب ہجرت کر کے پاکستان آئے تو میرے والد نے بھی یہی کاروبار کیا پھر سڑک پور جا کر ایک انجینئرنگ کمپنی کو جوائن کیا اور بحیثیت انجینئر کے جاب کی۔

بچپن + بھائی :-

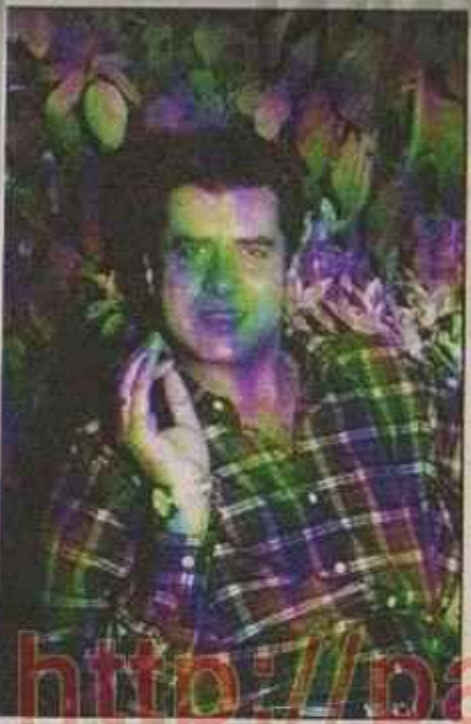
ہم پشاور سے آ کر بھائی ہیں۔ یعنی دو بھائی اور چچا بھائی۔ میرا نمبر چچائیوں میں چوتھا ہے۔ پشاور سب شادی شدہ ہیں اور خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ مجھے سے بڑی دونوں بہنوں کی شادیاں کم عمری میں

ہی ہو چکی تھیں۔ اس لحاظ سے میری بھانجے بھانجیاں تقریباً دو چار سال کے فرق سے ہم عمری ہیں۔

میرا بچپن بہت اچھا گزرا کیونکہ میرے والدین اور میرے بہن بھائیوں نے مجھے تعلیمی اچھا بنا کر رکھا۔ یعنی بالکل صحیح سبلی کی طرح میرا خیال رکھا۔ ویسے تو مجھے بچپن سے ہی بہت پیار ملا۔ لیکن اس وقت پیار میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا جب مجھ سے بڑے بھائی اور مجھ سے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوا۔ اتنا لاڈ پیار ملنے کے باوجود میں ایک ڈروک اور بے ضرر سا بچہ تھا اور شرارتیں تو بالکل بھی نہ کرتا تھا۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے بچپن میں کوئی ایسے کھیل نہیں کھیلے جو معمولاً بچے کھیلنے پر مبنی ہو۔ یہم کھیلا بھی تو وہ کرکٹ تھا۔ چنگ بازی بھی ہوا یا اس طرح کے دیگر کھیل مجھے بالکل بھی پسند نہیں تھے نہ ہی کھیل کھیلنے پونے لڑکے مجھے اچھے لگتے تھے۔

تعلیم + غیر تعلیمی سرگرمیاں :-

میں جب پانچ سال کا تھا تو میرے والد نے مجھے پہلی جماعت میں داخل کرایا اور جب تک میں گھر والا والد صاحب مجھے کچھ نہ کچھ پڑھاتے رہتے تھے اس زمانے میں یہ دواں تھا کہ ختمیہ اردو اور انگریزی لکھائی کی تربیت دی جاتی تھی تو میری لکھائی ختمیہ لکھ کر بہت اچھی ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب میں چکی جماعت میں داخل ہوا تو کچھ ہی عرصہ بعد مجھے پروفیشنل مل گئی مجھے تیسری جماعت میں منتقل کیا گیا چنانچہ جب میں آٹھ سال کا ہوا تو چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ میٹرک بھی



بہت کم عمری میں پاس کرایا تھا۔ میرے والد نے ان انجینئرز سے مجھے ان کی نوادش بھی کہ ان کے پاس سے بھی چھوٹا بھائی تو میرا بھائی اس سے چھوٹا پھر بھی تھا کیا کر تھیں بھی انجینئری بنانے میں بھی پھر انجینئر بنانے میں نے کراچی پولی ٹیکنک سے ڈپلومہ کیا۔

غیر تعلیمی سرگرمیوں میں تو میں بچپن سے ہی بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اسکول لیول پر اور کالج لیول پر جتنے بھی پروگرام ہوتے تھے سب میں حصہ لیتا تھا۔ میری آواز بڑی سرگرمی ہوا کرتی تھی تو جب میں اسکول میں تھا تو نعت خوانی کے مقابلے میں میں نے پہلا ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ یہ بات ہے 1977ء کی پھر یہ سلسلہ چلتا رہا جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو اس وقت تک میں تقریباً 24 25 ایوارڈ حاصل کر چکا تھا نعت خوانی میں۔ اس کے علاوہ میٹرن ڈائریکٹر میٹرن ایوارڈ اور میٹرن ڈائریکٹر کے ایوارڈز بھی میں نے حاصل کیے اسکول کے ہی دور میں میں نے ایڈر اسکول ٹورنامنٹ (کرکٹ) کھیلا اور دو چھ کے بعد ہی مجھے کرکٹ ٹیم کا کپتان بنایا گیا پھر میٹرن کرکٹ کی کا ایوارڈ بھی مجھے دیا گیا۔ بہت تک میں اسکول میں رہا میری دوستی یہ ہوتی تھی کہ میں اسکول جانا تھا وہ میرے کو آرام کرتا تھا شام کو ٹیوشن پر چلا جاتا تھا مغرب سے پہلے گھر آ جاتا تھا۔ مغرب کے بعد ہمیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

کالج آ کر تھوڑی سی اجازت ملی اور کالج میں داخلے کے چند ماہ بعد ہی میں نے این ایس ایف جوائن کر لی کچھ ہی عرصہ میں اس کا جوائنٹ سیکریٹری بھی بنا دیا گیا۔ عزت تو پہلے ہی بہت تھی کالج میں جوائنٹ سیکریٹری بننے کے بعد تو عزت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ یونین میں آنے سے بہت سے کام آسان ہو گئے تھے اور دیگر طالب علموں پر رعب بھی پڑنا تھا۔ یہ میٹرن دور تھا وہ میں نے گزارا۔

پیشہ کارانہ :-

میرا تعلیم مکمل ہونے کے بعد لڑکے پریکٹیکل الیکٹریسیٹی میں آئے ہیں لیکن میں تو جب سینکڈ ایئر کا

طالب علم تھا تب سے پریکٹیکل لائف میں آ گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ گھر کے مالی حالات نہایت خراب ہو چکے تھے اور اب ہماری زندگی پہلے جیسی آرام دہ نہیں تھی والد صاحب کا بزنس قلاب ہو چکا تھا۔ یہ 1981ء کی بات ہے۔ جب ہم لوگ کرانسنس میں آئے۔ گھر کے حالات سدھارنے کے لیے راتوں کو لفٹکشنز میں حصہ لیتا تھا اور صبح کے وقت ایک رانیٹ کمپنی میں 800 روپے ملانے پر جاب کیا کرتا تھا 1986ء میں میں نے شوگر کو جوائن کیا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں رات کو لفٹکشنز کرتا تھا اور دن میں جاب کرتا تھا گھر میں کسی کو شوگر کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا لہذا جب میں رات کو دیر سے گھر آتا تو گھر والے ناراض ہوتے تھے ایک دن تو میرے بڑے بھائی نے مجھے زوردار تھپڑ مارے ہوئے

2010ء میرے دھرم سے ہوتے ہوئے وقت کے سمندر میں جا کر رہے۔ انہوں نے خیال کے ساحل پر
 پہاڑ اچھال دی ہیں اور پانیوں میں پھلتا سورج آسمان پر یادوں کی قوس قزح کھلا گیا ہے۔ ہر دفعہ کی طرح
 اس بار بھی مجھے سوالوں سے آپ کی سوجنوں میں جھانکنا چاہا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے ہمیں اپنی یادوں میں
 شریک کیا۔ ہمارے سوال کچھ اس طرح تھے۔

- 1- یہ سال مجموعی طور پر کیسا رہا۔ اس سال کی خوش کن یاد جو آپ کے لیبل پر مسکراہٹ نکھیڑتی ہے۔
- 2- گزشتہ سال کی بہترین دریافت آپ کس نئی مصنفہ کو قرار دیں گی؟
- 3- اس سال آپ نے کوئی کتاب پڑھی ہو تو اس کے بارے میں بتائیں۔ کوئی شعری اقتباس جو آپ کو اچھا لگا
 ہو بتائیں۔

مکوفی نیا خوب ہے سنا میں

ادکار

سیما ممتاز عباسی

ایک تک "کوڑھا ہے جو سائبر اسپیس پر لکھا ہوا ہے
 یہ ایک نئی کی کہانی ہے اس کی محبت کی تشابہ ہے جو
 ذہنی کی شکل میں فقط ایک غیر ملکی حقیقت ہے۔ یہ
 ایک عمل سائنس ٹکشن ٹیلر ہے جو بڑی خوب
 صورتی کے ساتھ حقیقی جہان اور سائبر اسپیس
 مکائنیت سے ماورائے دنیا کے کمپیوٹروں کی ایک
 لامکان سے جوڑ دیا ہے اور لامکان تک پہنچنے کے لیے
 انٹرنیٹ کا بہتی دروازہ ہمارا لشکر رہتا ہے۔ "صفر سے
 ایک تک" بیڑا لچپ ٹائل سے اتنا دلچسپ ہے کہ ٹائل
 کا ٹکشی "ایسویو" ذہنی "اپنی گیل فرینڈ سے چٹ کرتا ہے
 جو فرانس میں ہے بیڑا دلچسپ کے ایک چھوٹے سے
 کھڑوں میں اپنی دنیائی محبوبہ کو بھی دیکھتا ہے۔ ٹائل بیڑا
 دلچسپ ہے کہ اس کے کمپیوٹر اسکرین پر ہر وقت بچھا
 غالب کافوری شعر ہوتا ہے۔

کو کیم راور عدم آواز قبولی برہہ است
 شہرت شعر بکھتی بعد من خواہد شدن

1- سال مجموعی طور پر سوگوار رہا اس سوگوازی نے
 ہماری فطرت کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ زبردست
 سیلاب نے سال کے آخری چھ ماہ کو یوں سیلابی کر دیا
 کے ساتھ بہا کر لے گیا مگر پہلے چھ ماہ کی یادیں باتیں اور
 حالات سائنسی، معاشی سیاسی خطوط پر رواں ہواں تھے
 دلچسپ واقعات بھی ہوئے تو یادگار لکھنوں کا گزیر بھی
 ہو گیا پھر حالات بھی تبدیل ہونے لگے سب سے بڑی
 بات اس سال میں یہ ہوئی سرکاری ملازمین کی تحفظ
 اتنی بڑی کہ پرنس بھر کے اور گریڈ منگانی کی طرح
 پڑھتے ہیں اور یوں وہ سال سرکاری ملازمین کے لیے
 ٹیک ٹکٹ بن گئے ہمارے لیے دلچسپ تجربہ ہے۔
 2- گزشتہ سال کی نئی / بہترین دریافت کوئی مصنفہ
 سامنے نہ آسکیں جو فکشن میں عبور و احمہ کا پہلو بن
 سکیں ایوں نئی مصنفہ کا نام ابھرنے سا کم از کم میری یہ
 والی رائے ہے۔

فدہ میں نے مل میں مرزا الطریک کا ٹیلر "صفر سے

بست زیادہ مقبول ہوا۔ اس دوران ہی پھر ایک دن
 میرے والد نے مجھے بلایا۔ ان دنوں میں اپنے دوستوں
 کے گھر جا کر آتا تھا۔ خیر پاپ پچھاپ ہوتا ہے۔ مجھ
 سے رہا نہ کیا اور میں چلا گیا انہوں نے بھی نہایت
 شفقت کا اظہار کیا اپنے پاس بٹھا کر بڑی محبت سے
 بولے "کیا بہت دل لگتا ہے اس کام میں؟ تمہیں نے کہا
 جی کہنے لگے "کیا تم بھی کام کرنا چاہتے ہو۔؟" میں
 نے کہا "جی" کہنے لگے "تھو کیوں؟" میں نے کہا

"میں نے آپ کے کہنے پر اعلیٰ تعلیم حاصل کی، جہاں
 جہاں ہو سکا تو کیریئر ہمارے پاس کوئی سفارش نہیں
 ہے کہ ہمیں کوئی اعلیٰ عہدہ مل جائے اور ہم فٹات سے
 بیٹھ کر کھائیں۔ میرے پاس یہی ذریعہ ہے کھلی کال اگر
 یہ بھی نہ کروں گا تو کھانوں کا کھلے۔" میری لمبی
 چوڑی باتیں سن کر والد صاحب بولے "ٹھیک ہے تو
 تم چاہتے ہو وہی کرو لیکن ایک سیات یاد رکھنا کہ کوئی ایسی
 بات نہ کرنا جس سے ہماری عزت پر کوئی آج آئے۔"

پس یہ دن میری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ والد
 نے کہا تھا کہ چھوٹے دوستوں کے گھر اور واپس اپنے گھر
 آجائے اور میں گھر واپس آ گیا۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا
 میرے والد نے جب مجھے اجازت دی تو میں کافی
 ڈرائے کر چکا تھا اور میری ایک پہچان بن گئی تھی۔
 2000ء میں مجھے فلم میں کام کرنے کی آفر ملی جس
 کی اجازت میرے والدین نے ہی خوشی دے دی۔

مزاج :-

مزاج تو بس ایسا پایا ہے کہ غصہ تو نہیں آتا اور
 آجائے تو کوئی میری ذمہ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ ویسے
 مزاج "لنڈا" ہوں۔ بے ضرر انسان ہوں، کسی کو کوئی
 تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ میں نے
 خود بہت بدو جہد کے ساتھ زندگی گزارا ہے۔ اب
 سکون کے دن گزار رہا ہوں آج عمومی سعادت بھی
 حاصل کر لی ہے۔

شادی :-

شادی بڑے سال قبل ہوئی اور معذرت کے ساتھ
 کہ اس موضوع کو ڈسکس نہ کر سکاں گا۔

کہا کہ ایسے کون سے فنکشن ہوتے ہیں جس پر تم
 جاتے ہو اور رات گئے واپس آتے ہیں۔ جب میں
 نے انہیں کیسٹ لاکروی کہ میرے فنکشن کی کیسٹ
 دیکھیں اور جب وہی آ رہے انہوں نے میری ہر رفتار میں
 دیکھی سب انہیں یقین کیا کہ میں راتوں کو توارہ گردی
 نہیں کرتا بلکہ گھر کو خوشحالی دینے کی خاطر محنت کرتا
 ہوں۔

گھر والوں کو تھوڑا احساس ہوا تو میرا شوق مزید بڑھ
 گیا بلکہ یوں سمجھیں کہ ڈراموں میں اور تصویر میں کام
 کرنے کا شوق پڑھتا ہی چلا گیا۔ میں نے ٹیٹل بک
 میں جاب کی اور دو پہر کے وقت پس سے اجازت لے
 کر ریڈیو چلا جاتا تھا۔ وہاں ریم طلبہ کے پروگرام کرتا تھا۔
 پھر چار بجے گھر آ جاتا تھا۔ میں نے تقریباً "بھولتی سال
 نوکری کی۔" گھر والوں کا خیال تھا کہ اب یہاں میری
 نوکری ختم ہو جائے گی لیکن جب میں نے جاب سے
 استعفیٰ دے دیا تو گھر میں ایک طوفان ماس آ گیا۔ لیکن یہ
 میرا شوق تھا اور اسے میں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

1993ء میں میں نے باقاعدہ ٹی وی کے ڈراموں
 میں کام کرنا شروع کر دیا۔ گھر والوں کا یہ حال تھا کہ
 انہوں نے مجھ سے بات کرتے چھوڑ دی۔ میرے ڈرامے
 بھی نہیں دیکھتے تھے۔ 1993ء میں میں نے سلا
 سیریل "لیک" کیا اور لیک بہت کامیاب ہوا۔ گویا
 میرے لیے ترقی کے راستے کھل گئے۔ 1993ء سے

1996ء تک میں نے بہت کام کیا مگر گھر والوں کی
 ناراضی مول لے کر۔ سب مجھ سے بہت نفرت
 کرنے لگے تھے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن مجھ پر یہ
 ظلم ہوا کہ میرے والد نے مجھے گھر سے یہ کہہ کر نکال
 دیا کہ ریڈیو ٹی وی پر کام کرنے والوں کی ہماری گھر میں
 کوئی گنجائش نہیں ہے اگر اس گھر میں رہتا ہے تو
 ریڈیو ٹی وی کو چھوڑنا پڑے گا اب یہ میرے پس کی
 بات نہیں تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر نوکری کی اور
 اس مرتبہ مجھے ٹی فون ایجنسی میں نوکری کی۔ یہاں

ٹیلن لگا میرا کام تھا۔

1996ء میں میرا سیریل "جال" سن لبر ہوا جو کہ



ی ایسی باتیں ہیں جو اس سے قبل علم میں تھیں تھیں
(یہ کتب بھی ایسی ہی لائی تھیں)
ایک اقتباس امی کے پسندیدہ ناول حبیبہ واحدہ کے
امریتل سے لے کر میں نے اپنی وائزی میں لکھا ہے
آپ بھی پڑھیں ”زندگی میں ایک چیز ہوتی ہے
کعبہ دہائز“ پر سکون زندگی گزارنے کے لیے اس کی
بست ضرورت ہوتی ہے جس چیز کو تمہیں نہ سکواس
کے ساتھ کعبہ دہائز کرو۔ زندگی میں کچھ چیزیں ایسی
ہوتی ہیں جو ہمیں نہیں مل سکتیں۔ چاہے ہم رو میں
چلا آئیں یا بچوں کی طرح اڑیاں رولیں کیونکہ وہ کسی
دوسرے کے لیے ہوتی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں
ہوگا کہ زندگی میں ہمارے لیے کچھ ہو نا ہی نہیں بلکہ
کچھ نہ کچھ ہمارے لیے بھی ہو نا ہے۔
اور ایک شعر جو پسندیدہ تو ہے کہ ہر پسندیدہ تحریر کے
مصنف / مصنفہ کی تعریف میں بطور مصروف لکھتی ہوں
لیکن ایک ہفتے قبل پتہ چلا کہ جو میں لکھتی تھی وہ
تھوڑا مختلف انداز میں مشہور ہو گیا جبکہ شاعر نے کسی
اور طرح لکھا تھا۔
خط ان کا بہت خوب بھارت بہت اچھی
اللہ کرے حسن قلم اور زیادہ
اور میں لکھتی تھی۔
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ہاں! گزروے سال کی حنیفہ محمد بیگ اور عائشہ فیاض
بہترین کے ساتھ ساتھ چران کن انڈاز خیر کی مالک
دریافت ہیں کیونکہ طرز تحریر اتنا پختہ اور مجھا ہوا ہے
کہ لکھائی نہیں کسی نئی معنی کو پرہ رہے ہیں (ماشاہ
اللہ) اور بلاشبہ یہ آپ ہی کی نظر انتخاب ہے کہ ایسے
ایسے گوہر نایاب دریافت کرتے ہیں۔
میں نے آپ کے کیا سوال کر دیا اس کی بات
تو ہر سال مطالعہ کرتے ہیں کہ حلیہ نہیں
(ملدولت کمالی کیرے ہیں۔ خیواری ایشیا منع ہے ہاں
مسکراہٹ پر کوئی پابندی نہیں) ہر قسم کی معیاری
ستہری اور دینی بھی کتب اور رسائل شعر و شاعری کی
کتابیں غرض کون کون سی پڑھیں کہ میری امی نے تو
ایک چھوٹی سی لائبریری گھر میں ہی بنا رکھی ہے (یہ
جراثیم ان سے ہی مجھ میں آئے ہیں اور ہاں پتا جان
موجود سے بھی کہ ان کی تو بہت بڑی اور وسیع کتب
سے بھر پور لائبریری تھی) آج کل ایک کتاب ذریعہ
مطالعہ ہے جس کا نام ہے ”تذکرہ صحابیات“ بہت
دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہے۔ صحابیات کے نام بہت
خوب صورت ہیں اور خاص طور پر ام المومنین حضرت
عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خاتون جنت حضرت
فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حالات زندگی
دل و جان پر گہرے اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ بہت



ہے کہ وہ ہے 16 مئی کو انجیل پائی فوٹالی میری مکتبی۔ صبح
سے گھر میں بیانی کی قلت (کہ پانی رات سے نہیں آیا تھا)
شدید گرمی اور افزائش کے پلو جو دل میں گویا
پھولوں کی ایک لہلہائی کیاری جسم رہی تھی خوشبو
بکھیرتی مسکرا رہی تھی (کیونکہ اسے تو پانی کی ضرورت
نہیں ہوتی نا!۔ سمجھا کریں بھی یہ دل کا حال ہے۔
آہم ہم!) حالانکہ میں کھلی کھلی رہتی تھی اور
کنہیوڑ بھی تھی۔ سنے اور انجان کوکوں میں زندگی
بھر کا نا آج رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ ایک اطمینان بھی
تھا کہ والدین کا فیصلہ میری بھلائی میں ہی ہو گا۔ گو کہ
میرا ”ان“ سے واسطہ ملا واسطہ رابطہ نہیں (دقیقہ نوی
خیالات نہ ہونے کے پلو جو) کیونکہ مجھے ”میرے گھر
والوں کو“ انہیں ”ان کے گھر والوں کو“ مشقی شغف اور
روایات عزیز ہیں گو کہ پابندی نہیں مگر اچھا سا لگتا ہے
نا مشقی ”قدیم اور ساتھ پن (میری ذاتی رائے ہے۔
قاری بہنوں کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہاں۔۔۔)
ویسے آپس کی بات ہے میں بھی کوئی پوڑھی روح
نہیں۔ لیکن وہ سب لوگ نہیں مزاج کے مخلص اور
محبت کرنے والے ملوہ سے لوگ ہیں (ہماری طرح)
اللہ عیش ایسا رکھے (آمین ثم آمین)
2۔ گزروے سال کی تو نہیں لیکن ”نمو واحدہ“ واقعی
بہترین دریافت ہیں (کیونکہ بہت پرانی تو نہیں نا!۔)

(میری قسمت میں ستاروں کی یہ دنیا نہیں بلکہ مجھے
عدم میں قیادت حاصل ہے مگر میری شاعری کی وجہ
سے شہرت میرے مرنے کے بعد ہوگی۔ جب میں عدم
میں پہنچ جاؤں گا۔) (غالب)
رضوانہ خان۔ تاریخہ کراچی
1۔ سہل گزشتہ انفرادی طور پر تو اچھا ہی رہا کہ نرمی
گرمی ”چھوٹے پھاؤں“ مسکراہٹ ”آس اور خوش“ ہم
تو زندگی کے مادہ سہل کا لازمی حصہ ہیں سہاں! ایشیا
طور پر تجزیہ کیا جائے تو ملک و قوم نے بہت سے
ساختات کو بھیا جن سے اب تک نہیں سیکھ سکا۔
کشمیر، اکرار کی آڑ میں پناہ صوفیہ امریکہ کی بھارت
پر کرم نوازی اور ہم پر عدم احتیو کا اعتبار ”میرے
پیارے شہر میں ہر روز کی ٹارگٹ کلنگ“ نفسانی حالات
”سیلاب کی تیلہ کاری“ ورون حملے و وطن عزیز کے تقریباً
ہر شہر خصوصاً لاہور میں ہم دھماکے ”ڈاکٹر ضافیہ کی میر
انسانی اور نا انسانی پر مبنی سزا“ روز بروز بدستی منگتی۔
غرض کیا کیا لکھوں۔۔۔ کہ پچھیرتے ہی ہر ماہ رو رہے
لگتا ہے۔
ہاں ذاتی طور پر تو سال 2010ء کی ایک ایسی خوش
کن یاد ہے جو میرے لیوں پر بے ساختہ مسکراہٹ
بکھیر دیتی ہے (آج کوں تو یہ خوشگوار حادثہ تحریر کرتے
ہوئے بھی اسی مسکراہٹ نے چہرے کا احاطہ کیا ہوا



کو باہر نکالا۔ گزشتہ سال کی بہترین مصنفہ میرے مطابق جانشین فیاض ہیں۔

ڈاکٹر شاہد عسکری کتب ”سیرۃ شاہ عبداللطیف بھٹائی“ پر مبنی۔ شاہ صاحب کے بارے میں جانا، سندھی عوام سے ان کی دلی محبت مثلاً کالفلسفہ محبت اور عقائد و نظریات بارے میں جانا۔ یہ شاہ صاحب کے بارے میں کتب میں نے کنیز نبوی کی کہانیوں میں شاہ صاحب کے بارے میں بڑھ کے ان سے متاثر ہو کر خریدی تاکہ شاہ صاحب کے بارے میں مزید جان سکوں۔ ”کچھ انسان قریب ہوتے ہوئے دور اور کچھ دور ہوتے ہوئے بھی قریب ہوتے ہیں۔ کچھ انسانوں کو یاد کرو تو یاد نہیں آتے کچھ کو بھولنا چاہو تو بھول نہیں پاتے۔ جس طرح کندھی بھینس کے سینکڑوں کھا کر انہیں میں لینے ہوتے ہیں اسی طرح ہمارا محبوب ہماری روح سے مل کھا کر لپٹا ہوا ہے۔“

شاہ عبداللطیف بھٹائی

عمرانہ چغل معصوم اسلام آباد

1۔ بحیثیت پاکستانی دیکھا جائے تو یہ سال مجموعی طور پر اواس اور پریشان کن رہا۔ سبب اسی ذہنیت گردی اور منہ جھکی نے جو مجھے پورے قوم کو بے حال کر کے رکھ دیا ہے اور ری سسی کسر سیلاب نے نکل دی۔ اس سال کی خوش کن یادوں میں مسکراہٹ نکھر

نے ابھی پڑھنا ہے لہذا میں ساتھ والے روم میں جا رہی ہوں۔ باہر کی دروازہ کھلا تو ملی پھر ایک دم اندر آ گئی ہم بھاگنے لگے لیکن ملی کیس غائب ہو گئی۔ ہم نے سمجھا کہ ملی باہر نکل گئی ہے۔ لہذا سمیرا باہر سے دروازے کو کھلی لگا کر ساتھ والے روم میں چلی گئی۔ تمام روم مہش فلور بیڈ تک کرتی تھیں میں چار پائی پر

سو گئی۔ میں ابھی خند بھی نہ آئی تھی کہ سیراز کا آئی اور دروازہ اس نے لاک کر دیا۔ اس نے چونک کر خزن کے ساتھ سوتا تھا لہذا اس نے لینے کے لیے رضائی اوپر اٹھائی جیسے ہی اس نے رضائی اوپر کی تو ملی صاحبہ جو کہ بست مزے سے نرم گرم بستر میں خزن کے ساتھ سو رہی تھی اور خزن کو محسوس بھی نہ ہوا تھا کہ ملی بھی اس کے بستر میں سوئی ہوئی ہے ملی چلا نک لگا کر باہر اور سیرا چچا مار کے دیوار کے ساتھ پھر تو ہم سب کی چیخیں اور ساتھ میں آؤٹ آف کنٹرول ہنسی بھی شامل ہو گئی تا نہیں کس نے دروازہ کھولا اور ملی صاحبہ کو باہر نکالا۔ میں ہمیں کمرہ داخل تھا اور جو خزن

نکاری کو ہم نے تنگ کیا وہ الگ۔ یہ واقعہ آج بھی یاد آتا ہے مسکراہٹ نکھرتا ہے۔

2۔ ”اشعلیٰ کی مصنفین کی خوش قسمتی ہے کہ شعلہ نے انہیں بہترین پلیٹ فارم مہیا کر کے اور ان کی مصلحتوں اور رہنمائی کر کے ان کے اندر چھپے لہلہٹ

بھی پڑھنے بیٹھے نگ میرے خیال سے پوری حتم کر کے بند کر دے گا۔

صنم ولایت فباڑی

1۔ مجموعی طور پر یہ سال کیسا ہاتھ اس کے بارے میں میں کھول کی۔

ساتھ تھے کہ پتھر انگلیں میری آنکھیں اور لڑی طور پر نہیں بلکہ لڑائی طور پر گزشتہ سال نہایت ناخوشگوار، فخر اور عقلمیں گزر گئے۔ دل گداز واقعات و حادثات ہم پاکستانیوں نے دیکھے اور جھیلے یہ سلسلہ تا نہیں کب اور کہاں ختم ہو گا؟

کہاں تک تک لائے تاکوا، دل صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں

آنے والا یہ سال ہم سب کے لیے بہتری اور امن و سلامتی لے کر آئے آئیں۔

کچھ اسکی یادیں بھی ہیں جو آپ کو مسکرائے ہر مجبور کرتی ہیں۔ یہ واقعہ بخوری میں پیش آیا تھا۔ میں

ہماؤ الدین ذکر کیا تو بخوری میں لیکن اپنی خزن سمیرا اور فریڈ خزن کے پاس گئی ہوئی تھی ہم لوگ ہال میں تھے

رست کا وقت تھا باتیں بھی ہو رہی تھیں اور سمیرا خزن کا پیچہ تھا تو وہ بھی کی تیاری بھی کر رہی تھیں۔ روم

میں ایک ملی یاد یاد آجاتی ہم اسے باہر نکال نکال کر تنگ آ گئے آخر سونے کا وقت ہوا لیکن سمیرا نے کہا میں

تو یہ اصلاح اب ہوئی ہے۔ آخر میں ایک بار پھر اوارے کے تمام ارکان، مصنفات اور قارئین کے لیے دلی دعائیں اور نیک تمنائیں۔

مہیم حنفہ ڈسکہ

1۔ مجموعی طور پر پاکستان کے لیے یہ سال اچھا نہیں رہا۔ سیلاب اور آئے دن ہم و محالوں سے دل ڈرا رہا البتہ میرے لیے یہ سال یادگار بن گیا۔ میری شادی ہوئی اور اب اپنی شادی کی تصویریں دیکھتی ہوں تو یوں پر مسکراہٹ بھر جاتی ہے۔ میرے شوہر تمہارے میری بہن کو رسم دودھ میں تھلی ٹوٹ دیے۔ جو اس نے ولیمہ پر شکایت کی اور میرے گھونے پر حنفہ نے اس کو اصلی ٹوٹ سے خوش کیا۔

2۔ میرے خیال سے گزشتہ سال کی بہترین مصنفہ عتیقہ محمد بیگ ہیں۔ جنہوں نے معصوم ”پودا“ زوج کی پاس ”پینا“ ڈیکوریڈ، ترقی جیسی نہروست خوب صورت تحریریں لکھی ہیں۔ اور پودا تحریر پر جتنی دلو

دری چاہوں کہ ہے اس کے بعد میں نے ان کی ہر تحریر کو پڑھنا شروع کیا تھا۔

3۔ ”دست بستہ“ کتب پر مبنی جو کے بانو قدسیہ کی ہے بانو قدسیہ میری فیورٹ رائٹرز ہیں ان کے افسانے اس کتب میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ یہ کتب جو

دینی ہے وہ کچھ تازہ تازہ ہی ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ اسکول سے واپسی پر میں نے زیرو پوائنٹ سے گزرتے ہوئے روڈ پر ایک بیورو کھانسی پر آکسیجن میٹر میں کئی نمائش کا ذکر تھا۔ اسلام آباد میں اکثر نمائش وغیرہ ہوتی رہتی ہیں اور میرے ہنر مند ممتاز ملک کچھ زیادہ ہی شوقین ہیں جانے کے۔

خیر ہم لوگ 28 نومبر روز ہفت اپنے بچوں جہاں زیب اور بصیرت افروز کے ساتھ وہاں پہنچے تو سب سے زیادہ خوشی وہاں مسالا چٹل والوں کو دیکھ کر ہوئی کیونکہ میرے پندہ شیفٹ گلزار کے ساتھ میزبان عائشہ کاشو چل رہا تھا۔ یہاں پر میرے بچوں نے مختلف سوالات کے جواب دے کر بہت سارا آکسن آئل اور کئی بطور انعام جیتا اور ممتاز نے ہنگو واڈل کر فرسٹ پرائز حاصل کیا۔

مسالا چٹل کا سارا عملہ کراچی سے اسلام آباد آیا تھا۔ اسلام آباد والوں کے لیے بارش نہ ہونے کی وجہ سے کوئی سرو موسم نہ تھا۔ لیکن یہ سارا عملہ سارا وقت سردی سے کاٹتا رہا۔ ان کی حالت دیکھ کر اور یاد کر کے لیڈوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔ خیر ہم نے بہت سزا کیا اور میزبانوں اور عملات کے ساتھ واپس آئے۔

2۔ گزشتہ سال تمام مصنفات نے اچھا لکھا۔ میرے لیے خواتین اور شعلہ کی ہر راز سچا ہے وہ دینی ہیں یا پرانی بہت اہم ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

3۔ گزشتہ سال میں نے دو کتابیں 'ازواج الانبیاء' (مولوی محمد حسین محوی) اور کنارے کنارے (ڈاکٹر حسین احمد پراچہ) اسکول کی لائبریری سے لے کر پڑھیں۔ اس کے لیے میں مسز رشیدہ کی شکر گزار ہوں۔

'ازواج الانبیاء' میں ظاہر ہے مختلف انبیاء کے ازواج مبارکہ کے نہایت روح پرور قصے لکھے گئے ہیں نہایت معلومات انگیز کتاب ہے۔

دوسری کتب 'کنارے کنارے' دراصل سفر نامہ ہے جس میں مصنف (مخرومہ رحیم نس) سے لے کر کنارہ کوثر یعنی مدینہ منورہ تک اپنے سفر کا حال اس طرح

سے بیان کرتے ہیں کہ کئی کرتا ہے کہ یہ کتاب کبھی ختم نہ ہو۔

صبحہ فیروز باٹھ۔ فرام بھول باٹھ۔ گوجرانوالہ۔ آج کل پرجلی کی غرض سے لاہور میں مقیم ہوں اور پنجاب یونیورسٹی سے سائنسز کر رہی ہوں۔

1۔ مجموعی طور پر یہ سال اچھا تھا مگر میری ذاتی زندگی میں یہ سال بہت بڑا خلا چھوڑ گیا ہے۔ اسی سال اپریل میں میرے آبواس دنیا سے چلے گئے اور صرف یادیں رہ گئیں۔

2۔ ثروت نذر ایک ایسی مصنفہ ہیں جنہیں میں سال کی نئی دریافت اور بہترین مصنفہ بھی قرار دیتی ہوں۔ اللہ نے ان کے قلم میں سلاست دوائی اور پختگی اس انداز میں رکھی ہے کہ ان کی تحریر پڑھنے والا اس سے زندگی کا کوئی نہ کوئی انوکھا سبق ضرور حاصل کرتا ہے۔

3۔ یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبہ ادب کی ایک ایک کتب بڑھ چھوڑی جی۔ اس دفعہ بہت سی کتابیں بہت اچھی لگیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔ علامہ تقی عثمانی کی 'دینا میرے آگے' ڈاکٹر خالد جمیل کی سوانح حیات 'تیسرا جہم' اور خطبات اقبال ان کتابوں سے بہت کچھ سیکھا پندہ شعر۔

رکھنے والے نے عجب دھنک سے رکھا ہے ہمیں سبز ہوتے بھی نہیں شلخ سے جھڑتے بھی نہیں

ڈھٹنے لگی تھی رات کہ تم یاد آ گئے پھر اس کے بعد رات بہت دیر تک رہی

شائلہ سیل جاوید۔ کراچی

سال نو کے سروے کے لیے کیے گئے سوالات بڑھ کر بے اعتبار دل نے صدای شائلہ یتیم سستی چھوڑ دی۔ اس سال کے سروے کے جوابات میں اگر تم نے شرکت نہ کی تو یہ اس سال کا سب سے بڑا ایہ ہو گا۔

1۔ یہ سال اگر اجتماعی طور پر دیکھا جائے تو اسے آفیس مصیبتوں و محاکمات، آہوں مسکین کمال کا

ہائے تو زیادہ بہتر ہے۔ کون سا ایسا مہینہ ہے جو اس میں گزرا ہو۔ دوسری جانب سیلاب کی تلو کاروں اور حکمرانوں کی بے حسی سے ہر درد مند دل کو خون کے آئینے پر مجبور کر دیا۔ ہر دن کرب میں گزرا اور ہر رات غم میں۔

اس سال کو میرے قلمی سفر کے لحاظ سے کامیابی کا سال کہا جاسکتا ہے۔ بحیثیت شاعروں کے اپنے آپ کو تعارف کروایا۔

24 فروری 2010ء کو انشائلیٹ کراچی میں انجم انصار کی کتاب کی تعریف رونمائی تھی۔ یہ تقریب مجید بھوپال اور انجمن قلم خواتین کی جانب سے منعقد کی گئی۔

کئی راسخوں سے ملاقات ہوئی اور اندازہ ہوا کہ یہ شخصیات نہ صرف اچھا لکھتی ہیں بلکہ ان کے اخلاق بھی ان کے ادبی قد سے اونچے ہیں۔ سارا غلام نبی سے بھی پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ لگتا تھا آسمان سے ستارے نکل پڑے ہیں اور ان سب بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان مجھ ناچ کر قدرت نے منبر کرایا۔ میں نے اپنی سادہ سی قلم پر بڑھی۔

اس ناچ پر بھوپال اندیشے آئے ہوئے صاحب صدر عزیز قریبی اور ڈاکٹر رضیہ حلد چنبہ ہاتھاری اور کافہ فرحت بیٹھے تھے۔ دل کاٹ رہا تھا، ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ مگر جب قلم بڑھ کر اشیخ سے اتنی تو تمام محفل میں خوب پذیرائی ملی۔ مدحوم چٹل اور میٹھو سے اس کی کورنگ ہوئی۔ غرض تمام ادبی دوستوں نے خوب بہت افزائی کی اور دل کھول کر دلدی میرے لیے اس سال کی اس تقریب کے یہ لمحات زندگی کا قیمتی اثاثہ بن گئے۔ آج بھی ان لمحات کی یاد دلیوں پر مسکراہٹ کھیر رہی ہے۔

2۔ یوں تو شعلہ خواتین اور کرن کی روایت رہی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ نئے لہجے کو ابھرنے کے لیے پلٹ فارم میا کیا۔ آج کے مسند ادیب بلکہ چٹلی کی کامیاب راسخوں ان لوگوں کی کلکوں کی بدولت ہی ان کا ایک مقام رکھتی ہیں۔ عموماً 'فائزہ ثروت

نذر اس کی بہترین مثال ہیں۔ اس سال کی بہترین دریافت یتیم عائشہ فیاض کو کہا جاسکتا ہے۔ نمونہ 'عائشہ' جلیان کو بھی قلم نبھائیے جانے چاہئیں۔ 3۔ اس سال مطالعے میں سرفہرست عموماً احمدی 'بیر کمال'، 'لا حاصل' رہی اور خاص طور سے اشفاق احمدی کی 'زادہ'۔

"لا حاصل" سے ایک اقتباس۔ "دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو ساری زندگی اپنے گمے میں غم کا حصول والے اسے بیٹے رہتے ہیں۔ کیونکہ انہیں دنیا کو اپنی نمازوں سے متاثر کرنا ہوتا ہے۔ مگر جب بات ایسا رد قریبی اور اعلا عمر کی کی آتی ہے تو پھر وہ عورتوں کو یوں سزا میں دیتے پھرتے ہیں جیسے انہیں دنیا میں خدا نے سزا اور جزا کے اعتبار کے ساتھ بھیجا ہو۔ انہوں نے عجلت عجلت سمجھ کر کہاں کی ہوتی ہے عادت اور روایت سمجھ کر کرتے ہیں۔"

مسز عزیز سعید عائشہ سلیم۔ گل دامن لاہور

1۔ گزشتہ سال کی یادیں تو بہت سی ہیں۔ لیکن دو واقعات ایسے ہیں جو سوچیں تو خوشی کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارا پاراگمہ و جون کی گرم دھوپ کو اس کی بنیاد رکھی گئی۔ قصہ کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا 31 اکتوبر کو پایہ تکمیل تک پہنچا اور ہم نچر نو میر کو اپنے پیارے گھر میں شفٹ ہوئے جس جب کبھی وہ گمے سمجھتی ہوں تو ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ دیکھ جاتی ہے۔

2۔ خواتین شعلہ اور کرن میں لکھنے والی تمام ہمیش بہترین ہیں۔ لیکن اس سال کی مصنفہ کے بارے میں چاہتا ہے تو قلم قلم عائشہ فیاض کے نام جاتا ہے۔ ان کی تحریریں ایمان افروز ہوتی ہیں۔

ہم سندھ کی سرزمین پر آگے کھولنے والوں کو سندھ سندھ والوں کی طرح پیارا لگتا ہے۔ چٹھے چٹھے سندھ سے پیاری پیاری کینز نیوی کے تمام ٹول 'افسانے شوق سے پڑھتی ہوں۔ سنی کے شمارے میں شائع ہونے والا ٹول "آتش عشق" سے اقتباس۔

”جس دل میں عشق مہم ہو جائے اس دل میں ہمیشہ درد کا دھواں بھرا رہتا ہے جو پوری جان کو سلگائے رکھتا ہے۔ وہ یعنی اس کو جلا کر نیست و نابود نہیں کرتی بلکہ اس کو پکا کر مضبوط کر دیتی ہے۔ پھر وہ ٹھنڈا میٹھا چشمہ بن جاتا ہے جس سے ہر پیرا سا اپنی پیاس بجھاتا ہے۔“

ریحہ حقیقت - فیصل آباد

1- اس سال کے بارے میں کیا کہیں! کیا اور مگر گریباں پتہ ہی نہیں چلا۔ قسم سے! سوچو تو لگتا ہے ابھی کچھ دن پہلے ہی کی بات ہے ویسے مجموعی طور پر اچھا ہی رہا۔ لیکن ملکی حالات خاص طور پر مسئلوں کے حالات۔ کیا کہیں! خیر!

2- اس سال میں بہت ساری خوش کن یادیں ہیں۔ سب سے بڑی تو یہ کہ اب ہم کالج میں آگئے ہیں۔ اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر کے تھوڑی سی خوش کن ہے اور تھوڑی سی پریشان کن کہ اب اور زیادہ پڑھنا ہے بلکہ بہت زیادہ پڑھنا ہے میڈیکل میں ایڈمیشن لینے کے لیے۔ سب قارئین سے درخواست ہے کہ پلیز میرے لیے دیگر ساری دعائیں کیا کریں۔

خیر پڑھائی اور زندگی کے مزے دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں سو مزے بھی خوب ہو رہے ہیں اور پڑھائی بھی۔ سارا دن پڑھ کر جب چٹھی کے وقت نوش گاہ پر ”ماہم“ ”جستہ“ ”ماہم“ (دوسری والی) اقراء کے ساتھ گپ شب ہوتی ہے تو ساری محکمن اور چہ زاری ختم ہو جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ واپسی میں کالج بس میں بھی مزے کرتے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ میٹرک کے پریکٹس کی تیاری کے دوران اسکول جا کر مزے کرنا

(پریکٹس بھی کرنا) ہمیں مارنا ”ماہم ضائع کرنا یہ سارا وقت یاد آتا ہے تو لہجوں پہ مسکراہٹ تو کیا قہقہہ آجاتا ہے۔ (ہلہلہ) اس کے علاوہ قدیم آلہ کی شادی پر جو بہت سال کسی کی شادی کا انتظار کرنے کے بعد آئی۔ اس میں بہت مزا آئی۔ بہت بہت زیادہ۔ اب آپ کہیں کی کہیں ہم نے تو یاد لکھنے کو کہا تھا آپ نے یادیں

لکھ دیں تو بس جی ہم تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہونے والے ہیں (الحمد للہ! ماشاء اللہ! الحمد للہ! نظریہ سے بچائے)

اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری خوش کن یادیں ہیں لیکن بس بہت ہو گئیں۔

2- پہلے میں مصنفہ کا نام نہیں پڑھتی تھی بس کہانی پڑھ لی۔ اب نام پڑھنا شروع کیے ہیں تو کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے میں جس کا نام لکھوں وہ بہت پرانی ہو۔ سو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔

3- کوئی ایک کتاب ہو تو قارئین بلکہ ساری کتابیں ہم نے اسی سال پڑھی ہیں۔ سب ماہ نور کی مہینگی کی وجہ سے ہے۔ اتنے سارے پلوں نے کر پڑھے اور گھر والوں کو بھی پڑھائے۔ جیسے کہ ”عہدہ واجدہ کے حاصل“ ”لا حاصل“ ”من و سلوی“ میں نے خوابوں کا شجرہ کھا ہے ”زندگی گزار ہے“ ”مرتب“ 9th میں ہی پڑھ لیا تھا اس کے علاوہ پیر کال بھی پڑھا تھا تب کچھ میں نہیں آتی اب پڑھا ہے تو کچھ میں آتی ہے اور بہت آتی ہے۔ اس کے علاوہ ”مستعربان“ ”ملی سے نکلتے ہیں جو لفظ“ ”میں روئے آتسو“ ”ملی بھولوں کی ہستی“ ”تو وہ دیکھو۔“

یہ سارے پلوں پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ مزا آئی۔ اتنے سارے شعروں اقتباس پسند آئے ہیں اب کون کون سے لکھوں! انتہا مشکل کام دے دیا ہے سر حال پڑھیں اور دودیں۔

اقتباس :-

”جو چیزیں اللہ نہیں دیتا اسے انسانوں سے نہیں مانگنا چاہیے۔“ (من و سلوی)

”زندگی میں ایک چیز ہوتی ہے جس کو تم نہیں بدل سکو تو اس کے ساتھ کمبو دانا نہ کر لیا کرو۔ اپنی کسی بھی خواہش کو جنوں مت بنایا کرو۔ زندگی میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیں نہیں مل سکتیں چاہے ہم بومیں چائیں یا بچوں کی طرح اڑیاں رکڑیں کیونکہ وہ کسی دوسرے کے لیے ہوتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی میں ہمارے لیے کچھ ہو نہی نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ ہمارے لیے بھی ہوتا ہے۔“ (امرتیل)

ادارہ خواتین و انجمن کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ابتدا ہی سے بہت عمدہ لکھنے والی مصنفین کے ساتھ بات چیت کا رشتہ قائم رکھا ہے۔ ہاں وہ اس کے دلچسپی اور تفریح کے ذرائع بڑھ چکے ہیں۔ جدید دور نے مصنفین کی اس سادگی کو دیا ہے۔ ہماری قارئین کی محبتیں میں کی نہیں آتی ہے۔ وہ اسی ذوق و شوق سے ”شعاع“ کے شکر ادا کرتی ہیں اور ہمیں خط لکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

”خ فزا ہماری ان قارئین میں سے ہیں جو پہلے پڑے سے شعلہ پڑھ رہی ہیں اور یہ ساتھ آج بھی اسی طرح قلم ادا کرتی ہیں۔ انہوں نے خط لکھ کر اپنی محبتیں کا اظہار کیا ہے۔“

اس ماکہ کا خط

شع فزا

آپ نے فرمایا۔ ”مجھے بہت بھوک لگی تھی اس لیے باہر نکل آیا۔“

یہ سن کر حضرت عزت نے فرمایا۔ ”وہ بھی اسی وجہ سے باہر پھر رہے ہیں۔“

اس وقت میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمرؓ سے باہر پھرنے کی وجہ دریافت کی۔ وجہ دریافت بولے فرمایا۔ ”میری بھی اتنی گری میں باہر آنے کی یہی وجہ ہے۔“

پھر تک صلی اللہ علیہ وسلم انہیں لے کر حضرت ابو ایوب انصاری کے پاس آئے۔ اس وقت ان کے پاس بھی کھانا ختم تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاری نے ہمیں گری کی اور بھوکا۔ وہ بہت لذت مند تھے۔ سب نے سیر ہو کر کھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب بھی ایسا کھانا ملے تو پہلے ہم اللہ پڑھو پھر یہ دعا پڑھو۔“

آج مانیں اتنی سی بچی کی زبانی یہ دعائیں کر سب چشم کر آپ ہو گئے۔ پتی کو سب نے بہت مبارکباد۔ مجھے تو یہ پڑھ کر تعجب ہوتا ہے جب بعض لڑکیاں لکھتی ہیں کہ وہ والدین سے چھپ کر یہ رسالے پڑھتی ہیں یا یہ کہ پڑھنے پر والدین سے مار پڑی۔ ان رسالوں میں تو تحریک اخلاق کوئی عجز ہوتی ہی نہیں! پھر والدین کیوں پڑھنے سے روکتے ہیں؟ جوان بچیوں کو زندہ کوپ کرنا اخلاقی لحاظ سے بھی اچھا نہیں

شع فزا - اسلام آباد

میں بہت عرصہ سے خواتین اور شعاع و انجمن پڑھ رہی ہوں۔ خواتین میں نے پہلی بار جنوری 1978ء میں خرید لیا تھا اور آج تک بہت یاد دہانی سے پڑھتی آئی ہوں بلکہ جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ آپ شروع رسالوں سے بہت کم قیمت پر دے رہی ہیں تو میں نے بڑا دیر کی بی بی رسالوں کے یعنی 73ء، 74ء، 75ء، 76ء اور 77ء کے منگوائے اور جب 85ء میں شعاع کا اجراء ہوا تو وہ بھی تحیر سے لینا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ حنا دور کرن بھی اکثر لیتی ہوں یا قاعدہ نہیں۔ اور جو چیز آپ کو خط لکھنے کا موجب بنی وہ یہ تھی کہ آج دوسرے نام کھانا کھانے بیٹھے تو میری نو سالہ نوایں بھی کھانے میں شامل تھیں۔ کھانا ختم کر کے وہ بولی۔

”مقام عزیز میں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں یہ کیا اور ہمیں انعام فرمایا اور ہمیں خوب کیا۔“

سب نے جب سے بچی کی کتاب دیکھا اور دریافت کیا کہ یہ یہ کمال سے لکھا؟

اس نے بہت کمال ملنی جان کے شعاع سے۔“

پھر اس نے بتایا کہ آج اس نے ماہ مارچ کے شعاع میں دعائیں پڑھیں۔ حضرت عباس سے موی ہے کہ ایک روز حضرت ابو بکر صدیقؓ گری میں باہر پھر رہے تھے۔ حضرت

میں امریکہ کینیڈا اور برطانیہ کی ہوں۔ ان بنگلوں میں ان رسالوں کو خاصا سراہا جاتا ہے۔ میں نے 35 سالوں میں کم و بیش سو کے قریب خریدار بنائے ہیں۔ میں آپ پر احسان میں جتنا دیکھتی ہوں یہی بات کر رہی ہوں۔ باہر کے ممالک میں ایم سلطانہ خاتون کو بہت سراہا جاتا ہے۔ شعلہ کے اجراء کے دو سال بعد "شام آرزو" کے عنوان سے ان کا قطب وار ناول چھپا ہوا تھا۔ امریکہ میں اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان دنوں امریکہ اور کینیڈا میں آسیر رزائی کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ سب کا خیال ہے کہ وہ دنیا کو خوشے میں بند کرنے کی ماہر ہیں۔ انہوں نے شاید ہی کبھی دو قسطوں پر جی ناول لکھے۔ ان کا نثر اور جزا انہیں ہو جاتا ہے کہ بڑے والا جانتا ہے کہ وہ دور لبا کر رہے۔

اب آخریں کچھ خند بھی کر لی گی۔ یہ پچاس سے بھی
 اور اضافہ پر مشتمل ناول لکھنا چاہتیں۔ اب تیز رفتاری
 کا زمانہ ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ دوس دوس قطرے
 کر لوگ آتا جاتے ہیں اور پھر سال لینا بند کر دیتے ہیں۔

کہتے ہیں۔ جب کوئی نیا ٹائل چھینا شروع ہوا پھر لینا شروع
 کریں گے۔ بہت طویل اقلیت سے لوگ آتا دیکھیں۔
 ”ایک زائر تھلاں میں مسافر میں مقیم واسا آستان زندگی
 کی اک روشنی“ کی اقلیت اتنی طویل ہوئی کہ بڑھتے والوں
 کے دھڑے سے بے زاری جھپٹنے لگی اور اب اکثریت
 ”زرد موسم“ اور ”محبت خواب سفر“ کی طوالت سے
 پریشان ہے۔ آپ باہری عائد کریں کہ دس اقسام یا زیادہ
 سے زیادہ ایک ٹائل کی چندہ اقلیت ہونی چاہئیں۔ دوسری
 بات یہ کہ بعض انگلش کے الفاظ اکثریت سے استعمال کر کے
 رسالہ کے ایچ کو خراب کر دیتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسے لگتا
 ہے جیسے کہ لکھتے وقت انگلش دشمنی پاس رکھتی ہیں اور
 اس میں سے انتہائی مشکل الفاظ و صوبہ کر لکھتی ہیں۔ اس
 سے اردو کا ستیاناس ہوتا ہے۔ اردو کا ٹائل اردو میں لکھیں
 اور انگلش کی اسٹوری عمل انگلش میں لکھ کر کسی انگریزی
 کے میگزین میں بھجوائیں۔ آخر میں معذرت چاہتی
 ہوں۔ اگر میری باتوں سے تکلیف پہنچی ہو تو معافی کی
 طلب گار ہوں اور میں ہر حالت میں آپ کے رسائل کی
 خیر خواہ ہوں۔ تحلوں کو دن دینی اور رات چو گنی ترقی مطلق
 فرمائے۔ (آمین)

blogs

ادارہ خواتین و انجمن کی طرف سے بہنوں کے لئے قوی صورت نمائند

☆ ستاروں کا آنگن،	نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے	☆
☆ درو کی منزل،	رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے	☆
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین		قیمت: 400 روپے	☆
☆ تیرے نام کی شہرت،	شازیہ چوہدری	قیمت: 250 روپے	☆
☆ امر بیل،	عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے	☆

شماره کتاب: مکتبہ، عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



زنگیل



ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@xinwaterdigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔

آخر میں ایک درخواست ہے کہ کرکٹرز اگلے ہر دور کا انٹرویو شائع کریں۔

نہ۔ شہین، شہناز، شہرین، شہناز اور شہانہ۔ کب نے شعاع کی محفل میں شرکت کی بہت شکر ہے۔ شہناز سعدی کے بلوٹ میں کب کو ہلا ملک کے ہاول "جو" ملے تو جاں سے گزر گئے، کبھی مہاشیت محسوس ہوتی لیکن ہم اس سے متفق نہیں۔ یہ ہلا ملک کے بلوٹ سے واقعات کے لحاظ سے ہی نہیں انداز نیاں اور انتہام کے لحاظ سے بھی مختلف تھا۔ آئندہ ریاض تک آپ کا پیغام پتہ شمار ہے۔

نیلیم ناز نے سکھر سندھ سے لکھا ہے
 ہاؤل کا ڈور کس ہمت پر اترھا۔ شادی مبارک میں ام
 شہناز کی دوست دیکھی ہمت خوب صورت ہے۔ بھئی!
 دل بے چین ہے سب سے پہلے رخسانہ جی کے
 ٹاؤٹ پر بھرے گے لیے۔ رخسانہ جی! انیہ پر اتنی
 زیادتی اچھی نہیں، پہلیز اسے نرمی کی چلا آئیاں
 کی سکت دے۔

آمنہ جی نے بڑی مشکل اردو استعمال کی۔ کاشفہ
حسین کا افسانہ پڑھنے والوں کے لیے بہترین سبق تھا

آپ کے سکون، عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعا میں۔

آپ سب کو نیا سال مبارک ہو۔
اب آتے ہیں آپ کے خطبہ کی طرف۔

شہناز قیصرانی، شہناز قیصرانی، نسreen قیصرانی، منٹاز
قیصرانی اور شبانہ قیصرانی تو نہ شریف سے شریک
محفل ہیں

سب سے پہلے شعلہ کے اشاف اور قارئین کو
نئے سال کی مبارکبادیں ہو۔

اب آتے ہیں اس بار کے شمارے کی طرف
ماتعلیٰ گزرتی بہت اچھی تھی۔ جس بات نے ہمیں
خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ تھا شہناز صدیق کا ٹولہ
الہی تم نے مل کر لکھنے۔ "یہ ٹولہ الملک کے ٹولہ" جو
میلے تو ہیں سے گزر گئے "سے بہت نمائندہ کر کے
تھا۔ پس اگر وہ مل کے ٹولہ ملے گئے تھے۔

تو ریاض کا "مستند و شام" "تجربہ جارا ہے۔ خاص
 کر "شور و غبار" کا کردار عرف کے قاتل ہے اس
 کے علاوہ بھی اس نے اور بلوٹ اچھے تھے ہمیں
 "کون کے ہموں سے" کا سلسلہ بہت پسند ہے۔

”دل ہے سمندر“ ٹول اٹھا ہوتے ہی سمجھ گیا تھا کہ غالب نماز کا کزن ہو گا پناہ دے جسکی خود غرض بیٹیاں بھی ہوتی ہیں بڑی حیرت ہوئی۔

نکل آیا جیسی مخلص عورت نے طیبہ کی شخصیت کو سنوارا۔ بہت فاطمہ کے تمام اختلافت ایٹھے تھے خصوصاً ”عید اللہ عظیم کی غزل“ باقی سلسلے بھی پیش کی طرح تحقید سے عاری تھے آخر میں اپنے پیارے وطن اور مذہب اسلام کے لیے دل کی کمرانیوں سے دعا گو ہوں کہ آنے والا نیا سال تمام امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کامیاب اور پرامن ثابت ہو (آمین)

رحمۃ۔ نعلیم! اللہ تعالیٰ آپ کی دعائیں قبول کریں۔ آمین۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان۔ نور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

عفت جنیں نے فیصل آباد سے لکھا ہے
ٹائٹل پر نظر پڑی تو دل باغ باغ ہو گیا۔ ٹائٹل بہت اچھی لگ رہی تھی بعد سوچ کے۔ سب سے پہلے میں نے رخسانہ نگار کے جوت کی طرف دیکھا۔ جس کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ ایک تو اس زندگی کی بچی۔ مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ اتنی خود سوار اور خود غرض پلیر رخسانہ جی غائبہ اور بلال کی جوڑی نہ ٹوٹے۔ پلیر میرا سروے شامل ضرور کیجئے گا۔ کس ہر پار کی طرح صرف مخصوص نام ہی شامل نہ ہوں۔ بلال شعل ہر طرح سے پرفیکٹ ہے۔

نازیہ اشفاق نے لودھراں سے لکھا ہے
میں 7th کلاس سے شعل اور خواتین دونوں پڑھتی ہوں۔ نوسال سے زیادہ ہو گئے ہیں، پہلے بھائی سے منکوائی تھی اب میرے میاں لا کر دیتے ہیں۔ شعل کے سارے سلسلے بہت اچھے ہیں پر میرا موٹ لیورٹ ”تاریخ کے جھوکے“ اور ”پتھر گریر دو جہلی کرنا“ جو کہ اب چھاپا نہیں گیا آپ نے ختم کر دیا ہے

پلیر اسے دوبارہ شروع کروں۔ سبکی رہے ٹائٹل ”افسانے قسط وار ٹول تو پیشہ ہی زبردست ہوتے ہیں (بنا نہیں کیوں) اور باقی کتابیں بھی اچھی اور بھی بہت اچھی ہوتی ہیں آپ سے ایک گزارش کرتی ہے کہ یہ ڈائجسٹ صرف غیر شادی شدہ لڑکیوں ہی نہیں بلکہ خواتین یعنی شادی شدہ لڑکیوں بھی پڑھتی ہیں تو میری آپ سے ایک گزارش ہے کہ آپ ”خوب صورت بنے“ میں پرفیکٹ عورتوں کے لیے کچھ ڈائجسٹ چارٹ کچھ مفید باتیں بتا دیا کریں۔

رحمۃ۔ نازیہ نوسال سے شعل پڑھ رہی ہیں تو خدا تعالیٰ ویر سے کہیں؟ آپ کی تجویز اچھی ہے ہم اس موضوع پر غور کریں گے۔

حسن آباد لاہور سے مسرت شاہین لکھتی ہیں
ایک افسانہ بھجوا رہی ہوں لازمی بتائیے گا کہ قاتل اشاعت ہے یا نہیں۔ ”کوئی دیکھ ہو“ زبردست جا رہا ہے۔ ”دیوار شب“ بھی مسلسل رنگ رہا ہے۔ کاش کہ وقت بر لگا کر اڑ جائے اور مجھے اس کا اختتام جلدی سے پڑھنے کو ملے۔ میں نے اپنے بہت بڑے شہدوں میں سے وقت نکال کر آپ کو لکھا ہے۔ میرا شوق صرف ڈائجسٹ پڑھنا ہے اور بہت سی کتابیں لیکن شاعری میری سمجھ میں نہیں آتی نہ ہی شعر یاد رہتے ہیں۔

رحمۃ۔ یاری مسرت! افسانہ ضرور پڑھیں گے اور قاتل اشاعت ہو تو شعل بھی کریں گے ابھی پڑھا نہیں اس لیے رائے دینے سے قاصر ہیں۔ ”دیوار شب“ کے لیے آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ عالیہ بخاری اسے جلد مکمل کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں شعل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

جام پور سے زرقا الفیض شریک محفل ہیں
شعل 30 دسمبر کو ہمارے حسین ہاتھوں کی قید میں تھا بلال کرل پہ اک نگاہ غلط ڈالتے ہوئے قسط وار کتابوں کو پڑھنا شروع کر دیا عالیہ بخاری سے مطمئن

لو کر مکمل ٹول کے پیچھے پڑ گئے۔ رائدہ افشار جی افسانے معذرت کے ساتھ عرض کروں گی جی آپ کا ٹول زیادہ ہمارا نظام انتظام خراب ہو گیا چنانچہ جو کچھ والا افسانہ ہم سے ختم نہیں ہوا۔ کمالی کو اک دم مزے سے پڑھتے پڑھتے پڑھ کر اک مل کو رک جانا پڑا لیکن خود اس کے چل کر عظمیٰ افشار جی نے دل کو سنبھالا دیا عظمیٰ زہر آپ نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا دوسروں کے تجاوت سے میں نے ایک چیز کا کمالی سے مشاہدہ کیا ہے کہ کسی کے دکھ کی بنیاد پر کچھ کر ہم خوشی کا مکمل بھی تحسیر نہیں کر سکتے۔ آپ نے فرح مجب کے ساتھ اچھا کیا۔ ”چچا ساتھ“ میں مقدس شعل کا انداز بہت مختلف اور اچھا لگا بعض دفعہ ایک پڑھا لکھا انسان جاہلوں سے بدتر اور جاہل انسان تعلیم یافتہ انسان سے زیادہ پاشور ہو سکتا ہے۔ بعض دفعہ میں سوچتی ہوں کہ ہماری راسخز کتنا اچھا لکھتی ہیں اور ہماری قارئین بھی بہت ذہین ہیں اچھے لوگ کو اچھا ذہن مل جائے تو سونا کنڈن کی مثال بن جاتی ہے۔

نوے فیصد کتابتیں میں نہیں شروعات پڑھ کے انتظام پڑھتی ہوں اور جو بالکل ٹھیک ہوتا ہے مجھے وہ کتابیں زیادہ پسند آتی ہیں جس کے بارے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہو ”اواخر سرویاں عروج“ ہیں اور صبح جاگتے ہی ہماری پہلی دعا یہی ہوتی ہے پلیر اللہ جی باہر پائل نہ ہوں سرویوں میں انقلاب جی ہمارے لیے محبوب کا مقام رکھتے ہیں ان کی بدل کی کاغذ دل سہارا نہیں پاتا۔

میری راسخز سے فرمائش ہے کہ کسی ڈاکو بیہوش کمالی لکھیں جس کو کہیں سن اپنی محبت سے راور است پے لے آئے۔ مجھے کسی نوجوان اور خوب ذاکو سے ملاقات کا بڑا شوق ہے حقیقت میں تو وہ نہیں ملتی راسخز جی سے التماس ہے اپنے ٹول میں ہی کروادیں۔

رحمۃ۔ یاری زرقا! راجی میں تو سروی آتی ہی نہیں ہمارا اسل ای انقلاب چمکا رہا ہے ہمیں تو بہت اچھا

لگتا ہے کہ جب کچھ دان کے لیے یہ ہاتھوں میں چھپا رہے۔
آپ نے حوصلہ نہیں ہارا، یہ کامیابی کی دلیل ہے۔
انشاء اللہ ایک دن ضرور آپ کی تحریریں شائع ہوں گی۔
ڈاکو، بیوی کمالی کی فرمائش مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

عابد وحید نے فیصل آباد سے لکھا ہے
دسمبر کا شعل ہاتھ آیا۔ ابھی صرف ٹائٹل میں بارہ خان کو دیکھا ہی تھا کہ چھوٹی بن نے شعل کو دیکھ لیا۔ پہلے وہ دن شعل اس کے ہاتھ میں رہتا ہے میں ٹائٹل دیکھتی ہوں پھر پورا مینہ میں شعل پڑھتی ہوں اور وہ ٹائٹل دیکھتی رہتی ہے۔ پہلے بات افسانوں کی آئینہ مفتی کا ”یہ میرے خواب“ دل ملا گیا اور کاشفہ حسین کا ”پانچ ہزار کا ایمان“ افسانہ تو شخصہ توں یاد رہے گا۔ اس کے علاوہ سلسلہ وار ٹول میں عالیہ بخاری کا ”دیوار شب“ اور آئینہ ریاض کا ”ستارہ شام“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ رخسانہ نگار کی ”کوئی دیکھ ہو“ کی جتنی مرضی افسانہ پڑھا میں اس کی پڑھتے پڑھتے ہی دین کیونکہ یہ دنیا تو ایسے ہی سازشی لوگوں کی ہے۔ ان سے متصد میں کامیاب بھی رہتے ہیں اور زندگی میں کوئی بچتا ابھی نہیں ہوتا۔ ہم رسالے میں ہی ایک سازشی کو سزا ملے تو کچھ کر خوش ہوئیں۔

شہناز صدیق کا ”گلی تم سے لگن“ بہت بہت اچھا ہے اب شعل کے بارے میں کیا لکھوں کہ کتنا اچھا ہے کوئی چراغ ہی نہیں ملا جو سورج کو کھاسکوں۔ تعریف کے لیے ڈکشنری میں سے لفظ دیکھنے چاہے سب غائب تھے۔ ”تاریخ کے جھوکوں سے“ سلطان صالح الدین ایوبی کے بارے میں پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ ہسٹری میرا فورٹ سیجیکٹ ہے اسلامک ہسٹری اور تاریخ پاکستان کھول کر پکی ہوں۔ اب یورپین ہسٹری میں جا چکی ہوں۔ اس لیے محمد بن قاسم

”سلطان صلاح الدین ایوبی وغیرہ کے بارے میں پڑھوں تو خوشی دینی ہوتی ہے دسک میں چلیوہ جمل نامریہ خان شاکستہ منعم اور عمران اختر کے اشعار پوز ضرور شامل کریں۔ کیا آپ سے کچھ پوچھنا ہو تو فون کر سکتے ہیں۔ جنت علیہ جی! اشعل کی بزم میں خوش گدیر۔ اگر آپ کچھ دریافت کرنا چاہتی ہیں تو فون کر سکتی ہیں اس میں پوچھنے والی تو کوئی بات ہی نہیں یہ شہناز صدیق اور دوسرے مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔

فائزہ اللہ رکھا، جمعیس آباد

ماہو سمیر کا شمار مناسب سے پہلے سلسلہ وار کہانیوں بہت اچھی لکھیں پھر کوئی دیکھ ہو ”ایمان“ اشعار بہت اچھے تھے۔

جنت فائزہ! پہلی بار خط لکھا اور وہ بھی اتنے مختصر! استندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

شمینہ اکرم ہمارا کافی لیاری

خوب صورت اور یونیک سے فائل کے ساتھ اشعل کا شمار ملا، قسم کرتے اور خط لکھ کر کہاتیل پر تبصرو کرتے میں کی ون کا وفد آئیڈ چند ایک کہاتیل کے علاوہ تمام شمارہ زیر دست حملہ ”دیوار شب“ بہت ترسار رہا ہے عالی جی! جلدی سے معاذ اور جوا کی نیابار لگا دیں اور سالار کے خاص جزیروں کی ہمسایہ تو سنی تک پہنچ جانی چاہئیں۔ جبکہ خیام کا ذکر تو کئی ماہ سے بالکل گول ہو گیا ہے۔

”ستارہ شام“ کی کہانی میں کرداروں کی بھرمار ہے اسی لیے ابھی تک اسے سمجھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ راہبہ افتخار کا ٹول ”دل سے سمندر“ کو کہ وہی پرانا موضوع۔ امیری غریبی اور آخر میں بھی اچھا۔ ذہن قلم رہا پھر بھی پڑھ کر اچھا اور کچھ نیا لگا۔ مگر مقدس شعل کا نیا ٹول بہترین رہا۔ آج کل نئی رائٹرز بھی کتنا اچھا لکھ رہی ہیں۔ سلسلہ وار ٹولٹ

”کوئی دیکھ ہو“ میرا موشن ٹیورٹ ہے مگر کبھی کبھی مانیسی کی بے وقوفی پر غصہ آتا ہے جو جانتے بوجھتے اپنے چہرے پر خود کھڑائی مار رہی ہے۔ ٹولٹ ”لاکی تم سے لگن“ میں شہناز صدیق نے جاگیرداروں اور سرداروں کا ایک نیا روپ دکھایا جس کی وجہ سے مجھے بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ کاشفہ حسین ”آند مفتی“ ہاضمی افتخار کے افسانے بھی اچھے لگے۔ اللہ تعالیٰ کا اس ادارے پر یہ بڑا کرم ہے کہ ہر دور میں اتنے اچھے لکھنے والے لکھاری ملتے ہیں جو کہ اپنی رائٹرز کی جگہ بہت اچھی طرح پر کرتے ہیں۔ کوئی جگہ باقی نہیں رہ جاتا اور اس کے پڑھنے والوں میں کمی کے بجائے روز بروز اضافہ ہی ہوتا ہے اور کوئی بھی قاری جو صرف ایک رسالے سے پڑھنا شروع کرنا ہے وہ بہت آہستہ آہستہ کرن، خواہمیں اور شعل تینوں رسالوں کو فون شوق سے پڑھنا شروع کر دیتا ہے اور ریکورڈ قاری بن جاتا ہے۔ ”شادی مبارک ہو“ میں ام شام نے ڈاکٹر عالیہ کاشوری کا احوال خوب لکھا۔ موسم کے پیمان میں ”انڈوں کا طوطہ“ دھیمی دھیمی اور پھر زلی کی بستر، جتنا خوب داد وصول کی اس ماہ کی مسکرائیں اچھے خاص مسکرائیں بنے۔ بلیمیں۔ زیادہ تر پڑھے ہوئے خط لکھتے تھے۔ البتہ سونیا ربانی کی مسکراہٹ اور اس ماہ شعر بھی سونیا ربانی کا پسند آیا۔ سلسلہ ”شعل کے ساتھ“ اور آپ کا پاور پی خانہ ”بھی ضرور پڑھتی ہوں۔ تاریخ کے جموں کوں سے پڑھ کر ہماری معلومت میں گراں قدر اضافہ ہوتا ہے اتنے مکمل پروجے ترتیب دینے پر آپ سب اسٹاف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جنت بیاری شینہ! طویل عرصہ کی غیر حاضری کے بعد آپ نے تفصیلی خط لکھا شعل کی پینڈیڈی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے قادر مبین ہمنوں سے بھی شینہ کی صحت و تندرستی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

”عشرت“ ہمارا پورے شریک محفل ہیں

سب سے پہلے اپنے پسندیدہ مستقل سلسلے کی بات کروں گی ”تاریخ کے جھوکے“ اور ”ہمارے بچہ کی باتیں“ بہت اچھے سلسلے ہیں۔ ان سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ سلسلہ وار ٹولٹ میں آند ریاض کا ٹول بہت اچھا ہے خاص طور پر ولید اور انیسابی ٹوک جھونک اور ماوی کا نام مجھے بہت پسند آیا ہے۔ مکمل ٹول وہ ٹول ہی اچھے تھے۔ ٹولٹ میں ”چھوٹی سی بات“ اور ”لاکی تم سے لگن“ اچھے تھے اور افسانوں میں ”عید سعید“ اور ”سمت کی کہانی“ فیسٹ تھے آند میر نے اپنے افسانے میں بہت بات کہی ہے کہ ہمیں نئی نسل میں تو اللہ کے احکام کو ضرور ازیر کروا میں تاکہ وہ اپنے لیے سیدھا راستہ پسند کریں۔

جنت عشرت! شعل آپ کو پسند آیا شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔

شمائلہ کرن راہولینڈی سے تشریف لائی ہیں

میں پہلی بار آپ کی بزم میں شرکت کر رہی ہوں۔ مجھے آپ کی بزم میں جس چیز نے شامل ہونے کے لیے مجبور کیا۔ وہ سمیر 2010ء کا شمارہ ہے۔ سب سے پہلے حمد اور نعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھی۔ دلی سکون حاصل ہوا اس کے بعد ”دیوار شب“ ”ستارہ شام“ اور ”کوئی دیکھ ہو“ پڑھے۔ ”دیوار شب“ طویل ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ٹول آتناڑ سے ہی زیر دست جا رہا ہے۔ پلیز عالیہ! ختام کا ذکر بھی کریں۔ اس ٹول کا انتظام اچھا کیجئے گا۔ آند ریاض بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اس ماہ شہبہ العباس (کردار) کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مجھے اس کا کردار بہت پسند ہے۔ یہ بات کافی حد تک اپنی جگہ درست ہے کہ کلانی کرم مزاج کا ہے لیکن اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ کچھ عموماً ہیں جو اس کے کرم مزاج ہونے کی وجہ ہیں۔ تو آند ریاض میں کی کہ اس کردار کے بارے میں اچھی باتیں سنائے آنا باقی ہے۔ ”کوئی دیکھ ہو“

رخسان نگار کا ٹولٹ اچھا جا رہا ہے۔ نااضلی مت کیجئے گا۔ اس کہانی کے تمام کردار بہت اچھے ہیں۔ شہناز صدیق کا ٹولٹ ”لاکی تم سے دل کی لگن“ بہت پسند آیا۔ کہانی پڑھتے وقت یوں محسوس ہوا کہ میں خود اس میں موجود ہوں حقیقت سے قریب تر کہانی ہے۔ راہبہ افتخار کا مکمل ٹول ”دل سے سمندر جیسا“ عنوان کی طرح کہانی بھی زیر دست لگی۔ راہبہ! آپ نے کرداروں کے نام اچھے رکھے ہیں۔ لائما اور غلب کا کردار بہت سی اچھا لگا۔

جنت شمائلہ جی! ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ شعل کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہو اور آپ کی پسند کے معیار پر پورا اترے اور آپ ہمیں ہر ماہ خط لکھیں۔ و سمیر کے شمارے کی پسندیدگی کی وجہ سے آپ نے خط لکھا اچھا ہو تاکہ آپ ہمیں خط لکھ کر اپنی پانڈیڈی سے بھی آگاہ کریں۔

شمائلہ شہزادی نے چوک جمل خانوال سے لکھا ہے۔

آئی اس بار تو مکمل ہی ہو گیا کہ مجھے شعل 22 سمیر کو ہی میں کیا میں خانوال پیسے دیے تھی اور شعل بھی لے آئی۔ میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہوں ہمارے ہاں اسکول صرف ٹیل تک ہے۔ نااضل ہمارے خان بہت اچھی لکھ رہی تھی۔

جنت شمائلہ! بہت افسوس تاک ہے کہ اس ملک میں جہاں بڑے افسران اور حکومتی ارکان نے ملک و قوم کے اربوں روپے لوٹ کر بیرون ملک بینکوں میں جمع کر رکھے ہیں۔ وہاں چھوٹے شہلوں اور گاؤں میں تعلیمی سہولیات بھی میا نہیں ہیں یہ اچھی بات ہے کہ آپ نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا ہے۔

شعل کی پینڈیڈی کے لیے شکریہ۔ شہناز سلیمان تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ سے تشریف لائی ہیں۔

میں راہبہ حسین کا ٹول ”رنگ رہ گئی“ پڑھنے کے بعد میں اس کی باقاعدہ قاری بنی ہوں آپ سوچ رہی ہوں گی کہ پھر اتنی دیر کیوں؟ بعضی جب راکا پوٹھی کے

پہاڑوں سے (آتے ہوئے) کریشے اور افق کو دیر ہو سکتی ہے تو تمہیں کیوں نہیں "قرآنِ مہم کا تلخ"، "زورِ موس" "نوع اور شب" میرے پرنسپل و ناول ہیں مجھے خوشی ہے کہ میرے مطالعے میں ہری پور سے حنا سلیم احوال بھی شرکت کر رہی ہیں۔

ج. شہناز اشعل کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کا شعر شائع کیا جا رہا ہے۔

مستفین تکسائی رائے پناہ سکے۔
 مرنم! ہمیں احساس ہے ہماری ہمت سی ہمارے
 تکر پر چادر سے پناہ ہے ہم ان کے خط ضرور شامل
 کریں گے آپ نے اس خط میں پرچے کے پارے
 میں پچھ نہیں لکھا اب پر چادر کراپی رائے لکھے گا۔
 اہل مومنہ سنیہہ سنیہہ ماہا اہل مومنہ و
 علیہ و علیہ سنیہہ سنیہہ پچھ پچھ و فحوک جہنم
 قلہ نگ سے لکھا ہے۔

کافور، مسکین، کافور، فریاد تھا "اے اے سہندر"
راہِ انکار نے اچھا لکھ لیا راہِ انکار کا قازمہ انکار کی
سین ہیں اور پلیر قازمہ انکار اور عنیدہ محمد کی تحریر ہوا
ہے۔ اس شاعرے میں شروت نذیر کا نولٹ ویکہ کر لیں
نوش ہو کر لیں۔
میریم اشعلی کی برس میں خوش آمدید اور دعائیں۔
آپ کی تعریف متعلقہ مضمین تک پہنچا رہے ہیں۔
سیا لکھنؤ سے راہِ ریاض لکھتی ہیں۔

آنکھیں کھول دیں پلینے۔ مسٹر شام "بہت اچھا
 ٹاول ہے مجھے باؤی کا گروا بہت پسند ہے اور اس باؤ کا
 بہت پیارا ٹائل" وہی ہے سمندر "بہت زبردست تھا۔
 راتے غازیہ! اہم گفتی ہی مسالوت اور روشن خیالی کی
 باتیں کریں "غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر طبقاتی فرق
 ہم پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے۔ جلیل قطرا" "یرا انیس
 ہے اسے خالی سے بہت محبت ہے نہ وہ یقیناً "اسپنر وہ یہ
 پر غور کرے گا۔
 شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکر۔



خیر! کہ اتفاق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوئے اور راتیں جاگتی ہیں۔ مگر انسانی فکر اور دل لہرائی ہے اس کی پرورش نے دنیا کو
 سے کیا ہے۔ ہر لمحہ وہ اس دنیا سے کشت کید و غافل ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو تھکے بغیر نکل آتا ہے۔ مانتے ہیں اس کا گھر
 مالدار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شہسازاں سے بھر پور پر کام کرتا ہے۔ مالدار تمام معاشی امور کو دیکھتا ہے۔ گھر کے نکلے ہوئے خیر
 رقم کے علاوہ خیر کسب و کار بھی اٹھاتا ہے۔ جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ مالدار اس کے کسب و کار کو جوڑتا ہے۔ خیر کے لئے اس کا
 حیران کن ہے۔ شہر کا کسب و کار روزگاہ بہ ہفت گارہ پڑتا ہے۔ وہ بلور شکر کے ہونٹوں میں قیام کرتا ہے۔ رزق و کسب کے ساتھ اس کی آنکھیں
 دیکھ کر خیر کو شہر سے نکال دیتا ہے۔ اس کی مرشدانہ نگاہ سے وہ جانے والی لاچر و مالٹ جیسے لاکھ ہوتا ہے۔
 دیکھ کر خیر کو شہر سے نکال دیتا ہے۔ اس کے والدین کو اس کے اچانک ہارنے کو کسب و کار میں دیکھ کر ان کا دل بھلا ہوا ہے۔
 میں وہ ہر چیز سے بھر لے کھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی بڑھاپا بھی ہمارا مالدار اور دیکھ کے لیے دھما گوں۔
 دوسرا گھر ان کا تھا۔ اسے عرفا بڑی نمود و نمائش اور عیش و کوسب کھتے ہیں۔ ہر کامیابی کے لئے کھڑک ہونے کے باوجود وہ اپنی
 کوئی سے چھانٹا اس کا ایک ہے۔ غافلانہ ہر شے ان کی اہمیت کی وضوح سے بچیں ہیں۔ ان کے لئے ملان کی نسبت دیکھ کر خیر کی بات سمجھنے
 کے حوالے سے ہیں۔ وہ اس حالت سے اس فیصلے پر غافل ہے۔ چھانٹے سوان کی مٹکی شہر سے قبول ہیں۔ ان کی دوست کمال کی ایک اور کمال سے
 گری ہیں۔ ہر سب کو دیکھ رہا ہے۔ دیکھ کر اس کا تمام پریشانہ لطف ہے۔ عرفا اور مالدار ان کی دل میں ایک دوسرے کو کھینچ رہے ہیں۔ حالات
 مواضع ہیں۔



<http://pakfunplace.com>

www.paksociety.com

www.paksociety.com



نیل کے چہرے پر ہوائیاں اڑی تھیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنی صفائی میں کچھ کتا چاہا۔
لیکن زرنج نے اس کا بھی موقع نہیں دیا۔
”تمہاری رنگ ریلوں سے میں نے جان بوجھ کر نظر حلقی حلقی نیل میں بے خبر نہیں تھی کہ تم کہاں جاتے آتے ہو گیا خرچ کر رہے ہو وہ وہاں تمہارے میزبان بنے بیٹھے تھے میرے ہی لوگ تھے تم یہ کیوں بھول گئے تھے۔“

نیل کو اپنے لاہوری میزبان کی کرم فرمائیاں یاد آئیں تو ساتھ ہی اس کی ہر فکٹ اور کاری پر رشک بھی آیا۔
”وہ مجھے خود اصرار کر کے لے گیا تھا اور پھر اتنے عرصے سے میری اور اس کی دوستی بھی تھی اسے شرم تھی کہ وہ مجھ سے میرے بارے میں غلط فہمی پھیلاتا ہے۔“
بالآخر وہ کچھ کہنے میں کامیاب ہوا۔

زرنج نے بہت حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری دوستی۔۔۔ زبان کے چہرے پر زہریلی سی مسکراہٹ پھیلی۔ ”میرے اٹلشن کے بل پر وہ سوتیاں دیتا ہے تو یہ یاد رکھا کہ وہ لوگ تمہیں نہیں جانتے ہیں ان کے مفادات مجھ سے بندھے ہیں تمہاری تو دو ٹوٹنے کی اوقات نہیں ہے نیل میں نے ہی غلطی کی جو تمہیں اتنا سر پر چڑھایا کہ تم میرے سر پر خاک ڈالنے لگے۔“

وہ بڑی طرح آؤٹ ہو رہی تھیں۔
نیل کو حالت اسی میں محسوس ہوئی کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہیں خاموشی سے سن لیا جائے بعد میں ان کا منہ لٹھلکا کر کے لیے وہ پیار محبت کا آزمودہ پختہ استعمال کر ہی سکتا تھا کسی کا فون آنے پر وہ چند لمحوں کے لیے دوسری طرف متوجہ رہیں۔

نیل نے اپنی ویر میں ایسی عورت کی پہنچ اور خطرناکی کا ایک بار پھر سے تجربہ کیا اور اپنا بھی وہ شاید ضرورت سے زیادہ پُر اوجہ و دوپٹا پہنچا پھر بے صبر۔
”یہ بڑے لطفی۔“
”سالار کا رنگ تم نے کروائی تھی؟“

”اے۔۔۔ اس نے چونک کر زرنج کی طرف دیکھا وہ ایک بار پھر اس کے سر پر کھڑی تھیں اور اپنا سوال دہرا چکی تھیں۔
”جھوٹ مت بولنا میرے اپنے ذرائع بھی ہیں اور سارا شک سو فیصد تم پر ہی جا رہا ہے۔“
نیل نے ایک کمری سا سانس لی۔

اس تمام عرصہ میں کم از کم ایک بات تو وہ جان ہی چکا تھا کہ زرنج کے سامنے جھوٹ بولنا بالکل ہی بے کار ہے۔
وہ بات کی جڑ تک بٹاتی جاتی ہیں اور جھوٹ ٹھٹھنے پر اور بھی زیادہ زہریلی ہو جاتی ہیں۔
”اس نے میری زندگی بے شمار بھی تھی تم بھی گواہ ہو اس بات کی۔“
یہ اس کی طرف دیکھے اس نے بے تاثر لہجے میں اعتراف جرم کیا۔

چند سانسوں کے بعد وہ جھل انداز میں ان دونوں کے کچھ آکر کے
جو کچھ اس نے کیا تھا کھلا راز تھا پھر بھی جب وہ اس سے پوچھ رہی تھیں تو بل سے خواہش مند تھیں کہ وہ سختی سے اس الزام کی تردید کر دے۔
مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔
”اس کا انجام جانتے ہو نیل!“

زرنج لا سہولہ۔ ”میں سی دہشت پسلا رہا تھا وہ بڑی بہت کر کے مسکرایا۔
”میں صرف تمہاری محبت کو جانتا ہوں زرنج! تم مجھے ہر مصیبت سے بچا سکتی ہو۔“
وہ بڑی ساکت لگا ہوں سے اسے دیکھے گئیں جن میں صرف اجنبیت تھی۔

”حمیدی صاحبہ! بارے کے ہیں تمہارے اس بے ہودہ اندازہ و غیر میں اور حمیدی صاحب کی کیا حیثیت تھی سالار کی زندگی میں وہ بے شک ہو گا تو ہمیں خود اندازہ ہو جائے گا۔“
انہوں نے نظریہ انداز میں اطلاع دی تھی یا نہ تھی۔
”مطلب؟“ نیل نے انہیں سی محسوس کی تھی۔

”حمیدی صاحب کے قابل کو سالار چھوڑنے والا نہیں ہے، تم اگر اپنی بچت چاہتے ہو تو سالار سے کسی بھی قیمت پر تعلق برقرار نہ رکھو چاہے تمہیں اس کے جوئے بھی چاہئے پڑیں یہی ایک صورت ہے بھائی۔“
ایک ذلت بھرا مشورہ دے کر وہ باہر چاچکی تھیں۔



کمرے میں موجود سبھی لوگوں نے بڑی امید بھری نگاہ سے معاذ کی طرف دیکھا تھا۔
”اتنے بڑے شہر میں ہم تو آپ کے علاوہ کسی کو بھی نہیں جانتے اور پھر لڑکی ذات ایسے ہی کہاں چھوڑا جاسکتا ہے آپ ہی راہ نکالیں گے تو کچھ بات نہ کی۔“
نیل نے تھکے انداز میں سعیدہ نے بہت سنبھل سنبھل کر بات پوری کی تھی جس کے بعد وہ سب اس طرح معاذ کی طرف دیکھنے لگے جیسے وہ ابھی استین میں سے کیوڑ نکال کر اڑائے گا یا پھر وہ اپنی کوئی اور کر تہ۔
”بس اب دوڑ لے میاں سے بہت ہو گئی ہو رہی۔“

بالکل ساتھ ہی نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی مگر وہ اس کے مشورے پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کر سکتا تھا سو سعیدہ کے چچا کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں اور دونوں بچوں کو آپ لے کر جا رہے ہیں تو زرنج کے لیے بھی گھنٹا نکال سکتے ہیں بھائی ہیں یہ اس کی ان کے ساتھ ہی وہ خوش بھی رہ سکتی ہے ہم اس کا خرچہ دے دیا کریں گے ہر مہینے آپ کو۔“
آخری لائن میں اس نے اپنے طور پر بہترین حل پیش کیا تھا اور پُر امید تھا کہ بخوشی مان لیا جائے گا مگر وہاں کسی کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”اگر ہم لے جاسکتے تو آپ سے گزارش ہی نہ کرتے سعیدہ میری بہن تھی ہے میری ذمہ داری ہے زرنج کے بچا کو بھی بار بار کھلوانا، لیکن وہ تو اب کی موت پر بھی نہیں آیا حیدر آباد سے آج بھی میں نے فون کیا مگر اس نے صاف جواب دے دیا ہے۔“

سعیدہ نے کیا سعیدہ کا بچا حقیقتاً ”مستقل کوئی تھا اور اپنے محدود وسائل کے باوجود اپنا فرض نبھانے کے لیے تیار تھی۔

اس کی گود میں بیٹھا ہوا سعیدہ کا چھوٹا بیٹا معاذ کو دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔ معاذ کے لیوں پر بھی بے ساختہ مسکراہٹ تھی۔

”ہو سکے تو ان بچوں کو پرہائے کا ضرور۔“
”لکڑی مت کریں ان شاء اللہ ایسا قابل بناؤں گا کہ دنیا دیکھے گی میری اپنی کوئی اولاد نہیں نکل کو یہ ہی سارا

میں کے تو اب تو بد نصیب تھا جو اس نعمت کی قدر نہیں کی۔“

اس شخص کے لیے میں بڑی اناجیت تھی۔ معاذ نے بہت سکون سا محسوس کیا۔
 سیدہ اور اس کے بچے یقیناً محفوظ رہا تھوں میں تھے دیوار سے لگی کھڑی زری چند لمحوں کے لیے پس منظر میں
 ہائے تھی۔
 "وہاں شہر میں فوٹ کا لٹیرا لگا تاہوں ہزارے لائق آمدنی تو ہوسکتی جاتی ہے پھر یہ آپ کی چچی بھی بہت عمدہ
 ملائی کرتی ہے اللہ عزت سے وقت پورا کر رہا ہے۔"
 معاذ کی تسلی کے لیے شاید اس نے اپنی آمدنی کے بارے میں تفصیل دینا ضروری سمجھی تھی حالانکہ اس کی
 ضرورت نہیں تھی۔

رہا ان کے آگے رہا تھا میں زندگی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور پوچھ لایا۔
 معاذ کو اندازہ تھا کہ وہ اب چند منٹ سے زیادہ یہاں رکھنے والا نہیں ہے۔
 "اچھا ہو گا جو اس لڑکی کا معاملہ ہمارے سامنے ہی نہٹ جائے تاکہ صبح الگ مکان کو چاہی دے کر کل شام کی
 ٹرین سے نکل جائیں اس لیے آپ کو تکلیف دی ہے۔"
 سیدہ کو بوجہ انار کر پیسہ دینے کی جلدی تھی سو وہ بات کو کہیں اور لٹکا دیکھ کر نمٹانے کی فکر میں مبتلا ہوئی۔
 معاذ کو اس نے آج خاص طور پر ساجد کو بیچ کر یہی بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔
 "زری کو وہیں اسکول میں ایک گھر دے دیں کام وغیرہ بھی کروے گی اور۔"
 معاذ نے بہت حیرت سے سیدہ کو دیکھا۔

"آپ ایک لڑکی کو اس طرح آگیا پھوڑنے کا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں؟ وہ ایک خالی گھر ہے جہاں ہم رات کو تالا
 ڈال دیتے ہیں آپ رہ سکتی ہیں اکیلی نہیں۔"
 نہ جانتے ہوئے بھی اس کی آواز ابھی ہوتی تھی۔ سب ہی کو معاذ کے مود کا یکدم ہی اندازہ ہوا تھا۔
 "تھیک تو کہہ رہے ہیں معاذ بھائی، جو ان لڑکی کو اس طرح آگیا پھوڑنا آخر خدا کوئی بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔"
 بتول نے بڑی دانش مندی سے سیدہ کو گوننا چاہا تھا لیکن اس کے اب سارے کام نہٹ چکے تھے سو اسے کسی
 موت کی لحاظ کی ضرورت نہیں تھی۔

"میں ہی رہ گئی ہوں بوجہ ڈھونڈنے کے لیے ساری عمر اس کے بھائی نے ایک روپیہ لٹا کر نہیں دیا پھر بھی ان
 سب کا پیٹ بھری رہی چاہے محنت کی چاہے بھیک مانگی مگر اب نہیں اس لڑکی کو چاہے دارالامان میں ڈال دو
 چاہے سڑک پر کھڑا کر دو چاہے سڑک پر لٹا کر نہیں۔"
 جس وقت سٹرک پر انداز میں بولے چلی جا رہی تھی معاذ کی نگاہ خود بخود ہی جا کر زری کے چہرے پر پڑ گئی تھی۔
 وہ بالکل کم صم کھڑی تھی اس کے چہرے پر اتنی بے چارگی تھی کہ نگاہ جانے کے لیے بھی بہت دور کا تھی۔
 معاذ نے ہونٹ تھپی سے دہاتے ہوئے نگاہ چرائی۔
 "میں تو کل گھر خالی کر رہی ہوں زری کو آپ لے جائیں، بتول رکھ لے یا پھر جس خدا لے جائے میرا واسطہ
 نہیں۔" سیدہ نے ہاتھ بھاڑے۔

اتنی دیر میں اس نے ایک بار بھی زری کی طرف نہ دیکھا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔
 چند لمحوں کے لیے تو کمرے میں بڑی کمری خاموشی چھائی تھی۔
 معاذ نے دل پر بڑا بھاری بوجھ آتا ہوا محسوس کیا۔
 "تو پھر اس کا انتظام وہیں دارالامان میں ہی کرادیں میری اپنی مجبوری ہے معاذ بھائی پورنہ میں ہی رکھ لیتی۔"
 بتول نے اسے اور خود کو دونوں کو ہی انجمن سے نکالا۔

مغرب کا وقت قریب ہوا جا رہا تھا اور اسے ابھی شام کی بڑیا بھی پکائی تھی۔
 "آپ جا رہے ہیں؟ اسے ابھی دارالامان میں جمع کرادیں یا پھر صبح کو۔"
 "میرا اپنے گھر ڈال لے کسی قصبے میں ویسے تو سنا ہے بہت پڑے مل جاتے ہیں وہاں۔"
 "اسے بڑی انداز میں آتی ہیں وہاں جو چیزیں ہمیں نصیب نہیں دارالامان والوں کو مل جاتی ہیں اور پھر۔"
 بتول کا منہ صرف آخر ثابت ہوا تھا اور اب نور و شور سے بھرپور کیا جا رہا تھا۔
 یہ آوازیں اپنے قصبے کی تائید کے لیے تھیں یا پھر کہیں اندریانی رو کی شرم کی آخری ہلکی سی رتق کو بھی مٹانے
 کے لیے۔

معاذ نے ان سب کے خوش و خروش کو دیکھ کر اندازہ لگانا چاہا۔
 تب ہی بلی کی سی سسکی نے اسے متوجہ کیا تھا۔
 زری اب تنگ حس دیوار کے سارے ٹیک لگائے کھڑی تھی ٹھیک اسی جگہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ جیسے کھڑے
 ہونے کی سکت کھو چکی ہے۔
 گھنٹوں میں منہ دیے سکڑی ہوئی۔
 اس کا پورا وجود ہی طرح طرح کا تھا اور وہ نئی آواز میں بڑے ہی کرب ناک انداز میں رو رہی تھی۔
 کمرے کے کھلے دروازے کے باہر صحن میں دو بھتی ہوئی شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔
 "نیکھا جاتے جاتے بھی نحوست۔ یہ دونوں وقت ملنے کا روٹا پتا نہیں مجھے آگے اور کیا دکھانے والا ہے اللہ تو
 ہی رحم کیجیو۔"

سیدہ نے بہت نفرت سے زری کو دیکھا۔ اور خود پر طے شدہ دہشت طاری کی۔ زری کی ہچکیاں اور بھی تیز
 ہوئیں اور آواز اور بھی کرب ناک۔
 ماحول پر شدید قسم کی سوگوار پھانسی۔
 اور اب جب مسئلہ حل ہونے کو تھا یہ بڑی ہی بد فکری والی بات تھی۔
 وہاں موجود ان سب کو ہی زری کا اس طرح تڑپ تڑپ کر روٹا پتا محسوس ہوا تھا۔
 سیدہ کی قوت برداشت حمل طور پر رخصت ہوئی۔
 "چپ ہوئی ہے یا نہیں گلا دبا کر قصہ شمع کھول تیرا۔"
 تیزی سے اٹھ کر وہ زری پر جھپٹی تھی۔
 "انسی شرم والی ہے تو کچھ کھا کر مر جائیوں ہمارے لیے مصیبت بن کر بیٹھی ہے مگر ہے تو اسی بے غیرت
 خاندان کی خون کا اثر۔"

ایک ہی سانس میں بولتے بولتے اس نے دونوں ہاتھوں سے بری طرح زری کو پیٹ ڈالا معاذ نے بڑی مشکل
 سے سیدہ کو زری سے دور کیا تھا۔
 "بس کرو۔" وہ بہت زور سے چیخا تھا۔
 "کس طرح کے لوگ ہو تم سب بے رحم بے حس۔ یہ ایک چھوٹی سی لڑکی جس کا دنیا میں اب کوئی بھی
 نہیں۔"
 اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ کن لوگوں پر اپنے الفاظ اور وقت ضائع کر رہا ہے سو وہ بات ادھوری چھوڑ کر
 لڑکی کی طرف مڑا۔
 لپٹا لپٹا کے بعد بھی وہ اس طرح اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔

"زری! اتم تارو ما میں کل اگر تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا، چپ ہو جاؤں گا۔" شامش۔
 اس کا ہاتھ ایک بل کے لیے زری کے سر پر ٹھہرا اور پھر وہ بتائی کی بھی طرف دیکھے کمرے اور پھر آگے
 سے ہوتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکلتا چلا گیا۔
 اور اس کے پیچھے پوچھا ہوا رہنما بھی۔

اوجھ کمرے کی دیوار کے ساتھ گلی بیٹھی زری اب بھی ساکت تھی۔
 وہ اس پتھر پر بیٹھ گئی سے اتنی رفتار سے پہلے بھی نہیں نکلا تھا۔
 سڑک پر سائینس کھڑی گاڑی تک پہنچنے پہنچنے کے پیچھے آتے رہنما کا سانس پھول چکا تھا۔
 "خدا یا اس اسپڈ سے چلتے ہو تم مجھے تو آج اندازہ ہوا۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے برابر میں بیٹھے
 معاذ کی سرخ ہونے چہرے کو دیکھا، وہ بالکل خاموش تھا۔
 رہنما انفرنگ سے مسکرایا۔

"کبھی بھی ایسا نہیں لگتا کہ سب سے بڑے گدھے ہم خود ہیں، یہ جانتے ہو مجھے بغیر کہ لوگ اس قاتل بھی ہیں یا
 نہیں، ہم ان کی مدد کے لیے آتا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ جیسے ان سے زیادہ اہم کچھ بھی نہیں ہے؟" گاڑی آگے
 بڑھاتے ہوئے وہ کچھ باؤس سے کہہ گیا۔

"اب یہ زری کی جگہ بھی کوئی لے لو، ابھی تک کسی مسکین اور سیدھی سادی، قسم رسیدہ سی عورت محسوس
 ہوتی تھی اور آج وہ مجھ کو اس کے سارے کام نکل گئے تو اسے ہمارا ذرا بھی لانا پڑا۔"
 "فتح کرو یا را!" معاذ نے ہلکے سے سر کو جنبش دی۔ کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اب تک اپ سیٹ تھا۔

رہنما اس کی حد سے بڑھی ہوئی حساسیت سے پوری طرح آگاہ تھا۔
 "مفید کو بہت زیادہ اہم اہمیت کیا کرو معاذ، اب کیا ضرورت تھی تمہیں زری کی زندگی واری لینے کی؟ کوئی دو چار
 دن کی بات نہیں ہے۔"

"مجھے پتا ہے۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔
 "کہاں رکھو آؤ گے اسے کوئی جگہ ہے ذہن میں؟"
 "وہ ہمارے گھر میں بھی تو رہ سکتی ہے کیا رانی ہے؟" اس نے مرکز رہنما کی طرف دیکھا۔
 "اور تمہارے گھر والے انہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا؟ ایک غیر لڑکی کو لا کر رکھنے پر۔"
 "ہو گا بھی تو میں جواب دے لوں گا۔" معاذ نے ایک گہری سانس لی۔

آج ہوا میں شدت کی کٹ تھی۔
 آسمان گہرے سرمئی غبار میں لپٹا اور شام وقت سے پہلے سیاہی مائل نیلا ہٹ میں ڈوبی ہوئی پڑتی گھاس اس
 کے قدموں کے نیچے اور بھی بے جاں ہوتی تھی۔
 وہ محال سے بے نیاز، سیدھا چل رہا اپنی مخصوص شیخ تک آیا تھا۔
 ساجد وہاں نہیں تھا۔

شاید اسے کچھ نہیں دیر ہوئی تھی۔
 اس نے ہاتھ میں تھامے چند پکٹ پکٹ تھری بن ہوئی شیخ پر رکھے اور خود بھی وہیں بیٹھ رہا۔ سامنے گھاس کا وسیع
 میدان بالکل خالی تھا موسم کی شدت نے لوگوں کو اپنے گھروں تک محدود کیا تھا۔

اس نے گھاس کے میدان سے پرے ڈھکائی دیتے بلند دیوار فلیٹس کی طرف دیکھا۔
 کمرے کے چپے ہوئے دونوں میں یہاں سے ان میں لگے ہوئے کپڑے اور چوڑوں سے بھرے کلمے بھی نظر
 آتے تھے لیکن آج یہ ساری بالکونیاں کمرے میں لٹی ایک سی خاموشی اور دھماکا احساس دلا رہی تھیں۔
 اور اندر کہیں ان سب میں زندگی بھر پور حرارت کے ساتھ رنگ کھینچی ہوئی۔
 گرم گھاس کے گرم جانے کافی۔

واری فوٹس، کمبل، نرم گرم سر سمیت دن بعد وہ کہیں سے کہیں پہنچا۔
 اتنی مدت ہوئی یہ سب اس کی زندگی سے خارج ہوئے وہ ستر جن کا قصوری نیند سے پلکیں بوجھل کر آتا تھا۔
 آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے اس مہمان گرماش کو یاد کیا۔
 "خیام بھائی!" ساجد اس کے ٹھیک سامنے آکر کھڑا ہوا تھا۔

"سو گئے تھے کیا؟" وہ بے تکلفی سے اس کے قریب پہنچا۔ "آج دیر ہو گئی، سڑی کی وجہ سے مال بھی کم ہوا اور
 پھر اس والے نے بھی مسافروں کے انتظار میں بس کھڑی رکھی۔"

اتنی سی بات کرتے ہوئے بھی وہ تین ہارڈک کر کھانا تھا۔ خیام نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔
 "تم لا کر کو کیوں نہیں دکھاتے ہو ساجد! اتنی کھانسی ہو رہی ہے تمہیں، دو مینے تو ہوتی گئے ہوں گے۔"
 "دیکھاؤں گا۔" وہ لاہروالی سے جیب میں رکھے مپے نکال کر کھینچا۔

"یہ لیس نہ آپ کے ہونے۔" چند لال ٹوٹ نکال کر اس نے خیام کے ہاتھ پر رکھے۔
 خیام نے مشکور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پیسے زیادہ نہیں تھے لیکن زندگی سے تائبانے رکھنے میں یہ
 ہی پیسے معاون تھے۔

"یہ بیکٹ اور رکھ لیں، کل وہیں پہنچائے ہیں، رشید کو تو پہچانتے ہیں نا، پیسے انڈوانس میں دے چکا ہے۔ وہ
 اسے ساتھ لائے تھیلے میں سے بیکٹ نکال کر اس نے خیام کو تھما کر آگے بڑھا دیا۔
 "آج جلدی گھریاؤں کا مال بے چاری پریشان ہوئی ہیں سڑی کی وجہ سے، آپ بھی پہلے چائیں۔"

"کہاں؟" خیام نے ہلکے سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔
 "تم جاؤ میری فکر مت کرو۔" خیام نے زری سے کہا۔

گھر میں جیسے مستقل ہی ابر جنسی نافذ ہوئی تھی۔
 کیا گل تو خیر رہتی ہی تقریباً "یہاں تمہیں آج کل مسلمان بھی روزانہ آ رہا تھا۔
 جس دن نہیں آتا اس روز یہاں سے فون پر فون جالتے رہتے سووہ تھملا گری سہی، ابھی جاتا ہوں اور خوب جھگڑتا۔

"جب صبح کیے کہ بار بار فون مت کیا کریں، نوایہ کو برا لگتا ہے تو آپ لوگوں کی کچھ میں کیوں نہیں آتا؟"
 "الگ رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ماں باپ کا حق قسم ہو گیا ہے، ہم جب مل جاچے گا تمہیں بلائیں گے اور
 تمہیں آنا بھی پڑے گا۔"

والدین کی طرف سے جواب دینا کیا گل کی زندگی واری تھی سووہ پوری تیاری کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی، بحث کو
 طول دے رہی تھیں۔
 شامہ دیکھنے کے آکر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

گھاس کے وہاں میں سے کسی کی بھی طرف واری کرنا چھوڑ چکی تھیں۔

”تم نے کسی اور سری اسٹیٹ انجینی والے کو بھی لہا ہے یا بس یہی ایک ہے جواب تک صرف وہ لوگوں کو لایا ہے کہ کھانے کے لیے وقت ہاتھ سے لٹا جا رہا ہے۔“
وہ درحقیقت پریشان تھیں اور انعام صاحب ان سے بھی زیادہ دن ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے تھے اور مسئلہ بچوں کا تھا۔

”اب وہ دن میں تو گھر بکتے سے رہا ہی! اور پھر اس طرح جلدی چلی جس کے تو لوگ اونے پونے داموں پر خریدنا چاہیں گے اپنی کمزوری دوسرے کے ہاتھ میں دینا سب سے بڑی بددعویٰ ہے۔“
سلمان اب کھاتے پیتے آسودہ حال لوگوں کی طرح قلف بھگتا تھا۔

”اس وقت پیسہ ہماری کمزوری نہیں، مجبوری ہے عزت پر مبنی ہوئی ہے، دور قریب کے رشتے داروں میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو اس ضرورت کے وقت مدد کر سکے۔“
شاہرہ چچی کی آواز میں کی گھل رہی تھی ”آج کل اسی طرح بات میں مطلق میں پانی سالا کتے لگتا تھا۔“
سلمان بے فکری سے ہنس رہا۔

”اب کیا کریں خاندان ہی آپ کا آج پھینچ رہا ہے، کوئی بھی تو وحش کا فحش نہیں ہے۔“
”کیوں تم ہو اور تمہاری بیوی بھی تو ہے۔“
آپا گل نے کڑی نگاہ سلمان پر ڈالی۔

”آپ کو تو ہانا ملنا چاہیے، مجھ پر طنز کرنے کا۔ آپ بھی تو مال دار آسانی ہیں اپنی جیب کیوں نہیں ہلکی کر رہیں؟“
”ہمت پیسہ بنا رکھا ہے اکبر بھائی نے۔“

”تو کچھ رہی ہیں ائی! آپ اس کی بدتمیزی۔“ شاہرہ بگم خاموشی ہی رہیں۔
آپا گل اور سلمان دونوں ہی کی خود غرضی ان پر صبح معنی میں اب کھلی تھی، کبھی تو انہیں لگتا تھا جیسے دونوں کو یہاں کے مسائل سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، بس یوں ہی وقت گزار دیتے ہیں۔
”بھو! کمال ہے اتنا بھی خیال نہیں ہے کہ چائے ہی بنائے۔“
آپا گل نے کچھ اکتا کر دھڑکھڑا کر دیکھا اور پھر زور سے پکارا۔

”بھو! اجو! تیسری بار پکارنے بھی نہیں پائی تھیں کہ شاہرہ تیکم نے روک دیا۔“
”وہ ابھی اوپر کئی ہے سارا کھانا پکا کر سر میں دو ہے اس کے بھی صبح سے چائے پینی ہے تو خود بنا دو۔“
آپا گل کو جیسے شاہرہ کا۔

انہیں تو یاد بھی نہیں تھا کہ آخری بار یہاں اس گھر میں انہوں نے کب چائے بھی بنائی تھی شاید شادی سے پہلے ہی، کبھی ایسا ہوا ہو۔

”آپ یوں ہی اسے سرخ حاتی ہیں، جب ہی تو دیکھ لیں، کیسے عین وقت پر شادی سے انکار کیا ہے اس نے؟“
ساری نخواست اسی بات کی بنی ہے ابو پر۔
”کسی بھی بات کا براہ کہیں سے کہیں جوڑ سکتی تھیں، مہیہ ہی کیا۔“

”تو یہ آپ کے چیر کر امت شاہ کچھ کہیں کر رہے ہو یا کے سلسلے میں وہ تو ساری نخواست ختم کر سکتے ہیں ایک چلہ میں گرویں، بھو! کو تیار شادی پر۔“
سلمان کے طنز کو آپا گل نے صبر کے گھونٹ کی طرح جیا۔

”تم لوگ جو بھی سمجھو، لیکن آج پچاس ہزار دسے دیں پیر کرامت شاہ کو یوں چٹکی بجاتے ہی سارے حالات ٹھیک ہو جائیں گے پھر تو ہاں گے۔“

"آپ اور آپ کی جہالت۔ مسلمان نے یہ کسی لحاظ کے مختصر تصور کیا اور ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا۔
 زور سے کہ ساتھ وینس میں گزاری جانے والی زندگی کتنی بھی مختصر آئینہ سنی لیکن اسے اتنا تو اٹھادے ہی چکی
 تھی کہ اب وہ اپنے گھر اور اپنی کاس پر ہنس سکتا تھا۔
 "میں تمہارا بہت لحاظ کر رہی ہوں مسلمان! ورنہ۔"
 "نہ کریں۔" اس کی وہی دل جلاتی مسکراہٹ۔

آپاگل نے بے اختیار ہی مدد کے لیے والدہ کو دیکھا مگر آن وہ بھی لاطلفی سے منہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے
 لگیں۔

"تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے بات کی جائے، ہمیں تو یہ ہی ٹھیکہ رکھتی ہے جو تے کی نوک پر۔"
 جس بات کو گھر میں منہ پر لانے سے پرہیز کر لیا جاتا تھا خاص طور پر مسلمان کے سامنے، آپاگل نے اے غصہ
 کے اس سچائی کو بھی بے نقاب کیا۔

مسلمان کو کیا فرق پڑا تھا؟ وحشیانے سے بنے گیا۔
 تب ہی کسی نے بے تالی سے تیل بھالی اور یکے بعد دیگرے بجاتا ہی چلا گیا۔

"زویا ہوگی دورا بھی میری نہیں ہے۔"
 آپاگل مسلمان کے سامنے سے ہٹنے کے لیے کسی ہانے کی ہی مختصر تھیں سو فوراً ہی خود اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بس کرو گون چھپے لگ گیا ہے جو اتنی بے تالی ہے کاجن ہی سے آ رہی ہو گئی۔"
 انہیں اپنے اندازے کی درستگی کا اتنا یقین تھا کہ دروازہ کھولنے سے پہلے ہی گواہی پھر نشانہ چاہا تھا، دوسری

طرف سے تیزی سے اندر آنے والے اٹھارہ چپا تھے۔
 بیماری کی چھٹی کے بعد کچھ دنوں سے ہی انہوں نے آفس جوائن کیا تھا، جہاں بقول ان کے بچاؤ کے لیے جوڑ

توڑ جاری تھا۔
 اس وقت جس بے تالی سے دروازہ آئے تھے اس سے بری فطری ہی سراپا سگی پھیلی تھی۔

"خیر تو ہے۔" شاکرہ بیگم نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔
 اٹھارہ چپا نے قبر کو نگاہ ان پر ڈالی تھی۔

"یہاں جان پرینی ہے اس بے وقوف عورت کو خیر کی خبر چاہیے مسلمان!"
 وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تم ابھی اس وقت اس امیٹ انجینیئر والے سے ملو اور جو پہلی رقم اس گھر کی مل سکتی ہے اس پر سودا کرو گھر
 کا ایک دن کی بھی گنجائش نہیں ہے میرے پاس سمجھو۔"

"ابھی آج ہی وقت۔"
 لاؤنج میں کھڑے ان تینوں سمجھ دار لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کاش اگر پہلے سے ان حالات کا اندازہ ہو جاتا تو کوڑیوں کے محل بٹکایہ گھر خود ہی کیوں نہ خرید لیتیں۔ آپاگل
 کو بے اختیار آنے والا پہلا خیال یہ ہی تھا۔

"گور تم اور کل دونوں جتنا بھی دے سکتے ہو مولی کر کے دے دو میں سب کا ایک ایک پیسہ لوٹا دوں گا یقین
 کرو۔" انہوں نے بڑی بے چارگی سے مسلمان اور آپاگل کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ لیکن کسی نے بھی ایک پل کے

لیے یقین نہیں کیا۔
 "سوچیں ذرا جب ابھی ابو کوپے اکٹھے کرنے مشکل ہو رہے ہیں تو بعد میں کیا انتظام ہو سکتا ہے؟"

اب وہ اندر اپنے کمرے میں گئے تھے تو مسلمان نے بڑی سمجھ داری سے آپاگل سے کہا تھا۔ "فرض کریں کہ
 ابھی آپاگل کے پاس کوئی بھی رقم نہیں ہے تو کیا یہ اسے اتنا رکھیں گے ان حالات میں۔ ابھی نہیں اور پھر بھگتنا بھی پڑے
 گا۔"

پہلے دن بعد آج آپاگل اس سے متعلق ہوئیں۔
 ٹھیک کہتے ہوئے آپاگل کے پاس تو اسے اٹھانے میں پہنچ کر کام نکال سکتے ہیں، پھر جن دوسرے لوگوں کا نام آیا ہوا ہے

ان کو ان کی مدد بھی تو سب کو ششوں میں لگے ہوئے ہیں اللہ کرے گا تو معاملہ سیدھا ہو ہی جائے گا، لیکن ہمارے
 لیے تو ایک بار گئے سو گئے نہ پلایا، میرا تو خود بچپوں کا ساتھ ہے۔"

لاؤنج میں ہوتی اس مختصر میٹنگ میں ان دونوں بہن بھائی نے ترجیحات بڑی تیزی سے سیٹ کیں اور
 ملحق ہو کر بیٹھے۔

شاکرہ ہر اس بات پر ان دونوں کی شکلیں دیکھ کر گئیں۔
 "آپ کیوں فکر کر رہی ہیں؟ ہو جائے گا سب ٹھیک ہوگی ایسا بھی بڑا مسئلہ نہیں ابو کو تو عادت سے کس۔"

آپاگل کی وہی جاننے والی ٹوٹی پھوٹی سی تسلی پر انہیں خود بھی ایک قصہ بھی یقین نہیں تھا۔ ادھوری ہی رہ
 گئی۔

دروازے پر کسی بو سے بھاری ہاتھ کی بو تک گھر میں رساں سے وہاں تک گونجی تھی۔
 دھڑ دھڑ دھڑ۔

اس کو آواز میں حکم تھا۔
 جرتھا۔

دھشت تھی ان سب نے ہی دل بیٹھتے ہوئے محسوس کیے۔

پہلے برآمدے اور احاطے میں دھوپ بڑی دیر تک رہتی تھی۔
 راوی کو دھوپ میں بیٹھا پائند تھا، اس وقت تک میں بیٹھیں جب تک دھوپ پر آمدے کے آخری کوٹے

تک نہیں پہنچ جاتی، ان کی پسندیدہ کرسی دھوپ کے ساتھ ساتھ سفر کرتی، اور ساتھ میں ان کا اخبار بھی، مگر آج
 اٹھا دوسرے کاروباری اپنا رکھا تھا۔

معاذ کے لئے انتہائی اختلافی مسئلہ پر بحث کے فوراً بعد ہی بحث چھڑ چکی تھی اور اتوار کی چھٹی کی وجہ سے
 پہلا اہل خانہ کی حاضری بھی خیر سے پوری تھی۔

میرے ابھی ابھی دوسری بار چائے بنا کر لائی تھی اور سب کو دینے کے بعد اپنا کپ لیے برآمدے کی میز بیچوں پر
 اٹھ بیٹھی تھی۔

اس ساری بحث میں اس کی رائے کی اہمیت سب سے کم تھی گئی اس بے چارگی کی ایسی خاص سن بھی نہیں
 رہا تھا۔

"ہر حال میری طرف سے صاف انکار ہے، میں کسی جوان لڑکی کی ذمہ داری نہیں لے سکتی اور وہ بھی ایک
 اہل ایمان سہو ہے، اس کے اپنے رشتے دار رکھنے کو تیار نہیں ہیں تو کوئی بات تو ہوئی نا آخر؟" می کپاس ذرا

اسی رعایت نہیں تھی۔
 اعلانے آپاگل کی مانی جھٹلاہٹ پر قابو پایا۔

"آپ سے کون ذمہ داری لینے کو کہہ رہا ہے؟" اتنا برا گھر ہے، وہ بے چاری بھی روئے کی ایک طرف یہ تو سوچیں کہ کتنا بڑا ثواب ہے ایک بے سارا کو سارا بنانا! آپ سمجھا میں نا ہی کو۔"

آخری صوٹ لگا کھڑی ہونا تھا اور چچی بات تو یہ کہ جو دعوے وہ کرنا شروع کر دینا چلی کے سامنے کر کے کیا تھا وہ لہائی کے بھروسے پر تھے۔

"خیر کسی لڑکی کو لانے کی تو میں بھی مخالف ہی ہوں جیسے بھی ہیں، رشتہ وادوں ہی کا فرض ہے کہ اسے سنبھالیں، ہمارے ہاں کس رشتے سے وہ رہ سکتی ہے؟ خاندان والوں کا روز کا آنا جانا ہے، دس سوال کریں گے لوگ۔ اسے دیکھ کر پھر کیا جواب دیں گے اور کون یقین کرے گا اس بات کو تو رہتی ہی ہے۔"

زری کے معانے میں وادی اور امی حیرت انگیز طور پر ایک ہی طرح سوچ رہی تھیں۔

ایک سے دوا ہے ایک سے تحفظات۔

"اور پھر سب سے بڑی بات کہ گھر میں رنجیدہ بھی ہے میں ایک انجان لڑکی کو دن رات اس کے ساتھ نہیں رکھ سکتی، چچی ہری کیسی عادتیں ہوں اس لڑکی کی۔ میں رنجیدہ کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتی۔"

"صحیح کہہ رہی ہے شائستہ! وادی نے عمر بھر لگا ہوں سے امی کی طرف دیکھا رنجیدہ کو معلوم نہیں کیا برا لگا تھا۔"

"اب میں کوئی ایسی بے وقوف بھی نہیں کہ اس طرح کسی سے بھی اثر لے لوں گی میرے پاس بھی اپنی عقل ہے۔"

"شائستہ! آتا اور معاذوں میں ہی بس پڑے۔"

"تم چپ رہو رنجیدہ! ہر بات میں مت بولا کرو میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔"

ایک ایک ہوتے ہوئے کچھ زیادہ تھا ہو گئیں۔

"وادی لڑکی کے گھر میں نہیں آئے گی بات ختم۔" ان کا الجھن تھی تھا۔

معاذ نے بہت غور سے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ ایسا اس لیے کہہ رہی ہیں امی! کیونکہ ہم سب خدا کے فضل سے اس محفوظ، پرسکون ماحول میں رہتے ہیں۔"

اس نے ان کے ساتھ میز چیلوں اور اعلیٰ میں چمکی ہوئی زندگی کی حرارت سے بھی جیسے تصدیق چاہی۔

"تم جو چاہو سمجھو۔"

"آپ بھی سمجھ سکتی تھیں، اگر آپ نے کسی کمزور کو تھائی کے خوف سے روٹے ہوئے دکھا ہوتا کسی کے سر پر ہر طرف سے ٹھکرائے جانے کی ذلت کو بڑے ہوئے دیکھتیں۔" معاذ کی آواز بچی تھی اور دکھ سے بوجھل۔

ایں کا چہرہ سیاہی بے تاثر تھا وہ افسردگی سے مسکرا دیا۔

"زری سے میں نے وعدہ کر لیا ہے امی! سارا اتنا سے دینا ہی پڑے گا اگر آپ کو اس کے انجان ہونے پر اتنا ہی اعتراض ہے تو میں اس سے شادی کر لیتا ہوں، میں جانے گا رشتہ۔"

جس آسانی سے وہ عموماً مسائل کا حل نکال لیتا تھا، اسی طرح سے اس نے اس الجھن کو بھی سلجھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

سب ہی کو جیسے بڑے زور کا دھکا لگا تھا۔ آتا اور رنجیدہ جیسے غیر جانب لوگوں کو بھی۔

"نہا غراب ہو گیا ہے تمہارا بھولنے سے پہلے سوچ بھی لیا کرو۔"

ایں کو مدت بعد اتنی زور کا فضا آیا تھا۔

"میں نے سوچ لیا ہے۔"

انجان کی طرف دیکھے، اس نے مضبوط لمبے میں کھنکھار پھر کسی کی بھی اٹلی بات سے بغیر حیرتہ مول سے برآمد ہوا کرنا ہوا اور جاتے ہوئے گوریڈور کی طرف مڑ گیا۔

وادی تنکے نہ کھولے کو کھینچتی رہ گئیں۔

"مجھے تو پہلے ہی شک ہوا تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے، اب تو ثبوت بھی مل گیا پھنسا لیا ہے اس لڑکی نے اپنے پتکے میں معاذ کو۔"

اس سنجیدگی کے عالم میں بھی چائے کا گھونٹ بھرتی رنجیدہ کو اس طرح ہنسی آئی کہ چند اساکا۔

"کیا پاؤں لاپن ہے بھلا۔"

وادی نے اس کی کمر سلائے ہوئے ٹوکا۔

رنجیدہ ان ہی کے قدموں کے پاس بیٹھی تھی

"ابھی تو مت ہنسی آ رہی ہے اس وقت پتا چلے گا، جب معاذ راہ چلتی لڑکی کو ہم سب کے سروں پر لا کر بٹھائے گا تو دیکھنا وہ کیا شکر کرے گی اس گھر کا۔"

امی کی آنکھوں میں آنسو آتا شروع ہو چکے تھے اور وہ بڑی قطیعت کے ساتھ اگلے منظر کا نقش کھینچ رہی تھیں۔

وادی کے سامنے کسی کے لیے بھی معاذ کو غلط کہنا آسان نہیں ہوتا تھا، مگر اس وقت تو جیسے کچھ کہنے کے لیے بھی نہیں رہا تھا۔

"میں صاف بتا رہی ہوں، معاذ اس لڑکی کو اس گھر میں کسی بھی صورت میں لاسکتا شادی کر رہا ہے تو کیسے اور لاسکتا ہے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔" امی نے ایک گہری سانس لی۔

بات کہاں سے کہاں پہنچی تھی۔

"اب اس بھی کرو؟" آخر کتنی بات برعہانی ہے، "نہ چاہتے ہوئے بھی ہاں کے لمبے میں سختی اتاری تھی۔

امی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"میں بات برعہانی ہوں، اور وہ تو کچھ کہہ کر گیا ہے ایک تو آپ نے خاموشی سے سن لیا۔"

"اس پر تم نے مجبور کیا تھا ورنہ نہ معاذ کا یہ مطلب تھا اور نہ ہی وہ کسی ایسی نیت کے ساتھ اس لڑکی کو لا کر رکھنے کی بات کر رہا تھا ایک سیدھی ساوی بات کو تمہاری بے وقوفی نے پیچیدہ بنا کر رکھ دیا اور کچھ بھی نہیں۔"

آپ کا مجبور نہ مل تھا۔

سب سے زیادہ سکون وادی کو ہوا تھا۔

"معاذ! اسے ایسا نہ ہو۔"

"اب اسے ایسا نہ ہو اور اب کوئی نہیں بولے گا میں خود معاذ سے بات کر لوں گا۔"

وادی نے کھنکھارے ہوئے، "اور وہ لڑکی اس کے رہنے کا بندوبست یا تو لائیں آپ اپنے کمرے میں کریں یا پھر رنجیدہ! اس کے ساتھ ساتھ لے کر لوں گے!"

"کیا!؟" امی نے ان کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ وادی نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"وادی! کمرے میں رہے گی رنجیدہ کے ساتھ رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھی بات ہے" "اُمی دوپٹے سے آنسو صاف کرنے لگیں۔
ساری عمر ایک ہی جگہ رہا تھا کہ ان کی بات کو آسانی سے روک دیا جاتا ہے۔

سو آج بھی یہی ہونے جا رہا تھا۔
"اُمی پلیز!" ریدھ نے دل جوئی کے لیے کچھ کہنا چاہا تھا کہ سامنے ہال میں بیچے ٹیلی فون نے اسے روک دیا
جانے پر مجبور کیا۔
"ضرور کوئی رشتہ دار ہی ہوگا" آج اتوار ہے شاید کوئی آ رہا ہو "دادی بیٹھ مہمانوں کی منتظر رہتی تھیں سو
حالات کی سنگینی کو بھی بھولیں۔

اُمی کے ساتھ پرانی ٹائیس اور بھی گہری ہوئیں تب ہی ریدھ فوراً "ہی واپس آتی ہوئی دکھائی دی۔
"اُمی! اس نے آگے کورٹروں کی طرف جاتے ہوئے اسلام صاحب کی آواز دی۔
اُمی اور دادی دونوں ہی نے کس غیر معمولی بات کافی الغور اندازہ لگایا۔
"اُمی! اظہار پچا کو پولیس اسٹ کر کے لے گئی ہے کل دوپہر کی بات ہے۔"
ان سب نے ہی حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اللہ رحم کرے!" اُمی نے آہستگی سے کہا اور بنا کوئی تبصرے کے معاذ کے کمرے کی طرف چلے گئے
ریدھ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اُمی اور دادی کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔
"اللہ کی قسم! ان کو کڑکھٹا کر لے آئے ہیں" اُمی نے ایک گہری سانس لی۔
آج کا دن یقیناً کچھ الگ تھا۔
شاکیہ۔ اپنی نگاہ سے انھیں اور تیزی سے ان لوگوں کے پاس سے گزرتی ہوئی چلی گئیں۔

نیچے چھیل بنگلہ کے برکس اور سخت منانا چھایا تھا۔
جوانے کمرے کے اوپر کھلے دروازے میں سے جھانک کر دیکھتے تھے اسے آواز دی۔
"زویا!"

"زویا! تم ابھی تک یہیں ہو۔" وہ اسے تیسری بار بلانے آئی تھی "نیچے سے کتنی بار پٹاگل کی پچیاں آپکی ہیں
'جا کر کچھ تولو۔"

بیڈ کے کنارے پر بیٹھے ہوئے زویا نرم سے لمبے میں اصرار کیے مگر وہ اپنی جگہ سے ہلے نہ گئیں۔
"میں نہیں جاؤں گی میں انھیں منع کر چکی ہوں پچھو کیوں بلارہی ہیں بار بار!"
"اسنے لوگ آج بارے ہیں" چائے وغیرہ کو نہ بناے گا" مجھے وہ منع کرتی ہیں کہ کسی کے سامنے نہ آؤں ورنہ میں
جا کر بناؤں گی پلیز چلی جاؤ تا تم۔"

زویا نے دھیرے سے اس کی طرف کروشلی۔
"اسنے لوگ کسی خوشی کے موقع پر نہیں آ رہے ہیں جو یا یہ سب ہمارے ہاں افسوس کرنے آ رہے ہیں"
ہمارے باپ کے جیل جانے پر بد عنوانی کے الزام میں۔
اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی اور کمرے میں پھیلی ہلکی سی روشنی میں بھی اس کی آنکھوں پر کیاورم اور

ساری باتیں اور ہی تھیں۔
"مہربانیت کے لیے آنے والوں کی خاطر مدارات نہیں کی جاتی" پٹاگل کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی ہے یہ
بات۔

اس کی آواز بہت سنی تھی۔
ہو یا ہے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

زویا کی حالت واقعی اس قابل نہیں تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے جائے پچھلے دو دنوں سے وہ مستقل اوپر ہی تھی
اور کسی صورت لوگوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔
"میں تو اب کل بجے بھی نہیں جاسکتی ہوں ہوا لوگ کن نظموں سے مجھے دیکھیں گے" میری فریڈ زکلا اس فیلوز
سبھی کو اب تک چاہل ہی کیا ہو گا!"

"وہ اس سے کیا یقین دہانی چاہ رہی ہے؟" ہونا نے نگاہیں جھکائے ہوئے سوچا۔
"وہ یہ رشتہ دار جو نیچے آکر بیٹھے ہیں یہاں سے نکلتے ہی ہم پر ہستے ہوں گے عزام کی کمانی پر توبہ کرتے
ہوئے واپس جاتے ہوں گے سب پر ہماری قطعی کمانی۔"
وہ مستقل بول رہی تھی اس کا ذہن دباؤ کا شکار تھا ہونا کو اسے تو کنا پڑا۔

"ابھی نئی نئی بات ہے زویا! اس لیے شاید سب ہی حساس ہو رہے ہیں کچھ دن گزر رہے گے تو بات پرانی
ہو جائے گی ٹوگ بھی بھول بھال جائیں گے" آج کل یہ سب عام سی باتیں ہیں یہاں پر انتقامت لو۔"
ایسے کے الفاظ اسے خود بھی یقین نہیں تھا لیکن زویا کی تسلی کے لیے کہتا پڑا۔
زویا کتنی سے مسکرا دی۔

لوگوں کی یادداشت دوسرے کے یہاں کے بارے میں ہوتی ہے جو اب واجب ہمارے گھر والے معاذ
بھائی کے ان بیویوں کی تحسیر کرتے ہوئے نہیں دوسرے جوان بے چاروں میں تھے بھی نہیں تو چاراب ہم کیسے بچتے
جاسکتے ہیں؟

ہونا کامل بہت زور سے دھڑکا۔
گھر میں معاذ کا نام بہت سن دیا گیا تھا۔

"معاذ بھائی نے ضرور بد دعا دی ہوگی" ریا اُدھ تم سے بہت محبت کرتے ہیں "ان سب نے بڑا ظلم کرایا ہے تمہیں
ان سے جدا کر کے کسی کا صبر بھی بڑھتا ہے۔"

اس نے کتنی سے چھپا ہونٹ ڈانڈے کے نیچے دباتے ہوئے اندر سے اٹھنے والے شور کو روکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
کوئی نیچے سے اور آ رہا تھا۔

"معاذ! میں ہوں ہوں۔" زویا نے پھرتی سے کھل خود پر لیا اور غائب۔
کوئی اور وقت ہو۔ وہ ضرور ہی اس حرکت پر ہستی۔

اس بار کوئی اور۔ اس خود پٹاگل ہی تھیں۔ ہونا کا خیال تھا کہ وہ زویا کے اب تک نہ آنے پر خیر لینے آئی ہیں
انہیں ایسا نہیں تھا۔

اللہ! اسے محض ایک نظر کھل میں غائب زویا کی طرف ڈالی "اور مجھے مجھے انداز میں بیڈ کے قریب پڑے
صوفے پر لیٹ گئیں ہونا ان کے ہاتھ کے اشارے پر واپس بیڈ پر بیٹھی تھی۔

آج میں سالہ سال کا ہو گیا۔

زندگی ہے اسے تو میری ہر خوشی اور پریشانی میں میرا ساتھ بھٹاتا ہے مگر کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اسے میری ذات سے کوئی دلچسپی پائی نہیں رہی وہ پہلے کی طرح میری تمام ضروریات کا خیال رکھتی ہے بہم ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں مگر میں اس کی طرف کھڑے کر کے ہاتھ پھیلاؤں تو وہ اب بھی اپنا سر میرے پھیلے ہوئے بازو پر رکھ دیتی ہے خاندان کی خوشیوں اور رنج میں ہم ایک ساتھ شرکت کرتے ہیں مگر پھر بھی کوئی دیواری ہمارے درمیان حائل ہوئی ہے شاید اللہ نے ہمیں اتنا کچھ دے دیا ہے کہ اب ہمیں ایک

بہن اب میں سینئر سینیئر بن چکا ہوں اگر کسی اور ملک میں ہو تو بہت سی مراعات کا حق دار بن چکا ہوتا مگر اس وقت میں ان باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو ہمارے ہاؤس کے میں سالہ سال کا ہو گیا۔ میرے تینوں بچوں نے گھریلو کام پر میری سالگرہ منائی میں نے ایک کانا تو انہوں نے بھی برتنہ ڈسے گا کہ ایک دوسرے کو ایک کھلایا۔

بہن یہی ہوئی ابھی ہی مسکراہٹ لیوں پر بھاسے اس پھولنی سی القریب میں شریک رہی آخر وہ میری شریک

شریالانچ

یاد دلانہ شریالانچ



”جیسا کہ تو دنیا کو نہیں اٹھایا وہ سب تو پہلے بھی گئے۔“
”کیوں؟“ جو اپنے حیرت سے کیا گل کی طرف دیکھا۔

قریب دور کے یہ سارے رشتے دار گھر میں مستقل آنے والوں میں تھے جنہیں کھانا کھلائے بغیر بھی جانے نہیں دیا جاتا تھا۔

”کیوں کیا؟“ اٹھا دیکھنے آئے تھے عموں کھانا اور گئے انداز ایسا تھا جیسے گناہ کاروں کے حال سے عبرت پکڑ رہے ہوں ساری عمر یہاں کھاتے رہے اور اب جانے کو بھی پوچھا تو ایسے جلدی سے منع کر دیا جیسے زہرا کا ہوا دوس کے بہن۔“

وہ سخت جذباتی ہو رہی تھیں۔ جو انھیں نگاہ جھکا کر رہ گئی۔

”اور وہ ناظم آباد والی صفین خالہ۔“ انہوں نے تو بانی بھی پناہ گوارہ نہیں کیا ہمارے گھر کا کہنے لگیں میں تو بس انکسار کی خیریت معلوم کرنے نئی تھی۔ ذرا اڑک کر انہوں نے سر کو بے زاری سے جھکا۔

”میں نے بھی سب سے ایک ہی بات کہی کہ کسی نے دشمنی میں آپا کا نام لے دیا ہے چند دن میں آجائیں گے خیریت کے ساتھ۔ سب کے منہ اتر گئے سمجھ رہے تھے جیسے اب کو اب عمر قید سے کم کیا ہوئی ہے گو منہ آ“
”ابو واقعی آجائیں گے کیا کیا گل؟“

”ہاں! انہوں نے ایک گھری سانس لی۔“ مسلمان نے بات کر لی ہے وکیل سے چند دنوں میں ساری رقم جمع کروائی ہے کورٹ میں پھر ضمانت تو ہو ہی جائے گی کیس تو سوالوں چلتے ہیں یہ بھی چننا رہے گا۔“

جوا کی سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہیں۔
”مگر یہ کہاں سے آئیں گے کیا ابھی پھولنی موٹی رقم تو ڈیڑی ہے۔“

”اس کا بھی انتظام ہو گیا ہے مسلمان کے اسٹیٹ انجینئر والے نے گھر کا کابڈ بھونڈ لیا ہے دس بارہ لاکھ کم تو دے گا لیکن ابھی رقم دینے والی پارٹی ہے رعایت تو دینی پڑے گی نا!“

جوا کے لب جلد سے کھلے اور پھر ہٹا کچھ کہے بند ہوئے۔ گھر کے بچنے کی باتیں اتنے دن سے ہو رہی تھیں۔ لیکن آج جب واقعی یکدم ہاتھ پھول پر عجیب بے سرو سامانی کا سا احساس چھایا تھا۔

آٹھ کھل کر بھی گھر دیکھا تھا یہی دوسروں پر۔ یہی سارا ماحول۔

”میں اس وقت یہی کہنے نئی تھی کہ اب تم دو دنوں ہمت کر کے پکینگ کرو سارا فالتو فرنیچر تو بیچنا ہی پڑے گا“
مسلمان نے دو کمروں کا پورشن دیکھا ہے تم لوگوں کے لیے دو گلی جھوڑ کر ہے آج مسلمان وہاں کہاں نہائے گا ظاہر ہے اور پھر تم لوگوں کو ضرورت بھی نہیں ہے۔“

کیا گل نے بوائے کی اگلی قسط جاری کی کیبل میں منہ دے رہی تھی دنیا کے جو میں بے نام سی جنس ہوئی۔

کمرے میں اتری مدھم روشنی اور بھی ماند پڑی اور جوا نے پوری آنکھیں کھولتے ہوئے کیا گل کے بدلے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

باقی آئندہ شمار ہیں

دوسرے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

دونوں بیٹیاں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر جاب کر رہا ہے اور ہم نے اس کی اور اپنی مشترکہ پسند سے اس کی معنی بہت اچھے خاندان کی لڑکی سے کر دی ہے اور جلد ہی شادی بھی کر کے اس آخری فرض سے سکدوش ہو جائیں گے۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی دو الگ الگ دنیاؤں میں جا رہے ہیں۔

اس نے تو اپنی ساری توجہ دین کی طرف لگلی ہے نماز، تلاوت، دینی کتب کا مطالعہ اور بیٹے میں کم از کم ایک بار کسی مذہبی محفل میں شرکت۔ مگر میں اب تک دنیا کی رنگینیوں کو نظر انداز کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پید کر سکا۔ شاید زیادہ تر موابیہ ہی ہوتے ہیں اور کچھ نہیں تو جوانی کی خوش رنگ یادوں ہی سے ڈھلتی، عمر کے بے کیف لمحوں میں رنگ بھر لیتے ہیں۔ مگر میری جوانی کی یادیں تو اکثر مجھے لپکی یادیں و حسرت بھری دنیا میں لے جاتی ہیں۔ جہاں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنے آپ کو تکی دست دہی دیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کراچی میں شادی ہل نئے نئے تھے اور گھر کے سامنے شامیانہ لگا کر شادی یا اور کوئی تقریب کرنے کا رواج ابھی کلی طور پر ختم نہیں ہوا تھا۔ لوگ شادی ہل کو کلب کہتے تھے اور ایسی شادی میں شرکت کرنا پادشہ فخر سمجھتے تھے جس کا اعتقاد شامیانے کی بجائے دوستیوں سے جنگلے شادی ہل میں ہوتا۔ ایسی ہی ایک شادی میں ہماری فیملی نے بھی شرکت کی تھی۔

وہ سب کی دعوت تھی اور گیارہ بجتے سے پہلے سب کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے مگر خواتین گھر بچوں اور شوہروں کو بھول کر باقیوں میں، مشغول تھیں۔ میرے

بڑے بہنوئی نے مجھے پاس بلا کر آؤر دیا کہ میں ذرا خواتین کے حصے میں جا کر ان کی تنگدستی صنفی بانی کو یاد دلاؤں کہ گھر بھی دایس جانتا ہے۔ میں ذرا ہنسنے لگا ہوا خواتین کے پورشن کی طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ صنفی بانی تو نظر میں آئیں البتہ وہ نظر آئی۔

وہ بہت خوب صورت تھی اور اس کے بال بہت لمبے تھے۔ میں تنگی باندھے اسے دیکھ کر ہار ہا تھا کہ کسی نے میرا بازو پکڑ کر کہا: "میں گھر آکر بیٹا تو صنفی بانی شعلہ بارنگا ہوں سے مجھے غور رہی تھیں۔" کیا وہ رہا ہے یہ؟

"پانی پوہ لڑکی... میں گھبراہٹ میں ابھی کہہ رہا۔" "کون سی لڑکی؟" صنفی بانی نے مجھ سے میرا ہاتھ نیچے کیا جس سے میں اس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ "تمہیں کچھ عقل ہے؟" اسے پوہ تو فوں کی طرح کسی لڑکی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ "جائو جا رہے۔ میں بھی بس آ رہی ہوں۔"

شرمندگی سے پانی پانی ہونا کہتے ہیں یہ بھی مجھے اسی دن بتایا۔

میں نے اسے اس کا نام لیا اور ایک نیک میں نئی نئی نوکری ہوئی تھی۔ کچھ تو وہ نہ داند بھی آج سہا نہیں تھا اور کچھ میں بھی طبیعتاً ساہو مزاج تھا۔ لہذا اگلے برس اور خاندان سے نوکری کی تک میں نے کبھی کسی لڑکی کی طرف ایسی دیکھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا اور اس رات بھی وہ تو اچانک نظر نہ لگی تو اس کا خوب صورت چہرہ اور روشنی زلفیں مجھے کچھ لمحوں کے لیے محصور کر گئی تھیں۔ اس کے بعد تو خیال بھی نہیں آیا، مگر پھر تقریباً "میرزا" دو ماہ بعد ایک شام جب میں بینک سے واپس آیا تو گھر والوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ صنفی بانی نے آگے بڑھ کر گلے لگایا تو میں نے حیران ہو کر لال کی طرف دیکھا۔ کیونکہ صنفی بانی نے ساری زندگی سوائے ڈانٹ ڈپٹ کے کبھی پیار سے بات نہیں کی تھی۔ نہ کہ گلے لگاتا۔

"مبارک ہو" ہم نے ہمارا رشتہ طے کر دیا ہے۔ "میرزا کے چاند شادی ہے ان شاء اللہ اور پتا ہے تمہارا

رشتہ کس کے ساتھ طے پایا ہے۔" الگ الگ شادی طے پانے کی اطلاع اور پھر صنفی بانی کا وہ خوشی سے بے حال ہونا۔ یہ دونوں باتیں میرے لیے اس قدر اچھے کی تھیں کہ میں کچھ بال ہی نہیں رک۔

"ہم نے تمہاری شادی تانہ سے طے کر دی ہے" اسے یہی وہی لڑکی تھی۔ کچھ کر تمہارے حواس کم ہو گئے تھے اور تم ہو نقول کی طرح اسے دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ "اس موقع پر بھی جو بقول ان کے خوشی کا تھا" ان کے پاس میرے لیے اتنے الفاظ نہیں تھے۔ ملائکہ اب میں کوئی بچہ نہیں تھا کہ وہ جب چاہیں مجھے بل بھر میں بے عزت کر دیں مگر عمر میں کافی بڑی ہونے کی وجہ سے وہ اب تک مجھے بچہ ہی سمجھتی تھیں۔ چونکہ میرے لیے ناقابل پروا تھا۔ لہذا اس وقت بھی میرا مزہ خراب ہو گیا اور وہ بے بھی مجھے تو اب اس لڑکی کی شکل بھی ٹھیک سے یاد نہیں آ رہی تھی کہ میں اس سے اپنی شادی کا سن کر خوشی سے پاگل ہو جاؤں۔

شادی کی تیاریاں تو گھر میں ہو رہی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ جس بات کا چرچا تھا، وہ یہ کہ شادی کی ہونے والی دن بے انتہا خوب صورت ہے۔ اس کی خوب صورتی کی جس انداز میں مثالیں دی جاتی تھیں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اپنی خوش نصیبی پر پھولے نہ سانا۔ مگر میں کیوں اس سارے معاملے میں میرا رد عمل برائے نام مل رہا تھا یعنی یہ کہ شادی تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھی تو اب اگر ہو رہی تھی اور اسی خوب صورت لڑکی سے ہو رہی تھی کہ جس پر ایک نظر ڈال کر میں نظروں سے اٹھتا ہوں۔ کیوں کیا تھا تو اس میں بھلا کیا کون سی چیز موقوفی بات تھی۔

وہ اصل زندگی کے ہر مرحلے پر میں اسی طرح تار مل رہا تھا۔ چاہے وہ اسکول، کالج سے لے کر نوکری میں، ملازمتی دنیا میں یا گھر میں یا جس ملٹی نیشنل ادارے میں مجھے پورا یقین تھا کہ با آسانی جاب مل جائے گی۔ وہاں پر رہ چکے ہوئے اور اب بقول صنفی بانی کو اپنی لڑکی کی لڑکی سے شادی ہونا ایسے قلم

معلومات میں نہ میں کبھی زیادہ خوش ہوا، نہ ہی رنجیدہ۔ شاید اسی لیے میرے دوست مجھے "طفس" کہتے تھے۔

"میرا احسان ساری زندگی یاد رکھنا" میں نے کیسے اسی رات تانہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور کیسے جھٹ پٹ تمہاری شادی کروادی۔" مجھے میرے کمرے کے اندر دو چھلکتے ہوئے صنفی بانی احسان جتنا نہیں بھولی تھیں۔

احسان تو واقعی انہوں نے مجھ پر کیا تھا۔ تانہ جیسا چکاوندہ کر دینے والا حسن کم کم ہی نظر آتا ہے اور پھر اس کی شرمیلی اواہیں اس رات مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں واقعتاً "خوش قسمت" ہوں۔ شکل و صورت اور قد و قامت میں میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ تعلیم اور معاشی حیثیت بھی انہوں سے اچھی تھی اور اب نئی زندگی کے آغاز کے لیے اللہ نے ایسا ہم سفر عطا کر دیا تھا جسے دیکھ کر اور جس سے مل کر انہوں نے کیا ہر ہول میں جاگ سکتی تھی اور مجھے تو وہ دن ماننے ہی مل چکی تھی تو مجھے بجا طور پر اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہ سب سوچتے وقت مجھے قطعاً "اندازہ" نہیں تھا کہ اپنے آپ پر رنگ اور آنے والی زندگی کے بارے میں خوش گمانی کسی چند گھنٹوں کے لیے ہی تھی۔ پھر اس کے بعد تو ایک مستقل بے کلی میرا نصیب بننے والی تھی۔

ان دنوں مسئلے مسئلے بار لڑ میں دلچسپی نہیں سجاتی جاتی تھیں۔ بس گھر کی خواتین مل جل کر دوسروں کو اپنے اپنے ذوق کے مطابق سنوار دیتی تھیں۔ تانہ کا حسن تو بغیر کسی تگھار کے اس قدر عمل تھا کہ مزید کسی مصنوعی چیز کی ضرورت ہی نہیں تھی اور دلچسپی کی دلچسپی کے لیے تو یوں بھی کمائی جاتا ہے کہ اس پر الگ ہی تگھار ہوتا ہے۔ آگے رنگ میں وہ حقیقتاً "انار کی نازک کلی لگ رہی تھی۔ میں اپنی عادت اور مزاج کے خلاف بہت خوش تھا اور مہمانوں کی تو صنفی نظروں اور تعریفی جملوں کو بھر پور طریقے سے انجوائے کر رہا تھا

کہ اچانک ایسا کیسے شعلہ سا لگا ہو۔

”کیا معاملہ ہے دماغی؟“ خرم گرم ہاتھ سے میرے گال پر چٹکی لے کر پوچھا ”اس انتظار سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے تگھنی پر میں نے سٹپا کر مخاطب کی طرف دیکھا۔ بھوری آنکھوں میں مٹی خیزی شرارت لیے وہ خاتون تھوڑا سا میری طرف جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے لباس سے انھنی و لفریب منک اور بے تگھنی کا انداز“ میں نے کچھ بولنا کھاتے ہوئے تاندرو کی طرف دیکھا۔ ”بڑی بھابی ہیں۔“ اس نے دھیرے سے تعارف کروایا۔ تب تک وہ میرے برابر میں بیٹھ چکی تھیں۔ تھری سیٹر صوفے پر تین آدمی بیٹھ تو جاتے ہیں مگر ذرا مشکل سے۔ یا پھر مجھے ہی اس وقت ایسا محسوس ہوا۔ اس لیے میں نے تھوڑا دور ہونے کی کوشش کی۔

”کیا بات ہے؟“ ڈر گئے؟“ ٹھنک دار ہنس کے ساتھ سوال کیا گیا۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اب ذرا غور سے اس چہرے کی طرف دیکھا جو بہت خوب صورت نہ ہونے کے باوجود ایک ایسی کشش لیے ہوئے تھا کہ ہولی فیکر کے بعد دوسری بار دیکھنے کی خواہش بے چین کر دے۔ کچھ تھماتھا ہوا سا گندمی رنگ، بڑی بڑی بھوری آنکھیں جن میں ایک خاص چمک تھی بھرے بھرے لبوں کے درمیان کسی قدر ابھرے ہوئے چلیے دانت جو بے باک مسکراہٹ کو کچھ اور پُرکشش بنا رہے تھے۔ وہ بے تگھنی سے میرے ساتھ گئی تھی۔ کبھی تاندرو کے گلن میں کوئی سرکشی کرتی اور کبھی مہمانوں پر ہنسوا کرتی، وہ مجھے جیسے ہی بے چین کر دیتے والی کیفیت میں جھکا کر رہی تھی اور کچھ دیر بعد جب وہ اٹھ کر چلی گئی تب بھی میری نظریں مستقل اس گداز سرائے کا چھانک رہی رہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ صرف میں ہی نہیں وہاں تھی اور بھی تھے جو اس کی شخصیت کے عرص میں گرفتار تھے، ”میرا عمر مر مر“ تو عمر لڑکے بار بار خواتین کے حصے میں آکر صرف اس ہی سے بات کرتے اور وہ بھی سنجیدگی سے ساتھ

اور کبھی ہنس ہنس کر اس انداز میں جواب دیتی جیسے اسے اپنی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو۔ میں نے سن رکھا تھا کہ بعض عورتیں ایسے بھلے سروں کی عقل خط کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اپنی شادی کے اگلے ہی دن اپنی نئی ٹوپی اور حسین ترین لباس کے پہلو میں بیٹھ کر جس طرح میری نظریں اس کے تعاقب میں بھٹک رہی تھیں، اس سے مجھے اس کی سنائی بات کی حقیقت کا اندازہ ہی شدت سے ہو رہا تھا، واقعی میری عقل خیز ہو گئی تھی کہ زندگی کے ان خاص لمحوں میں جب پوری عقل کی توجہ میری جانب تھی میں سارے ماحول سے بے گانہ ہو کر ایک ایسی عورت کے لیے جو تا صرف عمر میں مجھ سے کچھ بڑی تھی بلکہ میری بیوی کے بڑے بھائی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے میرے لیے واجب الاحرام بھی تھی، یوں بے قرار ہوا جا رہا تھا مجھے کسی بات کا احساس نہ تھا، میرا سارا وجود آنکھ بن کر اس پُرکشش سراپے کو اپنے اندر سمولینے کو بے قرار ہوا جا رہا تھا۔ رات گئے اپنے بچوں سے بے خبر اور خوشبوؤں سے مائلے کمرے میں خرم گداز سرائے پر جیت بیٹھا میں اپنی کیفیت پر حیران ہو رہا تھا۔ تاندرو سوچتی تھی، ”میرے تاندرو میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ابھی تو میں زندگی کے خوب صورت ترین رنگ سے آشنا ہوا تھا۔“ ابھی تو میں ایک نئے اور عمر بھر کے رشتے میں بندھا تھا، اور میں نے اس نئے رنگ، اس نئے رشتے کو صحیح طور پر سمجھا بھی نہیں تھا تو یہ پھر کیا طلسم تھا جو مجھے حقیقت کی دنیا سے دور لے جا رہا تھا، مجھے صبح اور غلط کا فرق بھلائے دے رہا تھا۔ ٹیٹ بلب کی مدھم سی روشنی میں میں نے نئی بارلیٹ کر اپنے پہلو میں سولی ہوئی تاندرو کی طرف دیکھا، بلاشبہ وہ حسن میں بیلا تھی، اس کی دراز چلیں، روشنی زلفیں، دھیمی رنگت اور نازک سرال اس ہمہ نازیک ماحول میں بھی نمایاں تھا۔ مگر میرے دل میں کوئی اور ہی خواہش کروٹیں لے رہی تھی، کوئی بالکل نئی اور انجلی سی کشش مجھے کسی

اور طرف کھینچ رہی تھی، بھوری آنکھیں گداز لبوں کی مسکراہٹ اور بات کرنے کا وہ انداز جیسے مخاطب کو اپنی بات میں ذرا کر لینے کا یقین ہو۔ میری زندگی اب تک ایک سیدھی پختہ سڑک کی طرح تھی، جس میں نہ کوئی اونچ نیچ تھی نہ کوئی دو راہ۔ اور اب اچانک میری تقدیر مجھے بھٹکا کر نہ ہلانے لگی۔ لے جا رہی تھی۔

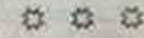
شادی کے نئے سرور گئے۔ رشتے داروں کے گھروں میں ہونے والی دعوتیں بھی ختم ہو گئیں۔ تاندرو کا ساتھ ہر لحاظ سے خوش کن تھا، مگر ایک خلقت تھی جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہر وقت بے چین رہتی تھی اور یہ بے چینی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی، جب میں تاندرو کے ساتھ اس کے گھر جاتا۔ وہ وہاں کیوں کی آنکھوں میں تھی۔ انداز مجھے سرال میں بھر پور زندگی ملتی اور خاص طور سے ”والہامی۔“ دماغی۔ کہہ کر جب اس کی بڑی بھابی اپنی بھوری آنکھیں میری آنکھوں میں ڈول کر مسکراتے ہوئے میری طرف کوئی چیز برساتی تو میرا دل چاہتا کہ میں اس کا پڑھا ہوا ہاتھ تمام لوں، یہ خیال ہی میرے وجود میں ایک سنسنی سی پھیلا دیتا، مگر وہ سرے ہی یں میں اپنے آپ پر نظرین کرتا۔ آخر ایسا کیا تھا شینہ میں کہ جس کے لیے اپنے گھر کا ماحول اور اس گھر سے ملنے والی تربیت اور اخلاقیات کے سارے سبق بھولنے لگا تھا، مگر وہ کہتے ہیں کہ جیسے تلی ایک ہاتھ سے نہیں جکتی اسی طرح آنکھ بھری بھی اکیلے چلنے کا مکمل نہیں توجہ حاصل میری شادی کے اگلے روز ان سنت مہمانوں اور ان ٹوپی دامن کی موجودگی میں شروع ہوا تھا اس میں میں ایسا نہیں تھا اس کی آنکھیں اس کی مسکراہٹیں، اس کا بے تگھنی سے میرے کانہ مجھے پر ہاتھ رکھنا، کبھی میرے بالکل قریب آکر کچھ کہنا، مجھے احساس دلانے کے لیے کافی تھا کہ وہ بھی مجھ میں اسی انداز سے دھیمی

لے رہی ہے۔ تاندرو جب بھی نیکنے جانے کے لیے کشتی میں فوراً تیار ہو جاتا، گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور آنے جانے کے لیے ملنے والی یہ آزادی شاید تاندرو کی خوشی کے لیے بہت کافی تھی۔ وہ یوں بھی بہت گھریلو لڑکی تھی نہ اسے اپنی بے تحاشا خوب صورتی کا احساس تھا، نہ ہی میری طرف سے توجہ کی کمی کا لگتا۔ وہ تو اس اسی بات کو اپنی خوش نصیبی سمجھتی تھی کہ اسے مجھ جیسا خوش رو اور خوش قامت مرد اس کا شوہر ہے۔ سرال میں سب اس کے گرد بیٹھے اور میری اچھی آمدنی کی وجہ سے اس کی خواہشات کی تکمیل بھی بغیر کسی رکاوٹ کے ہو جاتی تھی۔ ایک تاندرو ہی نہیں اس کے گھر میں سب ہی بہت سادہ طبیعت کے تھے، اس کے دونوں بھائی حالانکہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے مگر انداز و اطوار میں ذرا بھی تکبر ظاہر نہیں ہوا تھا، وہی حال وہ اپنی بات سے زیادہ دوسرے کی بات توجہ سے سنتا اور خاطر مدارات میں سمجھتا۔ کچھ جانتا۔ تاندرو کی اپنی میری سانس بھی بس خاموش جیسی مسکراتی رہتی تھیں، ان کی آنکھوں سے میرے لیے ایسی محبت چمکتی تھی کہ میں اپنے آپ میں شرمندہ ہو جاتا، مگر اس دل کا کیا کرتاجو ایک بالکل غلط وقت پر بالکل غلط جگہ آکر میرے اختیار سے باہر ہو گیا تھا۔ انسان جب بھی کوئی غلط کام کرتا ہے چاہے وہ بے وقافتی ہو یا بے ایمانی، اس کے لیے اس کے پاس بیٹھ کوئی نہ کوئی ترازو ہوتا ہے مگر ترازو سونچنے کے باوجود مجھے کوئی ایسا نکتہ نہیں مل سکا جس کی بنیاد میں اپنی عزت اور آنے والی زندگی کی خوشیوں کو داؤ پر لگانے پر اتنا ہوا جا رہا تھا۔ بے شک وہ ایک پُرکشش عورت تھی، مگر میں نے اس سے پہلے بہت سی پُرکشش عورتیں دیکھی ہوں گی، مگر تو میں تھا کہ اس سے پہلے میں آنکھیں بند کر کے جی رہا تھا، مگر شاید وہ عورتیں شینہ کی طرح بے تگھنی اور خود اعتمادی کا مظاہرہ نہیں کرتی تھیں، شاید یہی ایک خلی تھی جو مجھے متناطیس کی طرح اس کی طرف کھینچنے کے لیے جاری تھی مگر ایک

سوال کا مکمل سا جواب ملتا تو وہ سرا سوال ذہن کو اٹھا دیتا کہ آخر وہ کیوں ایک گھریلو عورت ہو کر مجھے اس انداز سے چھیڑ کر رہی تھی، جیسے مجھے ہر اکرا سے اپنی ذات کے حوالے سے کسی تعین دہانی کا احساس کئے والا ہو یا پھر میرے پہلی ملاقات کے روز عمل کی وجہ سے وہ مجھے کسی آزمائش میں ڈالنا چاہ رہی تھی کہ میں اس کھیل میں کمال تک جا سکتا ہوں۔

پہلے دن ہی اسے دیکھنے کے بعد میرے چہرے کے جو تاثرات ہوئے ہوں گے وہ کوئی اور مجھے نہ سمجھے ایک عورت ہونے کی حیثیت سے وہ تو جان ہی تھی ہوگی اور شاید وہ میری اسی کیفیت سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ مجھے مزید آزمائشوں میں ڈال رہی تھی۔

شاید یہ۔ شاید وہ۔ میری سوچ کی دور و ریشم کی طرح الجھتی جا رہی تھی۔



تائبندہ کی دونوں سے سستی ہو رہی تھی مصنفہ بانی کی حیرت انگیز قور۔ چلتے تو چھٹاپ کر گئیں۔
"آخر تم میں کب احساس زندہ داری پیدا ہو گا؟" میرے گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

"کیوں اب میں نے کیا کر دیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا تو انہوں نے ایک معنی خیز نظر تائبندہ کے مرہٹے ہوئے چہرے پر ڈالی اور پھر مسکرا کر کہیں۔
"بھئی اپنی بیوی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ، تاکہ ہمیں کوئی خوش خبری سننے کو ملے۔"

میں نے پلٹ کر تائبندہ کی طرف دیکھا، وہ بھی نظریں نیچی کیے ہوئے شرمیلے انداز میں مسکرا رہی تھی بات ذرا دیر سے کسی ہنر مند سمجھ میں آئی تو میرا دل چاہا کہ خوشی سے مٹتے لگوں مگر مصنفہ بانی کی دانت سننے کا حوصلہ نہیں تھا، لہذا سر جھکا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

تائبندہ کے نازک سے وجود کی وجہ سے ڈاکٹر نے

اسے زیادہ چلنے پھرنے اور کام کاج سے منع کیا تھا۔ میں وقتی طور پر یہ سب کچھ بھلا کر اس کی ناز برداریوں میں لگ گیا۔ ویسے بھی ڈاکٹر کی ہدایت کی وجہ سے تائبندہ نے گھر سے نکلتا تقریباً "بندی" کر دیا تھا اور کئی برسوں سے شہینہ سے سامنا نہ ہونے کی وجہ سے میں اسے بھولا ہوا تھا مگر جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی خوشی بہت کم عرصے میں ایک عام سی بات بن جاتی ہے۔ لہذا تائبندہ کی یہ ہنگامی بھی میرے لیے چند ہی دنوں بعد ایک معمول کا واقعہ بن کر رہ گئی اور میں دوبارہ اس پر غور و فکر نہ کر رہا تھا۔
"مگر منسلک کائناتیں نہیں ملتی۔ تائبندہ کا میکے جانا بہت کم ہو گیا تھا مگر بڑی بھونج ہونے کے باوجود شہینہ خود اکثر اس کی خبر گیری کے لیے آنے لگی تھی۔

اس کی شوخ چلبلی ادائیں شاید اہل کو اتنی پسند نہیں تھیں مگر مصنفہ بانی تو اس کی گرویدہ ہو کر رہ گئی تھیں۔

"کیسی خوش مزاج ہے، مل بھر میں داخل ہی بدل کر رکھ دیتی ہے، ورنہ شہینہ کے سوال میں تو سب منہ سے پتھر پھینک دیتے ہیں، مسکراتے ہیں بھی اس قدر کفایت برتی جاتی ہے کہ دانت نہ نظر آئے میں پتا نہیں بے جا رہی ایسے گھر میں کیسے گزارا کرتی ہوگی۔" وہ اس قدر دل سوزی سے کہیں کہ میرا دل چاہتا کہ اسی وقت جاؤں اور شہینہ کا ہاتھ پکڑ کر ہمیشہ کے لیے اسے اس ماحول سے نکال لاؤں۔

اس روز اس نے حسب عادت مجھے والدینی کمرہ کر نکال دیا تو نہ جانے کیوں میں میں خزا گیا۔
"یہ آپ پیشہ مجھے والدینی کیوں کہتی ہیں؟ میرا بیٹا شہاب ہے۔" میں نے خاصی ناگواری سے کہا تو وہ اپنے گداز لہجوں پر معنی خیز مسکراہٹ لکھ رہی۔
"ایسے نازک رشتوں میں ہر دم یاد دہانی کروا دینا چاہیے۔"

"ورنہ کیا ہو گا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

والدین ایک ہی مکان ہے۔" اس نے دینا دیا۔
"اس کے آرام سے جواب دیا۔
"اور اگر والدین پہلے ہی بھنگ چکا ہو؟" میں نے چاہا کہ اس سے کیا سنا چاہا تھا۔
"تو انہیں بھنگے ہوؤں کو سیدھے راستے پر لانا بھی آتا ہے۔"

اس کی بھنگ دار غشی مجھے اندر تک جلا گئی اور میں بے بسی سے چلو بدل کر رہ گیا۔ کچھ کہنے اور کچھ سننے کی ہمتی ہوئی خواہش میری زندگی کو مکمل طور پر بہکون کر چکی تھی مگر بہت چاہنے کے باوجود جھجک کے ساتھ میرے اندر کوئی خوف سا تھا جو مجھے شہینہ سے مکمل کر کچھ کہنے سے روکے ہوئے تھا میں اپنی اس کم بات پر ہزار بار خود کو ملامت کرتا مگر اظہار کا حوصلہ پھر بھی نہیں ہوتا۔



وقت و جہرے دیر گزر گیا۔
بہار کی ایک خوب صورت صبح نے مجھے بھول سی تھی۔ تائبندہ نے معمول سے زیادہ تکلیف دہان کر رکھی تھی۔
گلابی ٹالوں اور سیاہ چھ دار پاؤں والی کڑیا جیسی بیٹی جب کوئی بار میری گود میں آتی تو خوشی اور محبت کے ہلے بھلے سے مغلوب ہو کر میں کچھ بولے یا اس کی من دہانی صورت کو تنکرا دیتا۔

"بڑا گھرو رہا ہو گا والدینی؟" شہینہ نے حسب عادت میرے کندھے پر جھپٹتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے تائبندہ کی طرف دیکھا جس نے گداز لہجوں پر زردیوں بھیلی ہوئی غشی اور آنکھوں کے کنارے نم دھارے تھے۔ میں نے آنکھوں کے ساتھ "کی کو بھولے میں لانا دیا اور تائبندہ کا سر ہاتھ اپنے اٹھوں میں لے لیا مگر اس نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ پھراتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں نے حیران ہو کر شہینہ کی طرف دیکھا تو وہ حسب عادت اپنے "کی خیر انداز میں مسکرا رہی۔

اپنی مثال سے بچا کر جانے کے بعد حسیہ ستور تائبندہ کو اپنے میکے جانا تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے ہی گھر آئے حالانکہ اس کی امی نے بہت زور دیا مگر وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئی۔

"اصل میں والدینی سے دور رہنا مشکل بھی تو بہت ہے۔" شہینہ نے غصے سے کہنا تو تائبندہ نے پلٹ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

"ابھی مشکل تو بہت ہے۔"
"نکھی مٹی فائزہ کو گود میں لے جب تائبندہ گھر میں داخل ہوئی تو ایک اچانکے احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔" مصنفہ بانی نے آگے بڑھ کر گھٹے لگا لیا۔
"مبارک ہو بابا، بن گئے ہو۔"
"جی ہاں، اب آپ بھی ذرا میری عزت کا خیال کر لیا کریں۔" میں مسکھٹتے سے بولا۔

"اپنی عزت کا خیال تو انسان کو خود رکھنا پڑتا ہے۔" تائبندہ نے ایک بار پھر جیسی آواز میں کہا تو میں جو مصنفہ بانی سے مخاطب تھا چپک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔
"کیونکہ آج اس نے دوسری بار ایسی فقہ معنی سی بات کی تھی۔
وہ فائزہ کو بیڈ پر لٹا کر خود کراؤں سے ٹیک لگا کر بیڈ چکی تھی اس کے چہرے پر یہ ستور زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ مصنفہ بانی یا ہر مٹی گئیں تو میں نے سوالیہ نظروں سے تائبندہ کی طرف دیکھا۔

"میں آپ سے یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اب آپ ایک بیٹی کے باپ بن گئے ہیں آپ کو اپنے ہر طرف میں محتاط ہونا پڑے گا تو لوگوں سے ان کے رشتوں کے مطابق ملنا جتنا ہو گا دنیا کی نظریں بہت کمزور ہو جاتی ہیں ایسا نہ ہو کہ زندگی کے کسی موڑ پر آپ کو اپنی بیٹی کے سامنے شرمسار ہونا پڑے۔"

وہ نظریں نیچے کیے ہوئے دھیمے انداز میں بولتی جا رہی تھی اور میرا پورا وجود کسی ایسے ساز کی طرح جھنجھار رہا تھا جو کسی ناٹائی کے ساتھ لگ گیا ہو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں وہاں کھڑا رہوں یا فوراً طور پر



سیدہ سحر حسان

شادی خیر کی شام

ٹانگے تھے وہ سب مل میں راگہ ہو گئے۔
اس کے گھر والے خوشی خوشی اس کے گھر چلے گئے
تھے دیوار کا فاصلہ ہی تو تھا بیچ میں۔ اور وہ محبت کا بحر
آنکھوں میں دھریں کو کتنی دیکھتی تھی۔
”ہائے سائلوں بھیا تو پتہ چلے نہیں جا رہے اور
بھی خوب صورت ہو گئے ہیں۔“ ہنس کی چھوٹی ہنسیں
سارہ اور عزی آہیں میں پائیں کر رہی تھیں۔
”ہاں ہائے! بہت بدل گئے ہیں سائلوں بھیا یہاں سے
گئے تھے کیسے سو گئے تھے یہاں کی طرح لے۔
اب تو ایسے صحت مند ہو گئے ہیں کہ بس۔“ ملی تو
لے پتہ چل گیا تھا کہ نہیں تھکتی۔
”آیا تو کیوں نہیں گئی ساتھ ہمارے؟“ لایبہ پوچھ

والہ گروہ انعام کے تقرر کا عنوان ہے۔ سے
سائلوں کی روانی کے سبک عرس بھی
سائلوں اور سائلوں کے تھک جانے والی عمر کی حد
اس کے دل میں تلاطم پیدا تھا وہ
کسی کی قید کر لیتا تھا جتنی تھی۔ لیکن یہ شخص
ایک ہی وقت کب کسی کا انتظار کرتا ہے۔
کسی کی سوائل رگ بھی جائیں تو وقت بے آواز
کے پڑھتا رہتا ہے۔ یہ شام۔ جس کا انتظار وہ پچھلے
ہفت سالوں سے کر رہی تھی۔ وہ اپنے انتہائی کی طرف
دھڑکی رہی تھی۔ پہلے اسے بے چینی تھی کہ سورج
چاندی سے نیچے اتر آئے تاکہ شام اپنے پر پھیلا سکے
اور اب صبح نکلتا تھا کہ سورج ہمیشہ کے لیے شبیلی
پاؤں کے کنارے پر ٹھہر جائے مگر ایسا کب ممکن
تھا۔ سورج کو ڈھلانا تھا اور وہ اصل چکا تھا۔

شام رات میں گم ہو چکی تھی۔ آسمان نے ستاروں
کا سماں اٹھایا تھا۔ لڑائی لڑائی کا زور چڑھی
سائلوں میں چپ بنے ہوئے تھے۔ وہ دیوار کے ساتھ
ان لگے آئے سائلوں کی آہوں کو دل میں دھڑکتی
محسوس کر رہی تھی اس کا چہرہ کھلا گیا تھا۔ اس پر صوفی
چھاگئی تھی۔ اس کا اچھٹن نکلتا تھا کہ سائلوں جتنی بھی
اس سے ملنے کو بے چین ہوئے قرار ہو گا۔ وہ بھی اس کی
طرح گھڑیاں گنتا ہو گا۔ اپنے گھر والوں سے ملنے کے
بعد وہ فوراً اس کی طرف آجائے گا اور کئے گا۔

”سستی! کچھ تیرا سائلوں انتظار کی شام طویل ہونے
سے پہلے ہی لوٹ آیا ہے تو کتنی تھی کہ دیوار میرے چلنے
والے کی خط کی گھونٹ دیتے ہیں۔ تیرا کتنا غلط تھا
تیرا گھر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“

انتظار کے وہ طویل چار سال تھے جو اس کی دعاؤں
سے ٹھہر ہوئے تھے۔ ایک شام پر حلاوی ہو گئے تھے
شام جو اس کی لمبی دعاؤں کا ثمر تھی۔ اس نے کتنی
راہیں جاگ کر اپنی سسکیں کو کیوں میں گھونٹ دیا
تھا۔ ہاں کی ہر ”دل پر نوش امید کی کے تھے خواب

اور میرے گھر اور بچوں کو پوری ذمہ داری سے سنبھال
رہی تھی۔ ہماری زندگی بڑے پرسکون انداز میں گزر
رہی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سکون بحری
زندگی میں کوئی پھل پیدا ہو۔

فائزہ اور عارفہ کی شادی کے بعد جب وہاں کی
شادی کا مسئلہ اٹھا تو میری دونوں بیٹیوں کی مرضی تھی
کہ ان کی ماسوں زانو میں بچا بیٹھ کر ان کے گھر میں
آئے۔ مونا کی شکل و صورت اور علوت مزاج پورا پورا
اپنی ماں جیسا تھا، وہی بھوری آنکھیں۔ وہی خلک دار
تھی۔

”اتنی ہنس کھ سے ہمارے تو گھر کا ماحول ہی بدل
جائے گا۔“ فائزہ نے پاگل صفیہ باجی کے انداز میں کہا
اور میں یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ اگر آئندہ کے دل
میں بھی جیتی کو بوندانے کی خواہش جاگ اٹھی تو میں
کیا کہہ کر منع کروں گا۔

مونا بہت پیاری بچی تھی میں نے بچپن سے لے کر
اب تک اس میں کوئی غافل نہیں دیکھی تھی مگر اس کی
بھوری آنکھیں اور بے باک ہنسی۔

ایسی آنکھیں تھیں کہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی
بست آنکھوں کا باعث بن جاتی ہیں۔
اللہ کا شکر ہے کہ یہ مسئلہ اتنے سے پہلے ہی دب گیا
کیونکہ وہاں نے اپنی پسند کی لڑکی کے بارے میں بتایا
اور ہم سب کو اس کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

تو اب ساٹھ سال کی عمر میں جب میرے پاس بہت
سافر غ وقت ہے تو میں سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا
ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک خلش ہی رہ
جاتی ہے۔ وہ خلش ہے جس نے شینہ کو مجھے میں غلطی
کی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ محض ایک خوش مزاج عورت
ہو یا پھر اس کی زندگی میں کوئی ایسی کی ہو جسے وہ اپنے
قتلوں کے پردے میں چھپائے رکھتی ہو۔

میرا حال جو بھی تھا یہ حقیقت ہے کہ بعض عورتیں
اتنے پہلے مردوں کی عقل خراب کر دیتی ہیں۔

وہاں سے ہٹ جاؤں گھر میں جا بانی کو ایسے کہ میرے
قدم تو وہیں جم کر رہ گئے تھے۔ آئندہ اپنی بات کہہ کر
اب دوسری طرف منہ کیے بغیر کسی اور میں سوچ رہا تھا
کہ میری عقل پر کیسے پھر زنگے تھے کہ میں نے یہ بھی
نہیں سوچا کہ ان معاملات میں عورتوں کی جس کس
قدر تیز ہوتی ہے اگر شینہ کو میری بے لگام نظروں کا
اندازہ ہو گیا تھا تو آئندہ بھی ان معنی خیز جملوں اور چور
نظروں کے راز سے کیسے انجان رہ سکتی تھی۔

شرمندگی، عداوت اور کین چھپ جانے کی
خواہش لیے میں بمشکل کمرے سے باہر نکلا اور گھر کے
قریب پارک کا رخ کیا۔ جہاں جہاں میں بیٹھ کر مجھے اپنی
آئندہ زندگی کے لیے نہ صرف کوئی لائحہ عمل ملے کرنا
تھا بلکہ اپنے آپ سے کئی عہد بھی لینے تھے۔

فائزہ کے ہونے کے ڈیڑھ سال بعد عارفہ اور پھر وہ
سال بعد وہاں کی پیدائش کے بعد ہماری فیملی مکمل
ہو گئی۔ میں نے اپنی ساری توجہ پیسہ کمانے اور آئندہ
نے بچوں کی تربیت میں لگا دی۔

آئندہ نے سیکے جانا بہت کم کر دیا تھا اور میں نے تو
تقریباً پچھڑی دیا تھا۔ کسی خاص موقع پر اگر جانا دیتا تو
میں کوئی نہ کوئی بھانڈ کر کے تھوڑی دیر میں واپس
آجاتا تھا۔ میں کیوں یہ محض میرا خیال تھا یا حقیقت کہ
کوئی مجھے رکھنے کے لیے اصرار بھی نہیں کرتا تھا۔ جو
بھی ہو میرا سامنا شینہ سے بہت ہی کم ہوتا اور وہ بھی
مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کرتی اور اس کی
وجہ بھی یقیناً ”میرا سرودیتا ہی تھا۔ وہ پہلے کی طرح
کھٹک دار، قہر لگاتی اور سب سے پیچھے چھا کر گرتی
دکھل سرائے والی شینہ ہی تھی مگر میری نظروں پر اب
فرض کے پہرے لگ گئے تھے۔ کبھی کبھی میں ایک
کھٹک ہی جا چکی ایک بے قرار سی رگ و پے میں
سرسراہی مگر یہ خیال فکس کے کھوٹے کو لگام دینے
رکھتا کہ آئندہ نے ایک بار کے بعد پھر کبھی اپنی کسی
بات میں کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا تھا کہ جو میرے لیے
شرمندگی کا باعث بنتا۔ وہ میرا ہر خرچ سے خیال رکھتی

دی تھی۔
 "اور کس نے پوچھا؟" آنکھوں میں آس کے دھبے
 جلنے لگے۔
 "مائی نے بھی کہا تھا کہ سستی کی طبیعت تو ٹھیک
 ہے اسے تو سب سے زیادہ انتظار تھا سائل کے
 لوٹنے کا۔"
 "اور؟"
 "اور تو کسی نے بھی نہیں۔"
 "کیا سائل نے میرے بارے میں نہیں پوچھا؟" وہ
 حیران بھی تھی اور دل گرفتہ بھی۔
 "ایک بار بھی نہیں۔ وہ تو بس اپنی ہی باتیں
 سناتے رہے وہاں کے قصے۔ ان کے منہ سے تو کوروں
 کی تعریفیں ہی ختم نہیں ہو رہی۔"
 "چھ! وہ مایوس سی ہوئی۔ وہ دونوں پھر سے
 اپنی باتوں میں گمن ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے
 سارے دھبے بچھ گئے تھے۔

کاشی پھولوں کی رنگت بدل رہی تھی۔ دیوار پر
 دھوپ پاؤں پیارے سبز پتوں کو جھومتے دیکھ رہی
 تھی۔ دسمبر کا اختتام تھا۔ سرد اور خشک رات اسے عورت
 پر تھی۔ وہ محض میں افسردگی کی تصویر بنی بیٹھی تھی اس
 کی تپیلی پروں والے کھسے تھے جو اس نے خود سے کیے
 تھے اور سائلوں بھٹی ان میں برابر کا شریک رہا تھا۔ اسے
 وہ شام یاد آئی جب وہ یہاں سے جا رہا تھا۔ وہ بھی جاتی
 سردیوں کے دن تھے۔
 "نکلی! تجھے مجھ۔ اعتبار نہیں ہے میں نے محبت
 کی ہے تجھ سے۔ کوئی مذاق توڑی ہے یہ محبت کتنی
 بھی دور رہے۔ جب وہ لوگوں کو ساتھ دھڑکنے لگا تو فاصلے
 خود بخود کم پڑ جاتے ہیں۔ میں تجھے بھول بھی گئیے سکا
 ہوں سستی، تو خود سوچتی کہ ممکن ہے بھلا اور وہ بھی پھولوں
 سے مسکراتے ہوئے تھی میں سر ہلائی تھی۔
 اگرچہ شروع شروع میں سائلوں نے اسے بہت یاد
 کیا تھا۔ فون پر بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اسے خط

بھی لکھتا تھا اور انہیں کسی کی روک ٹوک بھی نہ تھی۔
 بچپن سے ہی دونوں کے ذہن میں یہ بٹھا دیا گیا تھا کہ
 وہ ایک دوسرے کے لیے ہیں اور یہ حقیقت قیل
 کرتے ہیں وہ قطعی معترض نہ تھے۔ سستی سجدے بجا
 لائی کہ ان کی محبت میں کوئی ظالم سلن نہ آیا تھا۔
 لیکن چار سال بعد کیا ہوا تھا؟
 دیوار غیر میں بے غلظت مصروفیات کے پیش نظر وہ اس
 سے شکوہ بھی نہ کرتی تھی لیکن کیا خبر تھی کہ ظاہری
 طور پر بدلنے والا سائل جتنی اندر سے بھی بدل چکا
 ہے۔ وہ انتظار ہی کرتی رہی اور اس نے گھڑی بھر کو
 بھی اگر اس کا حوالہ نہ پوچھا۔ اگرچہ وہ قدم کا قائل تھا
 لیکن جب دلوں میں ہی فاصلے بڑھ جائیں تو دیواریں
 زندان بن جاتی ہیں۔ جھوٹی ان کی قیدی۔
 "اس نے تو تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی نہ بدلے
 گا۔ وہ صرف سستی کا ہے۔" ایک ایک کر کے سارے
 آس کے چمچی اڑان بھر گئے تھے۔ اس کے ماں باپ
 بھی سائل کی بدلتی ترجیحات سے واقف ہو گئے تھے۔
 تب ہی تو دیو دیوار نے سنا پا کر لیا تھا۔ کوئی چاب تک
 نہ ابھری تھی۔ اس کی تپائی سستی کو بہت جا رہی تھی۔
 اس لیے کل جب ان کے گھر آئیں تو اسے لے لگا کر
 روٹی دی تھی۔
 "اس کی کلاس فیلو ہے کوئی۔ اس نے وعدہ کر لیا
 ہے اس سے۔"
 "اور جو وعدے مجھ سے کیے تھے وہ کیا
 ہوئے؟" اس کے آنسوؤں میں سوال تھا۔
 "مائی روئے مت سستی تو نصیب کی بات ہے۔ جو
 میرے سے کا ہے وہی سنے گا۔" چار سال سے انتظار
 میں کھڑی تھی سستی ایک مہتر کی دیوار بن گئی۔
 * * *
 وہ شرمندہ کب تھا اپنے فعل پر؟ اسی لیے جیسے دن
 ان کے گھر چلا آیا۔
 "کیسی ہے کوسی؟" بڑی بے مروت ہے مجھ سے
 ملنے ہی نہیں آئی۔

"ماں! مائی پرانا ہے میرے آنے نہ آنے سے۔" وہ
 ہال کی راہی۔
 "مائی تو پرانا ہے ماما ہم بچپن کے نقلی ساتھی ہیں۔
 ان کا ساتھ ہے وہاں۔ اتنی دوستی تھی ہماری۔"
 "وہ سستی۔ اسے ہنسنے کے ساتھ روٹا بھی آیا۔
 "ماں! واقعی دوستی ہی تو تھی۔ مطلب لکھنے کے
 ساتھ ختم بھی ہو سکتی ہے۔"
 "ماں! مطلب ہے تیرا؟" وہ موڑھا کھینچ کر بیٹھ گیا۔
 "تجھے اب میری باتوں کے مطلب سمجھ نہیں
 آئیں گے سائل۔"
 "بڑی مشکل باتیں کرنے لگی ہے تو۔"
 "نہیں سائل! میں تو آج بھی وہی سلو سی لڑکی
 ہوں جسے نہ لقا علی آئی ہے تاہم شاید تیرا اندر بدل گیا
 ہے یا اس لیے اب تجھے میری باتیں مشکل لگتی ہیں۔"
 "شاید ٹھیک کہتی ہے تو۔" وہ کھیلی سی ہنسی ہنس
 دیا۔
 جھکی جنوری کی شام جانے کیوں رو پڑی تھی۔
 "ارے کیسے نہیں ہو گا۔ برسوں پرانی بات ہے۔
 سب خاندان کو پتا ہے۔ کوئی مذاق توڑی ہے تا
 رہا۔ اس لیے تو اسے باہر بڑھنے میں بھیجا تھا کہ
 ساتھ میں دوسرے سبق بھی پڑھ آئے۔ ہم نے زبان
 دی ہے تجھے۔" تاپا کے قصے سے وہ سب ہی واقف
 تھے جن کے طم میں اب بات آئی تھی۔ اس لیے وہ
 سنتی ہی چلے آئے۔
 "ہوان لولا! اقرے گھوڑے کی طرح منہ زور ہوتی
 ہے۔ علی کٹر! اس کی ماں خوف زدہ تھی۔ اسے اپنی
 بیٹی کے نصیب سے خوف آ رہا تھا۔
 "اس کی ماں پر لگا ہوا ہے۔ دوستوں میں۔ شام کو آئے گا
 تو دیکھا کیسے مزاج ٹھیک کرتا ہوں اس کا۔ تو فکر نہ
 کر۔" وہ آنسوؤں کی سیلاب دے کر چلے گئے تھے۔ اس
 کے ماں اب کا وعدہ بڑھنے لگا۔ کئی دن بعد وہ کھل کر
 ہنس رہی تھی۔
 "ماں! اسی بات سن۔" مستی نے ماں کو یاد دلایا۔

"تجھے تپا آگئے تھے تو نے سن لی ہوں گی ان
 کی باتیں۔" وہ سو رہی تھی۔
 "ماں! ماں! ساری باتیں سن لی ہیں پر میں تجھ سے
 صاف کہہ دوں۔ کیا ہے کہ ابھی جا کر لایا کو منع کر
 آئے۔"
 "کیا منع کر آئے۔ جھلی ہو گئی ہے تو۔" مستی
 حیرانی ہوئی۔
 "سبیلے تھی ماں! اب نہیں رہی۔ مجھے زبردستی کی
 خیرات نہیں چاہیے میری محبت میں کوئی کھوٹ رہ گیا
 تھا جو سائلوں کے دل سے میری تصویر مٹ گئی۔ اس
 نے کسی اور کو من میں بسا لیا۔ اس سے بھی وہی
 سب کہتا ہو گا جو۔ ماں! محبت تو دور رہ کر اور بھی بڑھ
 جاتی ہے اور سائلوں کے دل سے میری طلب ہی مٹ
 گئی۔ ماں! وہ تو اپنے بدلے پر غم بھی نہیں ہے۔ وہ
 اسے دوستی کہتا ہے۔ خیر! میں اپنے حصے کا بھگتن اکیلے
 بھگت لوں گی پر تو اب اسے کہ لایا کو منع کر آئے۔"
 "وہ بدلا نہیں ہے سستی! اپٹ آئے گا تیری طرف
 ۔ چاروں کے لیے اسے دل ملانے کے لیے کوئی اور
 مل گئی۔"
 "تجھے تو انکار کر رہی ہوں ماں! وہ چار سال بھی
 میرے لیے خود کو بچا کر نہ رکھ سکا۔ کیا گئی تھی مجھ
 میں۔ اور پھر میری طرف وہ لوٹا بھی تو کیا لوٹا تب وقت
 ہی بہت جائے گا تو میرے دل کو نہیں سمجھے گی تو منع
 کر دے بس۔"
 "تو بچھٹائے گی سستی؟" وہ طبل ہوئی۔
 "بچھٹا تو رہی ہوں ماں! ایک ایسے شخص کو اپنے
 سچے جذبے دان کر دے جو اس قاتل ہی نہیں تھا۔
 میرے دل کا بڑا نقصان ہوا ہے ماں! اس کی آنکھیں
 بند نہ لگیں۔
 اس دل کا ماں ٹوٹا ہے ماں! بڑا غور تھا اسے اپنی
 محبت کی پارسلوں پر۔ مگر سب کچھ ختم ہو گیا سب
 کچھ۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے محبت پارسلوں کا
 دسرانہم ہے۔ جب کر واری ہی جائے تو محبت محبت
 کبہر ہوتی ہے۔

ہائے قسمت "میں ایسا چاہتا ہوں" اور انہی کے
 کلیں انہی کے حرف پر ذرا سا شہسے اور انہی کے
 باہر آگئے۔
 "ہاں تو میں کلیں احمد! اب وقت کی چال بدل گئی
 ہے۔" انہوں نے رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر سوچا۔
 "کل تک ملنے والا ہر رشتہ الہی ہٹ کر رہا ہے۔
 ہر لڑکی میں انہیں سو سو عیب نظر آتے رہے اور اب یہ
 حال ہے کہ لڑکیاں خود ان کے رشتے پر انکار کر رہی ہیں
 انہوں نے اب اس سے چمت پر گھومتے ہوئے چلنے
 کو دیکھا۔

دس برس بیت گئے "میں کو اپنی پسند کی سونہل
 سکی۔ چیکس برس کے تھے کلیں احمد جب ان کی بی بی
 تو کمری کھنے پر الہی خوشی سے پھولنے نہ سہا کر سکتی
 تھیں کہ اب اس آگن میں چاند سی ہوا ترے کی اور
 جب سے انتظار کر کر کے کلیں احمد کے تمام ارمان سو
 گئے تمام جذبات باقی ہو گئے ہمارے کو ان کی چاند سی
 ہو اس روئے زمین پر ہمیں بھی دستیاب نہ ہو سکی۔
 "آخر ایک واحد لڑکی میں۔" کتنی خیریاں بیکجا ہو سکتی
 ہیں۔" انہوں نے مسرت سے سوچا۔

"خوب صورت بھی ہو اور خوب سیرت بھی پڑھی
 لکھی بھی ہو" ماہر امور خانہ داری بھی ہو ہاتھ ہر وقت
 چلتے رہیں "زبان ہمہ وقت چھٹی رہے تھیں ان سے دور کا
 واسطہ نہ ہو "البتہ مسکن قریبی رشتہ دار ہو" ہر وقت
 ہونٹوں پر دھناتی سے بھی رہے چاہے الہی باتیں
 سنائیں یا غلغلہ سے جگر مچھلتی کریں۔ صبر و
 استقامت کا مجسمہ ہو "منانت و بردباری بھی بدرجہ اتم
 موجود ہو" اب۔" قائد اعظم جیسی ہمہ گیر خصوصیات
 کی حامل شخصیت تو صدیوں میں کیس ایک پیدا ہوتی
 ہے ہمارے کو یہ کون سمجھائے اور یوں اس کو ہر بات
 کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہوئے الہی کو ایک

طویل عرصہ (دس سال کا) گزر گیا تھا اور کلیں احمد
 کنوارے کے کنوارے تھے انہی اسکول کے زمانے
 سے ان کا کلاس فیلو تھا۔ لی اسے سیاسی کر کے دونوں نے

ایک ساتھ اپنی چلب کا آغاز کیا تھا اور انہی کو اب باج
 عدو بچوں کا باب ہونے کا انہی حاصل تھا اور کلیں احمد
 اپنی قسمت پر ہنسنا دیکھ رہے تھے۔ کبھی جو بھولے بیٹے
 انہی کے گھر ملنے چلے جاتے تو انہیں خود سے شرمندہ
 رہتے۔ انہی کی زوجہ محترمہ کو دیکھ کر ان کی آنکھوں
 میں می اتر آتی تھی اور اس کے پانچ بچوں کے کیے بعد
 دیکھ کر پانچ باج روپے تھما تے ہوئے ایک حسرت سی
 آنکھ لگتی تھی۔
 "کاش! یہ روپے میں اپنے ذاتی بچوں پر خرچ
 کرتا۔" اکثر سوچتے۔

انہی جب اپنی بیوی کو حیدر کے بجائے ہمارے
 حسی بیکار تھو دھمی اپنی بیوی (ہونے والی) کے لیے کوئی
 اچھا سا پارا بھر نام سوچتے۔
 "اگر اس کا نام علیا ہو تو الہی کوں کا مشاغلہ ہوا تو
 شعی "نہیں ہوا تو نمی!" وہ دل ہی دل میں کئی ارادے
 باندھتے۔ الہی اگر کہیں۔ جانے لگتیں اور کلیں احمد
 کو لڑکی کا نام بھی بتا جائیں تو ان کے وارے تیارے ہو
 جاتے۔

"ہوں! تو محترمہ کا نام سوچو! پھر میں کیا کہوں گا
 اسے؟" الہی کے ہانے کے بعد وہ مسرورے "سوان
 سے نیک لگا کر سوچتے رہتے۔
 "سنی! نہیں تجھی بہت ملاؤں ہو جائے گا۔ پھر منی!
 اول ہوں لا حول ولا قوۃ! بیوی کو منی بیکار آنتانی غیر
 ردائی فعل ہے "رونی؟ نہیں نہیں دوست سمجھیں
 گے کہ ان کی پہلی کی شکل ہی رونی ہے۔ روئی۔ الہی
 بالکل ٹھیک "بی بی پارا نام ہے۔" پھر جب تک الہی
 نو تین ذہن روئی روئی کی تسبیح کرتے رہتے۔

"نہ ٹاگ نہ آگہ۔" الہی کا تہذیب و تہذیب ان کا کعبہ
 اندر تک چھ جانک۔
 "ارے بھی ذرا تو تنگ ہو چرے پر" مجھے تو ایک
 آگہ نہ بھائی۔"

اور کلیں احمد ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے
 پھر نہ جانے کتنی ان دیکھی لڑکیوں کے انہوں نے

کتنے نام سوچے عائشہ کے لیے عائشہ کی محبت کے لیے
 گئی محبت کے لیے خود خوجانہ کے لیے فری "نہیں
 کے لیے لکھی! اور الہی کے بعد دیکرے سب کو
 رہ چکے کئی رہیں۔ کسی کا رنگ ضرورت سے زیادہ
 سا لگتا تھا، کسی کی زبان مست چلتی تھی کسی کے ہر میں
 نقص تھا تو کسی کی آنکھ میں کسی کے چہرے پر سکون کی
 بہتات تھی "بقول الہی کے۔" ارے وہ لڑکی تھی کہ
 کموں کا لہذا۔"

اور کلیں احمد "الہی کے ان بڑے بولوں پر کڑھ کر
 رہ جاتے "خس جاتے ہوئے" راستے میں زور تھی
 لڑکیوں کا وہ بغور معائنہ کرتے تھے انہیں تو بھی کوئی
 لڑکی بری نہ لگی تھی "چاہے وہ سوائلی سلوی ہو یا گوری
 بھو کا مہلی ہو یا دلی "چہرے تل ہوں یا مہاسے ہوئی
 تو لڑکی ہوتی ہے "لطافت و زناکت کا مجموعہ" یہ ہستی
 مسکراتی "مسکراتی لڑکیاں بھلا کسی کو بری لگ سکتی
 ہیں۔ کلیں احمد دل کے بہت اچھے تھے "نرم و نازک
 جذبات و احساسات کے مالک "شاعرانہ خیالات رکھنے
 والے انہیں تو کسی میں کوئی خامی یا شکل ہی نظر نہ آتی
 تھی بلکہ اچھی خاصی "مہنی باؤنی غامی کو بھی وہ نظر
 لانداز کرتے تھے مثلاً "نہیں گے کے لیے جب الہی
 رشتہ لے کر گئی تھیں تو الہی اس آکر انہوں نے بتایا تھا کہ
 لڑکی کی دائیں ٹانگ میں نقص ہے اس پر وہ انکار کر آئی
 ہیں۔ کلیں احمد کا نرم و نازک دل اس بات پر بہت دیر
 تک فسر رہا تھا۔

"الہی بھی مکمل کرتی ہیں۔ یعنی اتنی سی بات پر انکار
 کر دیا۔ یہ نقص بھی کوئی نقص ہے بے چاری تھوڑا
 سا لنگڑائی ہی تو ہوگی۔ اس میں کیا ایسی بڑی بات تھی۔
 یہ الہی بھی سمجھی بھی زیادتی کر جاتی ہیں۔ کتنا افسردہ ہوئی
 ہو گی بے چاری لکھی! "وہ دونوں اس بات پر ملول پھرا گئے
 تھے۔

یوں دن پر دن بیتتے چلے گئے۔ الہی لڑکیاں دیکھتی
 رہیں "دیکھتی رہیں اور دیکھتی ہی رہیں۔ ان کے
 تاجدار اور فاتحہ دار بیٹے نے بھی زبان کھول کر نہ دی۔

"الہی جان! کیا مجھے بچا ہے میں وہ لہجہ تو کی؟ چاند
 سی ہو نہیں ملتی نہ سنی تمہارے کوئیوں والا کوئی چھوٹا موٹا
 تار ہی لے آؤ۔"
 آج بھی جب الہی عرشہ کو فاضل کرنے لگی تھیں
 تو کلیں احمد نے کیا کیا خواب نہ سمجھائے تھے اکیلے گھر
 میں انہوں نے کیا کیا اوائی لگاؤ نہ بولے تھے۔
 "عرشی لہذا! چھی سی چاہتے تو نہاؤ۔"

"عرشی چندا! الہیوں رو رہی ہو؟ الہی نے کچھ کہہ دیا
 ہے؟ ارے یا راجہ! تمہیں بتا تو ہے الہی کا! زبان کی کڑوی
 سنی "دل کی بہت اچھی ہیں۔ کتنے چاؤ سے ہمیں
 دلہن بنا کر لائی ہیں۔ تمہارا راز انہو ڈا ہی سوچیں گی۔ چلو
 اب ہنس دو۔ ہنس دو بھی "دیکھو ہنس دو" ورنہ میں
 بھی رو دوں گا اور جب الہی نے آکر عرشہ چندا کا جواب
 سنایا تو واقعی ان کا دل روئے کو چاہتے لگا۔ لیکن قدرت
 نے جب الہی دی تھی تو لازمی طور پر صبر و ضبط کا
 بے تحاشہ لہجہ بھی عطا کیا تھا کہ "تو ان" "تو قانون
 قدرت ہے۔ سو انہوں نے بیشک کی طرح زبان پر جب
 کے پہرے بٹھائے انہوں کو وہاں حلق سے انداز اور
 تھکے کر اپنے بستر پر لیٹ گئے اور انہیں سونہ کر
 انہی کی خوش قسمتی پر رشک کرتے کرتے جانے کب
 سو گئے۔

"ہاں بھائی کلیں! پھر کب بھائی کھلا رہے ہو؟"
 انہی بھی الہی کی طرح جان کا شوقین تھا۔ بے حد منہ میں
 پیک بھر کر بات کا آغاز کرنا تھا۔

"کس بات کی؟" کلیں احمد نے سادگی سے پوچھا۔
 "مٹکی تو کتنی! تمہارے تھے تاکہ کہیں رشتے کی
 بات چلائی ہے الہی نے۔" انہی نے پیک پیچک کر
 روٹل سے منہ صاف کیا۔

"کوئی نئی بات ہے بھلا؟" اندر سے آتی ہوئی حیدر
 نے طنز سے کہا۔ یا شاید کلیں احمد کو ہی ایسا محسوس
 ہوا۔

"نہن کے رشتے کی بات تو کوئی بڑا مرتبہ چلائی ہوگی
 ان کی الہی نے پھر خود ہی ختم کر دی ہوگی۔" اس نے

معدودہ پہلی ہی اور اس کا نام سنا۔ "درمیان میں ایک ایک اطلاع ان میں فراہم کی۔"

"کچھ عرصہ خط و کتابت کا رابطہ رہا پھر دونوں الجھ کر رہ گئے اپنے اپنے گھر میں۔ کوئی تیس برس کے بعد ملوں کی سعیدہ سے کوئی اور نظر نہیں آ رہا۔" انہوں نے اور کون ہو گا وہ تو زانی۔

"اور کون ہو گا خالہ؟" وہ حیران ہوئے۔

"بس میں اور مل ہی تو رہتے ہیں۔ اما میاں کا طویل عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔"

"ہاں! اس تو جانتی ہوں میں۔ میرا مطلب ہے کہ کیا شادی نہیں ہوئی تمہاری؟"

"جی نہیں۔" وہ کچھ شرمائے "کچھ شرمندہ ہوئے۔"

"اچھا! نہیں بے حد حیرت ہوئی۔"

"ابھی تک۔"

وہ منہ میں کچھ بڑبڑائیں اور کھلیل احمد صرف ابھی تک ہی سن سکے اور حتی المقدور زمین میں گڑ گئے۔

"تپ نہیں میں چاہئے ہوتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگے۔

"رہنے دینا! مروتات ہو گئیں الجھتے پھر گئے ان دھندوں میں۔"

"ارے خالہ! مجھے یہ سارے دھندے آتے ہیں۔"

"پوشے۔"

"بھئی اماں بیمار ہو جاتی ہیں تو میں کھانا تک پکا لیتا ہوں۔"

"مشاء اللہ بڑے ہی معلوت مند اور نیک سیرت ہو۔" وہی بھر کر خوش ہو میں۔

"کھل ہوتے ہیں آج کل کے زمانے میں ایسے مرد بڑے؟" انہوں نے زبان کو پھسل جانے کے بعد قابو کرنے کی کوشش کی۔

کھلیل احمد زخموں کو سینکے ہوئے باورچی خانے میں آکر چائے بناتے لگے۔ اسی دوران انہوں نے باہر ملوں کی آواز بھی سن لی۔ وہ برسوں بعد ملنے والی سبلی سے اپٹ کر غلبا "مور دی نہیں۔"

"ارے کھلیل احمد! اور کون کون کیا ہے؟" وہ انہیں یاد دہانی میں۔ وہاں ہر ایک۔

"جی اماں! مل چکا ہوں میں بڑی خوشی ہوئی مل کر۔"

"ارے سعیدہ! بے کار عورت ابھی تک تجھ سے ایک سو کا انتظام نہ ہو سکا۔" وہ واپس کچن کی طرف آ رہے تھے جب انہوں نے سنا۔

"ہائے بتول! کیا بتاؤں کہ تو تو لڑکیاں ڈھیروں کی ماری نہیں ہیں لیکن ڈھیر سے نکلو تو لگتا ہے کہ کل بڑ کیا ہے اور پھر۔ اب کھلیل کی عمر بھی تو کافی کل گئی ہے۔"

"انہوں نے کوازد جی کی پھر بھی چند جتنے انہوں نے سن ہی لیے کہ دم سلا مے خان لگائے بیٹھے ہوئے بھی تو تھے۔"

"تین رشتے پسند آئے مجھے، انہوں نے ہی صاف انکار کر دیا۔ کسی کو عمر بھر اعتراض تھا تو کسی کو تو کڑی پر۔ حالانکہ کافی معقول بخود ہے میرے کھلیل کی عمر بھی آج کل کی چھوڑاں۔ ارے بھیا! انت ہیں آنت! انہوں نے غالباً یہ کہہ کر۔"

"اب تو میں بھی کی جا ہوتی ہوں کہ مجھے تھے۔"

نمائندوں یہ قضیہ اصرار کیا پھر سارا کچن مرجاؤں تو بیٹا تو کوسے گا تا زندگی بھر۔"

"ارے کیوں بد فائیں نکالتی ہو۔ خدا جیسے لمبی عمر دے دے تو پتہ پڑے تو کھائے۔"

کھلیل احمد نے ان کے درمیان چائے رکھی اور اس بات پر کچھ سرخ ہوئے۔

"ارے کھلیل! بس چائے پر بڑکاؤ گے اپنی خالہ کو؟"

اماں نے مصنوعی خنکی اور حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کچھ بسکٹ پیسٹری نہ لائی گئی تم سے؟ دو قدم پر بکری کھڑی ہے؟"

"اماں! میں نے سوچا کہ کھانے کا وقت ہو چلا ہے تو میں خالہ کے لیے کھانا ہی لے آتا ہوں۔ نصیر بھائی والا ابھی کھڑا ہی ہو گا۔" انہوں نے گھڑی دیکھی۔

"نہ بیٹا! یہ کھانے کا کھلف نہ کرنا۔" خالہ بتول

نے معذرت بڑے ڈھیلے لہجے میں کی۔

"میں بس چلوں کی چائے کی کر۔"

"ارے بتول! غضب خدا کا یوں شرمندہ کرو کی جیسے! یوں کھائے بیٹے بغیر تو ہرگز لوٹ کر نہ جانے دلاں گی۔"

اماں کو غصہ آئے لگا۔

"میں سے سعیدہ! اماں کل سو نہیں کھانے کا اور پھر رخصت ہوئی کیلی ہوگی۔"

"رخصت کون؟ تمہاری بیٹی؟"

"ہاں! ہاں! ایک ہی تو بیٹی دی ہے خدا نے۔" وہ مسکرائیں۔

"اسے دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں بس میں۔"

"تمہاری بیٹی تو اب! اماں نے دل میں کچھ حساب لگایا۔

"شادی نہیں کی ابھی؟"

"بس یمن کیا بتاؤں۔" انہوں نے بھی ایک لفظی جواب دیا۔ داستان الم شروع کی۔

"ارے کھلیل! میں کیا سرگڑھ ہو عورتوں کے! بھائی بھائی نے کو تو ذکر۔ بتول کو میں کھانا کھائے بغیر ہرگز نہ جانے دلاں گی۔"

اماں نے بتول کی استوری سننے کا موقع کھلیل احمد کو دیا اور وہ بتول خالہ کی ہم رزمانہ یعنی خاموشی دیکھ کر بھائی لینے چل دیے۔

نصیر بھائی فروش نے جو محل سے بڑھ فروش کے علاوہ نصیر فروش بھی لگتا تھا۔ کمال صفائی سے انہیں بغیر بوتلوں کے بریانی دینی چاہی جس پر انہوں نے خفا ہو کر دوسرے بیٹھے کا رخ کیا اور فرائی پھیلی اور بن لے کر گھر لوٹے اور دونوں خواتین کو خالص فروش و غرم پلا۔

"بھئی بتول! بوجھ بھار کر ڈالا تم نے میرے دل کا! بتول خالہ رخصت ہونے لگیں تو اماں نے انہیں گلے سے لگا کر کہا۔

"میں سے دل لگتی کتنی ہوں! دو سارے کا حق ادا کر دیا۔"

"سعیدہ! شکر گزار تو میں تمہاری ہوں بوجھ تو میرا ہے رخصت ہو گئی ہوگی کسی اس کی چھ سال پہلے پھر

پکا ہوا ہے۔" بتول خالہ نے کھلیل احمد کو یاد پھر ی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ان کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک ان الفاظ میں الجھتے رہے۔

"کھلیل میاں!"

دوسرے دن وہ آفس سے آکر کھانا کھا رہے تھے جب اماں نے بات کا آغاز کیا۔

"جی اماں! آئیے!"

"بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ اس اہم فریضے سے سیکرٹوش ہو جاؤں۔" اماں اس طرح آواز ہو کر بولیں جیسے ان کی وراثی کی بات کر رہی ہوں اور کھلیل احمد! ان کا دل یکبارگی پھر اسی طرح و طر کے لگا جیسے پچھلے دس برس سے اس ذکر پر و طر کا آ رہا تھا۔

"کون سا فریضہ اماں؟" لا تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے ٹوٹر کا گھڑانہ میں رکھا۔

"جی تمہاری شادی کا۔" اماں جانے کیوں آواز سی لگتی تھیں۔

کھلیل احمد خاموشی سے ہاتھ پیرنے لگے۔

"کل بتول اتنی سی ہاں۔"

"جی اتنی نہیں۔"

"اس کی ایک بیٹی ہے رخصت۔"

"رخصت! وہ دل میں سوچنے لگے۔

"منا سدا اتنی ہاں جی مناسب رہے گا۔"

"کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟" اماں اس نام پر انہیں غلطاب و جھٹکا دیکھ کر کہنے لگیں۔

"جی! وہ چھوٹے۔" کچھ نہیں اماں! یوں ہی آفس کی ایک سیٹ یاد آئی۔

"تو سن لو۔" وہ خفا ہوئیں۔

"میں اتنے اہم مسئلے پر بول رہی ہوں اور تم ابھی تک بیٹے آفس کے دھندوں میں الجھتے ہو۔"

"نہیں اماں! آپ بولیں میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"ہاں تو میں کہہ ہی رہی تھی کہ بتول کی ایک بیٹی ہے رخصت ہو گئی ہوگی کسی اس کی چھ سال پہلے پھر

نوٹ گئی۔ تب سے بے چاری کا کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہی نہ کیا۔

"کیا! اس خاموش ہو گئی تو مجبوراً انہیں کہنا پڑا۔" اٹھالی خوشی چند لمحوں کو ماند پڑی پھر وہ زندہ رہی مسکرائے۔

"کل بتول کو تم بہت پسند آئے۔ اس نے بات کی کہ تمہاری اور ریحانہ کی جوڑی مناسب رہے گی۔" بے چاری۔ "آخر کار وہ دل کو رام کرنے میں کامیاب ہو جیسے آپ کی مرضی ملے۔" ان کا دل ملیاں اچھلنے لگا تھا۔

"میں تو جی تو تھی بتول کے ہاں اسے دیکھنے کے لیے۔" اٹھالی نے کچھ تال کے ساتھ کہا۔

"مجھے تو مناسب ہی لگی۔ بیٹا احسن سب کچھ تو نہیں ہوتا نا!"

"میں تو کب سے یہی کہہ رہا ہوں اٹھالی!" انہوں نے سوچا۔ "آپ کی ہی خند تھی۔"

"لڑکی پر مہمی کبھی بہت ہے۔" نہیں سوچنا کچھ کر اٹھالی جلدی سے بولیں۔

"ماشاء اللہ پندرہ رشی میں پڑھی ہوئی ہے۔ جانے کون سی ڈگری لی ہے۔ ایم سی بی یا ایم ایس ڈی کیا کہہ رہی تھی بتول۔"

"ایم ایس سی۔" اٹھالی کو سوچتے دیکھ کر انہوں نے مشکل آسان کی۔

"ہاں ہاں وی۔" اٹھالی خوش ہوئیں۔

"مجھے تو عادت کی بھی ٹھیک لگی۔"

وہ خاموش رہے۔

"تصویر میں لے آئی ہوں۔" اٹھالی نے نکیے کے نیچے سے ایک لفافہ برآمد کیا۔ "تم دیکھ لو اگر پسند آئے تو میں کل جا کر بات پکی کر آؤں۔" ورنہ بیٹا تمہاری مرضی زور زبردستی تو میں کرنے سے رہی۔"

انہوں نے ہنسنے لگے۔

"اٹھالی! ہمیں دیکھوں میرا مطلب ہے کہ۔"

"نہیں نہیں لے جاؤ تم! اٹھالی مسکرا دیں۔"

"اطمینان سے دیکھ لو۔"

"نہا ہوا ہو گیا! اچھی بھی شرماتا ہے۔" وہ جانے لگے تو پیچھے سے انہوں نے اٹھالی کی پرواہ نہ کی۔

اپنے کمرے میں آکر خوشی سے پھولے نہ سہاتے ہوئے انہوں نے دور اندیش کیا اور بستر پر بیٹھ کر تصویر اٹھالی خوشی چند لمحوں کو ماند پڑی پھر وہ زندہ رہی مسکرائے۔

"بس ٹھیک ہے" اچھی ہے" بھتی اچھی ہے

"آخر کار وہ دل کو رام کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"کچھ بڑی بڑی لگتی ہے" وہ تو خیر میں بھی۔" انہوں نے کمر اس کے کمر سوچا۔

"اگر یہ چشمہ نہ لگائے تو کافی بہتر لگے۔" نہیں خیر اچھی تو ابھی بھی ہے اس کی آنکھیں کسی سے ملتی ہیں کس سے؟" فتنے سے۔

"ابو بھتی! یہ تو نا چشم ہے۔ چلو کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی آنکھیں پھیرے گی ہی نا تو ہم نہا لیں گے اور یہ چشمہ۔ چلو چشمے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ایس عالم ہیں اور وہ اٹھالی کا پادرام سو فٹ مصری کا نسخہ چشمہ تو آتر جائے گا۔ یہ تو نا چشمی کیسے جائے گی۔ لا حول ولا قوت۔" اٹھالی احمد! خدا سے ڈرو۔" انہوں نے خود کو سرزنش کی۔

"بس ہو گیا اٹھالی! اچھی ہے بلکہ بہت ہی اچھی ہے۔" دل پر جبر کر کے انہوں نے تصویر کو مسکرا کر دیکھا اور لفافے میں بند کر دیا۔ (اب زیادہ اچھی ہے) دل لے کہا۔

"اول ہوں! بری بات!" دل کو سمجھا کر لفافہ نکیے کے نیچے رکھ کر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

"ریحانہ۔" ریحانہ سے حنا میں کیا سوچا تھا ابھی ہاں ٹھیک ہے بھتی ہی ٹھیک ہے۔"

"سوچتے سوچتے ان کی آنکھ لگ گئی۔"

"اٹھالی بیٹا! کیا سوچا تم نے؟" شام کو آنگن میں بیٹھ کر اٹھالی نے ان سے پوچھا۔

"اچھا! میں نے کچھ سوچنا تھا کیا؟" وہ کچھ شرم سے ہوئے۔

"کیا ہاں؟"

"بیٹا! وہ ریحانہ کیسی لگی تمہیں؟" اٹھالی نے ڈک رکھ کر پوچھا۔

"بہت خوب صورت ہے اٹھالی! انہوں نے دلالت نکالی۔"

"خوب صورت؟" اٹھالی کو بیٹے کی دماغی حالت دیکھ کر لگی۔ "کیا لائق کر رہے ہو بیٹا؟"

"نہیں اٹھالی! وہ حیران ہوئے۔" مذاق کیوں اڑاؤں کا بھلا؟ مجھے تو خوب صورت ہی لگی اس لیے کہہ رہا ہوں۔"

"اب دماغ کوئی سے تو بریز کر دے!" اٹھالی براہین گنیں۔ "ہاں انسان کا بچہ ہے کس؟"

"جی وہ تو ہے۔" انہوں نے سعادت مندی سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"پھر ہاں کر دوں؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"اٹھالی احمد تو ذرا شرمائے پھر اٹھالی کی گود میں سر رکھ کر لٹ گئے۔"

اٹھالی مسکراتے ہوئے ان کے سر میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

اٹھالی بات طے کر کے آنکھیں تو مٹھنی کے لفافے کر دیکھا۔

"اچھی ٹھیک بہت بہت مبارک ہو!" اٹھالی ان کا دست تھا خوشی سے کل بڑا۔

"اٹھالی ٹھیک بہت! اٹھالی! ہم سے پوچھا بھی نہیں اور پسند بھی کر لی لڑکی؟" حیدر نے منہ بنایا۔ "میں نے تو تنقیدی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں آپ کے لیے۔"

"اچھا! وہ فتنے سے مسکرائے۔" مجھے کیا خبر تھی بھابی!"

"جی۔" یاد آتم کچھ کھانے کو لے آؤ! اٹھالی نے بے زاری سے اسے دیکھا۔ حیدر اسے گھورتی ہوئی اٹھالی کی۔

"بھابی! باراض ہو گئیں شاید۔" بس وہ اچانک سی لہجے سے۔

"یار۔" دفع کر داس بے وقوف عورت کو۔" اٹھالی نے ہاتھ طے۔ "بس جو ہوا! اچھا ہوا۔ اسے تو تو نہی عادت ہے ہمیں لڑائی کی۔ تم سناؤ دیکھا ہے اسے؟"

"ہاں تصویر دیکھی ہے۔" وہ مسکرائے۔

"اچھا! کیسی ہے؟" اٹھالی کو اشتیاق ہوا۔

"بس اچھی ہی ہے۔ کیا کہوں۔ تم خود دیکھ لینا!"

"ہاں ہاں۔" دیکھیں گے ہی۔ بھتی ہماری ٹکری ہوئی چاہیے۔" اٹھالی نے اندر آتی حیدر کو دیکھ کر باوازی بند کرنا اور حیدر سے مسکرائی۔

"بھابی تو بہت اچھی ہیں یار!" اٹھالی احمد شرمندگی سے مسکرائے۔

"جانے دیجیے اٹھالی بھابی! انہیں تو بس یونہی عادت ہے۔" حیدر نے بیانی شرم سے کہا۔

"نہیں بھابی عادت کی کیا بات! اچھی چیز کی تعریف تو ہر بندہ کرتا ہے۔" اٹھالی نے سر ہلایا۔

"ہاں تو اٹھالی بھابی! کب لے جا رہے ہیں ہم آپ کی بیارات۔" حیدر نے پوچھا۔

"وہ تو اٹھالی کو ہی خبر ہوگی۔"

"لو بھتی۔ بیارات جس کی جانی ہے" اسے خبری نہیں اٹھالی کو خبر ہوگی۔" حیدر ہنسی۔ "مجھے تو ترس آیا ہے اس آئے والی پر۔ آپ تو ہمہ وقت اٹھالی کی تسبیح بھاگ رہیں گے اور وہ مل جل کر خاک ہوگی۔"

"بھتی جی۔" چائے کیا پلے سے چل کر آئے گی؟" اٹھالی کو اس کی ان بے سرو پا باتوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ آتا تھا۔

"ہاں ہاں۔" لے لے جا رہی ہوں۔" وہ انہی۔ "آپ کو تو بس مجھے مصروف رکھنے کا مہارت چاہیے۔"

"تم مصروف ہی رہو تو اچھی ہو۔" اس کے جانے کے بعد اٹھالی بیٹھ پڑی۔

پھر اٹھالی احمد کافی دیر تک اس مسئلے پر اس کے ساتھ سر کھپاتے رہے۔

پھر خدا خدا کر کے وہ دن آئی گیا جس کا اٹھالی احمد کو برسوں سے انتظار تھا۔ شہری شہروانی میں ملبوس سر پر ٹوپی جیسے وہ بڑی سرشاری سے ابو حشر سے گھر پھر رہے تھے۔ آج دوستوں کے درمیان ان کا سر بھی بلند

ہو گیا تھا۔ کچھلے دو تین دن سے ان کے دوستوں نے جمع ہو کر سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اور تو اور کھیل احمد نے خود ان کے درمیان لٹک لٹک کر ڈانس کیا تھا۔ افکار کے پہلے اصرار اور پھر ڈانٹ پر وہ بیٹا شرما جاتے اٹھے تھے اور پھر افکار کو بی دو بارہ ڈانٹ کر انہیں واپس بٹھایا تھا۔

اباں بی کی الگ خوشیوں کا لٹکانا تھا وہ کھیل احمد کی بلا میں لیتے نہ تھکتے تھے۔ گلابی سکی جوڑے میں لمبوس ہی زمین پر نہ تھکتے تھے۔ گلابی سکی جوڑے میں لمبوس یہ بڑے گھر سے خواتین میں برائیاں اپنے بیٹے کی تعریفوں میں زمین اور آسمان کے قلابے مار رہی تھیں۔ آخر کار کھیل احمد کی بارات بڑی شان سے مچی اور وہ ریحانہ بیگم کو دلن بنا کر لے آئے۔ دلن کو اباں بی اور کھیل احمد کے دوستوں کی بیگمات دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ اور وہ گھر سے گردن اکڑائے اپنے دوستوں میں بیٹھ گئے۔ گویا دنیا فتح کر کے آ رہے ہوں دیسے دل ہی دل میں وہ خود کو سکندر اعظم سے کچھ کم نہیں سمجھ رہے تھے۔

محمودی دیر بعد ایک ایک کر کے بیگمات بھی وہیں آئے گئیں۔
 "ہائے اللہ! میں مر جاؤں۔" گھبرائی ہوئی اندر داخل ہونے والی خاتون حمیدہ تھیں۔
 "آمین! افکار زرب لب بڑھایا تھا۔
 "کھیل بھائی! بھائی ریحانہ تو چشمہ لگاتی ہیں!"
 "جی؟" کھیل احمد کی مسکراہٹ غائب ہوئی!
 (پورے ہفتہ بھر بعد) "جی بھائی! مجھے علم ہے!"
 "تو تو بھی تو اتنا تاری ہی نہیں ہیں۔ سب ان سے کہہ رہے ہیں کہ چشمہ اتار کر تصویریں بنوائیں مگر وہ راضی ہی نہیں ہوتیں بس روئے جاری ہیں۔"
 "پھر؟" وہ پریشان ہوئے۔ "میں میں کیا کروں؟"
 "تو آپ کیسے تائن سے۔"
 "میں؟ یعنی کہ میں کموں؟" حیرت سے ان کی آنکھیں پوری پھٹ گئیں۔
 "تو تو ان لوگوں کے گا؟ اباں بی بات وہ سن نہیں رہیں۔"

ہم سب کہہ کہہ کر تھک گئے اب آپ ہی سمجھتے ہیں نا۔"
 "جوڑو تا حیدہ!" افکار رنج ہوا۔ "ان کی مرضی جیسے چاہیں تصویریں بنوائیں۔"
 "اچھا جی نہیں کیا۔ اس نے کندھے اپکا کر افکار کو گھورا۔ "وہی دیکھیں گی ساری زندگی اپنی تصویریں۔ ہم تو پہلے کے لیے ہی کہہ رہے ہیں۔ دلن بن کر چشمہ لگانا عجیب سا لگتا ہے۔ جو رنگ رہی ہیں پوری۔"
 "افہ۔" افکار پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا تم جا کر سارے بچے اکٹھے کرو۔ بس چلتے ہیں بہت رات ہو گئی ہے۔"
 حمیدہ کی زبان کی دھار سے وہ بے چارہ اسی طرح عاجز رہا کرتا تھا۔
 حمیدہ نے اسے گھورا اور مڑ کر کمرے سے نکل گئی۔
 محمودی دیر بعد تمام دوست ایک ایک کر کے چلے گئے تو کھیل احمد نے ایک محکم سے بھرپور انکار کیا اور وہیں تخت پر دو ٹولیاں بٹھو کر بیٹھ گیا۔
 "اگرے بیٹا کھیل! اباں بی کچھ قلمندی اندر داخل ہو گئیں۔
 "جی اباں؟" وہ اٹھ بیٹھ۔
 "بیٹا! دیکھو ذرا دلن کے پاس جا کر بیٹھو کچھ تسلی دے۔" بے چاری روئے جاتی ہے۔
 "کیوں اباں؟ کیوں رو رہی ہیں وہ؟" وہ پریشان ہو گئے۔
 "بھئی وہ عورتیں اس سے چشمہ اتارنے کا کہہ رہی تھیں اور وہ راضی نہیں تھی شاید کسی کی کوئی بات نہ ہو۔ تم جاؤ ڈھارس دے۔"
 "جی میں؟" ان کا دل اچانک ہی گھبرانے لگا۔
 "ہاں ہاں جاؤ!"
 "جی اچھا!" وہ ڈرتے ڈرتے اٹھے اور دوسرے کمرے میں آ گئے۔
 لال کپڑوں میں لمبوس ریحانہ بیگم واقعی رو رہی تھیں۔

"رے۔ حانہ!" انہوں نے زرب لب پر دھا کر کہا۔
 "بھئی جی کیا بات ہو گئی؟" بلا آخر بڑا بے تکلف بن کر پوچھا۔
 "کیا؟" دلن بیگم نے بہت ترخ کر سر اٹھایا اور کچھ دیر فکر کر۔ یوں ان کو دیکھتی رہیں کہ وہ ہی شرما گئے۔
 "کیا فرمایا آپ نے؟"
 "میں نے عرض کیا کہ... کیوں رو رہی ہو بھئی!" وہ تکلف دور نے تکلفی کے چھ لفظے رہے۔
 "بھئی؟" وہ کبھی صاحب! میرا نام ریحانہ ہے اور مجھے اسی نام سے مخاطب کریں تو بہتر ہو گا۔ دو ٹوک بات کی گئی۔
 "اچھا ٹھیک ہے! وہ ڈر گئے۔ "کیوں رو رہی ہو ریحانہ؟"
 "اباں بی کو اکیلا چھوڑ آئی ہوں کیا روؤں بھی نہیں؟"
 "بالکل روؤ" نہیں میرا مطلب ہے بالکل مت روؤ۔ دیکھو تا پہلے تو تم ایک تھیں۔ اب ہم دو ہو گئے۔
 "ہم؟" ہم مل کر ان کی خدمت کریں گے۔ یہ لڑائی پی لڑائی پر رکھا گلاس اٹھا کر انہوں نے اس کو دیا اس نے گلاس اٹھا اور ڈر ڈر کر پیانی پینے لگی۔ اتنی دیر میں انہیں اس کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔
 "بالکل وہی ہو رہی اپنی تصویر جیسی۔" انہوں نے پوچھا۔ "بھئی یہ کیا بات ہوئی۔ انسان اپنی تصویر سے یا تو کچھ اچھا ہو تا ہے یا کچھ برا یہ کیا بات ہے کہ بالکل بھی فرق نہ ہو۔" لگتا ہے کہ تصویر ہی جیسی سے سامنے کھڑا ہو کر رہا ہے۔ حمیدہ بھائی ٹھیک ہی کہتی تھیں "تم از کم آج کے دن تو چشمہ اتار دینا چاہیے تھا۔"
 "یوں کہو کیا رہے ہیں؟"
 "جی! میں سوچ رہا تھا کہ تم ساری ناک تھک گئی ہو نا!"
 "ناک تھک آئی ہو گی؟" اسے بے حد تعجب ہوا۔
 "وہ کیوں؟"

"بھئی اس چشمہ سے انتہائی ناممقول چشمہ ہے بس اتنا دل سے۔" انہوں نے خود ہی بڑھ کر چشمہ اتارنا چاہا۔
 "بھئی جی۔" اس نے بری طرح سے انہیں جھڑکا۔
 "میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ اس معاملے میں کوئی سمجھتا نہیں ہو سکتا میں حقیقت پسند لڑکی ہوں اور ہاں لائٹ بند کروں مجھے نیند آ رہی ہے۔"
 کھیل احمد چند لمحے بے بسی سے بیٹھ رہے۔
 "بڑی ہی کڑک دلن ہے بھئی!" انہوں نے سوچا اور اٹھ کر لائٹ بجھا دی اور باہر نکل گئے۔
 اگلے کئی دن دعوتوں میں گزار گئے۔ کھیل احمد کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا سو ہر روز اور کئی نہ کسی کے گھر دعوت ہوتی۔ بلا آخر ایک دن ریحانہ بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوئی گیا۔
 "بھئی! ابھی تیار نہیں ہوئیں تم؟" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔
 ریحانہ بیگم نے ایک نہایت کھلی ٹھکان پر ڈال دی۔
 "میں نے اتنی بار سمجھایا ہے آپ کو کہ میرا نام ریحانہ ہے اور مجھے اسی نام سے مخاطب کریں۔"
 "بھئی..." وہ گڑبڑا گئے۔
 "کیا بھئی؟" ترخ کر پوچھا۔
 "میں کہہ رہا ہوں کہ بھئی کہہ کر بلائے میں کیا برائی ہے۔ اب دیکھو نا۔ ایسے پیار محبت سے بلانا اچھا لگتا ہے نا!"
 "پیار محبت؟" ان کی توتے جیسی آنکھیں پھیل گئیں۔
 "مگر کروئی آپ نے کھیل احمد اپنی عمر دیکھے اور یہ باتیں دیکھے۔ کوئی سن لے تو کیا سوچے؟ آج کل کیسے ذہنیت ہے آپ کی؟"
 "مگر؟" وہ بالکل بچھو گئے۔ "ذہنیت...؟"
 "میں کہہ رہا تھا کہ تیار نہیں ہوئیں ابھی تک۔" مرید بی سے پوچھا۔
 "میں عاجز آ چکی ہوں! ان روز روز کی دعوتوں

ہے۔ یوں بھی میں ملے مالے کے معاملے میں بہت
تھکا لڑی ہوں۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے اس طرح
منہ اٹھائے ہر ایرے غیرے سے ملے کو بیچنا۔
"لیکن وہ ایرے غیرے نہیں میرے عزیز احباب
ہیں۔" انہوں نے دواواو احتجاج کیا۔ "اور انہوں نے
بڑے چاؤ سے بلایا ہے۔ ہم نہیں گئے تو کیا سوچیں گے
وہ؟"

”سوچیں جو ان کے دل میں آئے“ بے نیازی سے فرمایا گیا۔ ”مجھے تو روز روز ان بھاری کپڑوں سے وحشت ہوتی ہے اور آپ کی اہل ذہن دوست دس من میک اپ بھروسہ کر لیں من زیورات لا دیتی ہیں۔ جیسے نہیں رہندے سب کچھ۔“

”دیکھو مہنی! اوہو۔۔۔ بھانہ“ اتنی پریکٹس کر لی تھی مہنی کہنے کی کہ زبان سے پھسل ہی جاتا تھا۔ ”کج کے“ دن اور تیار ہو جاؤ پھر کل سے معذرت کر لیا کریں گے، پلیز! میری خاطر۔“

”افسوس! پھر آپ نے یہ رفاغیہ کیج دیا۔ سنی
دفعہ سمجھاؤں آپ کو کہ آپ یہ حرکتیں اچھی نہیں
کرتیں۔ وہ بے قرار ہو کر انہی اور ملاری سے کپڑے
فٹانے لگی۔“

فکیل احمد بڑی لاجپاری کی تصویر بنے اسے دیکھتے رہے۔ کتنا شوق تھا انہیں شادی کا کس قدر سوچا کرتے تھے وہ کہ یوں کریں گے اور یوں کہیں گے۔ لیکن رہنجانہ بیگم! حقیقت پسندی کا بوٹا ملی تھیں۔ سب سے بڑھ کر انہیں بات بات پر فکیل احمد کی عمر کا خیال مارے ڈالتا تھا۔ ذرا فکیل احمد رہا انکے ہوئے اور انہوں نے تڑے انہیں عمر کا طعنہ دے دیا۔ فکیل احمد کو بھی سنواری، لالچائی، مسکرائی بیوی کی خواہش تھی اور رہنجانہ بیگم کو ان تمام کاموں سے چر بلکہ نفرت تھی۔ لہٰذا نے بڑے چاؤ سے بری کے جوڑے تیار کرائے تھے لیکن انہوں نے مننے سے قفل ہی سب گھونٹا۔ انہاری لوج لوج کر اتار ڈالا تھا۔ لہٰذا چینی ہی رہ گئیں کہ ”ہائے“ لیکن ”آہ“ ہائے لیکن۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ ایک بار تو تنہا بڑا لالچوچو چا لے سو کرتا۔ لیکن

پوچھو۔
 "کون ہے وہ بچہ؟" اس نے بزاری سے ہاتھ ہلایا۔
 "میں تو بلیکٹ ہوتی ہوں ایسے بھوت بولنے
 میں لن کا بس چلے تو آپ کو چھ برس کا بنا دیں اور
 ہاں یہ اٹنے سے سو سو خیالات نکال دلائیں اپنے ذہن
 سے اور آپ آئیں کیوں نہیں جاتے؟"
 "اے گئے تو چھٹی ٹی ٹی میں نے آئیں سے۔" وہ
 باپ سے بولے۔ "کہ شادی کے بعد ذرا فراغت سے
 ٹھوٹیں پھر جس کے لیکن تم۔"
 "بس تو ختم کیجیے یہ چھٹیاں اور آئیں جو آئیں
 کر رہے۔"
 "پھر کیا؟"

”بیگم کہہ لیا کریں۔ سوہرہ راقظ ہے۔“
 ”بیگم!“ ان کے ہانک احسانات پر حوث پڑی
 ”کتابا کیب راقظ ہے یہ بیگم بھی۔“ وہ سوچتے ہوئے
 وہاں سے اٹھ گئے۔ ”ذہن میں بڑی سولی تازی بھاری
 بھر کر کسی پان چپاتی ہوئی عورت آجاتی ہے۔“ رہنے دو
 بار آئیگم سے تو رہ جانے ہی ہوتے۔“

اور پھر اگلے چند دنوں میں رحمانہ بیگم کے جوہر
دری طرح کھل کر سامنے آ گئے۔ انہیں رحمانہ
شامی، نزاکت، فاطمہ وغیرہ وغیرہ کے کوئی لاکھ نہ تھا۔
انہوں نے عظیم کیسیا میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل
کر رکھی تھی اور سوائے اسے مصیبتوں کے انہیں کسی
شے سے دلچسپی نہ تھی۔ غالباً ان کی پہلی متقی ٹوٹنے
اور پھر دوبارہ نہ جڑنے کا سبب بھی یہی تھا۔

فکلیل احمد کی خریدی ہوئی چند شاعری کی کتابیں اور کچھ
روایتی ٹولہ رکھے تھے جنہیں رحمانہ بیگم نے
بے اعتنائی سے فکلیل احمد کی الماری کے اوپری حصے پر
پھینک دیا تھا۔ ”یہ فضول چیزیں پڑھتے رہے ہیں آپ!
ان ہی کا اثر ہے آپ پر۔“ اس نے فکلیل احمد کو جڑا
بھی دیا تھا۔

”آپ کو معیاری کتب کا شوق ہوتا اور آپ کی ایک بڑی سی لائبریری ہوتی جہاں آپ سے اگر آپ بیٹھا کرتے میں اور آپ کتنوں تحصیل علم کے لیے وہاں بیٹھتے اور بحث کرتے لیکن انفسوس ایک ہی اسے پاس نہ رکھ کر ان باتوں کو مکمل سمجھ سکتا ہے۔ آپ کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ یہ دنیا معرض وجود میں کیسے آئی یہ سورج چاند ستارے درحقیقت کیسے ہیں۔ ان میں سے کون غیر سناکتے سے اور کون سناکتے؟“

”الاحول والا قوۃ۔ کیا فضول ہے یہ سب۔“ وہ کسی کتاب میں ملنے والی بری طرح چٹائی۔
”یہ فضول نہیں ہے مکانہ!“ وہ کچھ تاراض ہوئے۔

"تم بے وجہ کے کیلیکس میں مبتلا ہو رہی رہنا۔"

انہوں نے سمجھا چاہا۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میں کیلیکس میں مبتلا ہوں۔" وہ چڑکی۔ "مجھے کسی بھی قسم کا کوئی کیلیکس نہیں ہے۔ میں بے حد حقیقت پسند لڑکی ہوں۔"

"لڑکی؟" وہ شاید پہلی مرتبہ چرے اور سوچے پر مجبور ہوئے۔ "مجھے چالیس بیسٹائیس سال کا بنا کر خود کو کس دھڑلے سے لڑکی کہتی ہے۔"

"اچھا ایسا کرو۔ کچھ دیر کو بہن کو اور پھر ہر آنگن میں رکھے منکوں پر لیٹ سنا۔"

"منکوں پر؟" وہ حیران ہوئی۔ "کیوں انہیں کیا بیماری ہے؟"

"اوہ۔ اچھے لگتے ہیں اور بس۔"

"مکے اچھے لگیں بھی تو کیا فرق پڑے گا؟"

فکیل احمد زچ ہو کر باہر نکلے اور کچرے باہر گلی میں پھینک دیے۔

لیکن چونکہ فطرتاً سیدھے اور معصوم تھے اس لیے کچھ ہی دن بعد اس کے لیے دھڑ ساری چوڑیاں لے آئے۔

"یہ کیا ہے؟" وہ بے کھوڑ کر اس نے پوچھا۔

"چوڑیاں ہیں۔ دیکھو ذرا کتنی ساری ہیں اور سارے رنگوں میں اچھی ہیں نا؟ اور تم بیوی تو اور اچھی لگیں گی۔ سارے گھر کی فضا کو آج اچھے کی ان کی چھین چھین سے۔"

"مجھے چوڑیوں کا کوئی شوق نہیں! سنجیدگی سے جواب دیا۔ "نہ گھر کی فضا چھیننے کا۔ آپ لال کو دے دیں۔"

"لال کو؟" وہ بھونکے رو گئے۔ "یہ چوڑیاں؟"

لال پٹنیں کی؟

"تو کیا ہوا؟" اس نے ابو چڑھائے۔ "انہیں تو ویسے بھی جھیلے کپڑوں کا، ایک آپ کا زیورات کا بہت شوق ہے۔"

"مہیں کس چیز کا شوق ہے؟" انہوں نے چڑ کر پوچھا۔

"علم کا اپنی ذات سے انکس کائنات کو سمجھے گا۔"

"تھوڑے زمانے تک ابو عورت اپنے شوہر کو نہ سمجھ سکے وہ بھلا کسی اور بات کو کیا سمجھے گی۔"

انہوں نے انہوں سے سر ہلا کر سوچا اور بعد کیا کہ آئندہ وہ اس کے لیے کوئی چیز نہیں لائیں گے۔

بتول خالہ اور لال عمرے کے لیے جاری تھیں دونوں اپنے اپنے فرائض سے فارغ ہو پہلی تھیں اور اب اس "فارغ ابلی" کا مکمل لطف اٹھاری تھیں سو دونوں سیلیوں نے عمو کی لڑائی کا مشترکہ ارادہ کیا تھا۔

"لال! آپ کے بغیر دل اداس ہو جائے گا۔"

فکیل احمد ان کی گود میں سر رکھے لیٹے تھے پاس ہی بتول خالہ بیٹھی رہنا کے سر میں تل ڈال رہی تھیں ورنہ اسے تو سر پر رکھی ہوئی رو بھی کہاں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی جب سر کی خشکی ہلاؤں کی طرف اس کے ارد گرد اڑنے لگی تھیں لال ہی زبردستی ہل کر ایک من تھل اس کے پاؤں میں ڈال دیا کرتی تھیں۔

"کیوں میرے چاند! لال نے ان کے پاؤں میں انگلیاں پھیریں۔" "اب ماشاء اللہ تمہارا گھر آبلو ہے" دل کیوں گھبرائے گا؟ خدا ابو کا دم سلامت رہے اب اسی سے دل لگاؤ اپنا دل پر کب تک تکیہ کرو گے میرا کیا ہے آج ہوں تو کل نہیں۔"

"ایسا تو نہ کہیں لال! ان پر رقت طاری ہوئی۔"

"اچھا چل اٹھ اب۔" انہوں نے پار سے گھر کر انہیں اٹھایا۔ "بس پچھتا رہا ہے اور استغناء ہو گئے شادی کو اتنا نہ ہوا کہ دل میں گھبراہٹ لائے۔"

فکیل احمد نے شادی لگا ہوں سے رہنا کو دیکھا۔

"میں نے تو کتنا ہی کہا لیکن رہنا کو کسی قسم کا شوق ہی نہیں۔"

"ارے بیٹا تم اس کی بات پر کتنے مت دھرا کرو۔"

بتول خالہ نے جلدی۔ "ملا۔ یہ تو بالکل بے پائل۔"

فکیل احمد نے رہنا کی تیز نظروں سے نظر ملائے باہر کھانوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر وقت نہ جانے کون سی منی منی کتابیں پڑھتی رہتی ہیں میں کوئی یاد دہری بات کروں بھی تو اسے ناگوار لگتی ہے۔"

بتول خالہ نے پریشانی سے رہنا کو کھوڑا اور لگاؤں ہی لگاؤں میں کچھ سرزد کی۔

"بیٹا اس کے دل پر تو خشکی چڑھ گئی ہے۔" انہوں نے بیٹی کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "جب یہ پھولتی تھی تاتو اسے ٹائی فائی ہو گیا تھا۔"

"ٹائی فائی نہیں ای! ٹائی فائی ہو گیا تھا۔" پڑھی لکھی بیٹی کو ان کی بات ناگوار لگتی۔

"ہاں ہاں وہی۔ تب ہی یہ چشمہ بھی لگ گیا تھا اس کو۔ جب سے ایسی خشکی چڑھی ہے اسے کہ بس کتاب کا کیر لین کر رہی تھی۔"

"کف کس قدر بے کار دیکھ رہی ہے ای! رہنا کو سخت الجھن ہوئی۔ "ٹائی فائی تو ایک بیماری ہے ٹھیک ہو گئی۔ کتابوں کا اس سے کیا تعلق؟"

"ٹائی فائی! یہ تمہارے دل کی خشکی ہی تو ہے کہ دنیا کے سب سے میں تمہارا دل ہی نہیں لگا۔" لال نے سبلی کی بھر اور آئینہ کی۔ "ورنہ یہ دن تو کھوٹے پھرے بنے ہوئے کے ہیں" ان دنوں میں کنکوں کا کیا کام۔ تم جانتیں نہیں ان ہی موڈی پتھریوں میں بلا میں چھپی ہوئی ہیں جو ایک بار پتھر لیں تو جان میں پھوڑیں۔ میں کل ہی مولانا صاحب سے توبہ لادوں کی تمہارے لیے۔"

"الف لال کیا جاسے نکلی باتیں ہیں سب۔"

جاہلانہ کہتے کہتے رنگ مٹی تھی۔ "جب ہی تو تعلیم کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے تعلیم سے ہی ہمارے ملک کی عورتوں کی آنکھوں پر پڑے ہوئے یہ پردے ہٹ سکتے ہیں۔"

"تو کیا ہم سب باہل ہیں؟ بے وقوف اور جاہل ہیں؟"

لال کو سخت برا لگا۔ "ہم نے دنیا دیکھی ہے لی بی! اور اتنا تو ہمارا تجربہ ہے جتنی تمہاری عمر بھی نہیں ہے۔ یہ سب دین سے دور رہنے کا نتیجہ ہے تم نماز پڑھا کر

دل میں!"

"الف لال! اب یہ دل میں دل میں کتنا چھوڑ دیں۔"

رہنا بیزار ہو کر وہاں سے اٹھ گئی۔

"کتنا عجیب محسوس ہوتا ہے۔"

لال بے چاری طر کر اسے دیکھتی رہ گئیں بتول خالہ شرمندگی سے تجلیہ کرتے لگیں اور فکیل احمد نے ٹھنڈا سا اس کے گرد بارہ اپنا سر لال کی گود میں رکھ دیا۔

لال اور بتول خالہ چلی گئیں تو فکیل احمد کو گھر کاٹنے کو دوڑنے لگا۔

رہنا پہلے تو لال کا خیال کر کے کچھ بات وغیرہ کر بھی لیتی تھی لیکن اب تو اس نے ان کو بالکل ہی نظر انداز کر ڈالا تھا۔ انہوں نے ہر جتن کر ڈالا تھا کہ وہ کچھ رام ہو جائے ان کے ساتھ شے بولے باہر نکلے کھوٹے چمے لیکن اس نے فکیل احمد کی ہر کوشش کو ان کی عمر کا طعنہ دے کر کامیاب ڈالا تھا اور فکیل احمد غریب نہیں کے اس طعنے پر دل مسوس کر رہ گیا کرتے شادی سے پہلے انہیں آکھینے وغیرہ کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ بس شہید ہاتے وقت ہی دیکھتے تھے لیکن اب وہ صبح شام بغیر خود کو آکھین کی نظروں سے کھو جا کرتے کہیں کوئی جھری یا شبنم ہو ایک آدھ دانت کم ہو یا باجی چھ سفید بال ایک ساتھ کہیں سے جھلکے ہوں۔ لیکن پیشہ وہ خود کو مطمئن ہی کرتے۔

"نہیں بھئی۔ ایسی تو کوئی نشانی نہیں بڑھاپے کی۔ بس ٹھیک ٹھاک ہی ہوں۔ لیکن یہ رہنا۔" وہ ٹھنڈی آؤ بھر کر رہ جاتے۔

دن بھر یا تو نشوں اور آئن اسٹائن کے قوانین پر غور کرتی رہتی یا پھر چپ چاپ پھوٹے موٹے کاموں میں لگی رہتی۔ فکیل احمد اگر خود سے اسے مخاطب کرتے بھی تو جواب میں عجیب لطفیانہ گفتگو سنتے مثلاً۔

"دیکھو بی! افلاس قدر خوشگوار ہو رہی ہے۔"

"آپ کو پتا ہے فکیل احمد! او دن کی تہ تیزی سے کم ہو رہی ہے۔"

"کیا کم ہو رہی ہے؟" وہ بات کا عجیب و غریب

جواب کار کا اپنے سے پوچھتے۔

"نچ! رہنے دیں۔" وہ بیزار سے کہتی۔ "کیا سمجھاؤں آپ کو؟"

"ہنی! تم اس قدر مختلف کیوں ہو؟"

"جلیبے کج آپ کو اتنا برا تو چل گیا کہ میں دوسروں سے مختلف ہوں اس لیے اب آپ میرے رویے کی شکایت چھوڑ دیں۔ میں دوسری فضول قسم کی عورتوں میں سے نہیں ہوں مینیمیں سوائے شوہر کے آگے پیچھے پھرنے کے کوئی دوسرا کام اگر ہو تو کام گلوج اور چننا پانا ہو گا! اچھ! مخلوق ہیں یہ عورتیں بھی۔" وہ ہلکی سی جھرجھری لے کر کشتی اور کھیل اٹھ کر بے چارگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

سوا سی دھک کے ساتھ وہ ایک دن افکار کی طرف چلے آئے۔

"کوہو! ہو! ہو! افکار نے انہیں بھیج کر پر زور استقبال کیا۔" "تجربا دوں کو خیال آتی کیا ہمارا۔"

"ایسی بات نہیں۔" وہ پچھلی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولے۔ "خیال تو ہمارا روزی آتا ہے۔"

"مگر موقع آج ملا ہے۔" افکار نے ان کی بات کاٹنی۔ "ظاہر ہے، ہمیں ظاہر ہے۔" "نی تو ملی دین بیکم کے آگے یہ افکار بے چارہ کیا اہمیت رکھتا ہے؟"

"چھوڑو یار! وہ دھمی سے بولے۔ "کچھ اور بات کرو۔"

"کیا بات ہے بھی کھیل میاں! افکار نے انہیں بغور دیکھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔" وہ زبردستی ہنسے۔ "طبیعت کو کیا ہوتا ہے؟"

"نزلتی ہو مٹی بھابھی ہے؟ پر اتنی جلدی!"

"وہ سچی ہی کب ہوئی تھی جو لڑائی ہوئی! وہ سر جھکا کر بولے۔

"کیا مطلب؟"

جواب میں انہوں نے ساری داستان زلفنا ڈالی۔

"افکار! وہ بیوی نہیں بس ایک سائنسی ایجنٹ ہے یا اخبار ہے خبروں سے بھرا ہوا۔ سیاسی خبریں۔ مسئلے

مسائل سے بھرا ہوا اخبار۔"

"لیکن کھیل میاں! اخبار میں تو سپورٹس کا صفحہ بھی ہوتا ہے۔ فلم کا بھی اور۔ اور آکا کا مقلی خبریں بھی۔"

"وہ ایک ایسا پورا اخبار ہے جس میں یہ آکا کا خبریں بھی نہیں ہیں۔" انہوں نے افسردگی سے بتایا۔

"اپنا! افکار کو تعجب ہوا۔

"ہاں! افکار! میں نے ہر کوشش کر ڈالی اسے ٹھیک کرنے کی۔ کیا کیا جنن نہ آزمائے پر سب بے سود۔

میں اس کے لیے مجھے لانا ہوں تو وہ انہیں پائیر حنا تو کیا دیکھنا تک گوارا نہیں کرتی چوڑیاں لائیں تو ہتی ہے لال کو دے دیں! اب تم سوچو! لال اور رنگین

چوڑیاں لگا دو! ولا تو۔" فلم کے ٹکٹ لایا تو بی بی میرے سر میں درد ہے کسی دوست کو لے جائیں۔ چشمہ

اتارنے پر وہ تیار نہیں حالانکہ میں نے اسے لینس ہوا کر دینے کی پیشکش بھی کی، لیکن بقول اس کے کہ وہ

ایک حقیقت پسند لڑکی ہے اگر نظر کنزور ہے تو دنیا سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے میں اسے خوب صورت

شعر سننے کی کوشش کروں تو وہ مجھے اگل اور کھکا ہوا قرار دے کر جواب میں یہ بتانے لگتی ہے کہ شاعر اور

انسان میں کیا کیا باتیں مشترک ہیں۔ وہ خود کو لڑکی اور مجھے بوڑھا بتاتی ہے۔ اسے اپنی بوڑھائی پر ناز ہے اور

میرے ایک ایسی ٹکڑک ہونے پر شرمندگی۔ وہ رو دیتے کو ہو گئے۔

"افسوس۔" افکار نے سر ہلایا۔ "عجب خاتون ہیں۔"

"اسلام علیکم کھیل بھائی! ہاتھ میں چائے کی ٹرے اٹھائے حمیدہ اندر داخل ہوئی تو بی بی شریہ

مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔ "رحمانہ بھابھی کو نہیں لائے یہ کیا بات ہوئی؟"

"وہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" انہوں نے چہرے کو شاش بنانے کی کوشش کی۔

"ناچھا! طبیعت تو آپ کی بھی بنا ساز لگتی ہے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کیا بات ہے اتنے افسردہ

کیا ہیں؟"

کیا ہیں؟"

"نہیں نہیں تو۔" وہ بے ساختہ ہی ہنسنے لگے۔

حمیدہ وہیں بیٹھ گئی اور اوپر اوپر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ دل ہل میں جواب دیتے رہے اور افکار گہری سوچوں میں ڈوبا پڑا۔

"بھئی! بی بی! حمیدہ نے بڑے لاڈ سے افکار کو مخاطب کیا۔ "تو کھینچے آپ کے دوست کتنے او اس لگ

رہے ہیں۔ شاید یہ رحمانہ بھابھی کی غیر موجودگی کا نتیجہ ہے اور آپ بھی خاموش بیٹھے ہیں کوئی لطیفہ چٹکار

ہی سنا کر۔"

"مجھے کس جگہ لطیفے آتے ہیں۔" اس نے جان چمڑانے کو چائے کی پیالی اٹھائی۔

"جلیبے میں ہی سنائی ہوں ایک لطیفہ! غور سے سنئے گا کھیل بھائی آج ہی پرہا ہے۔ تو ایک شوہر نے بڑے

فصیحے کے عالم میں اپنی بیوی سے کہا۔ یہ چائے پانی ہے؟ ایسی ہوتی ہے چائے؟ ساری چینی نیچے بیٹھی ہے اور

چونے ٹیکس اوپر تیر رہی ہیں!"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" پر دھمی لکھی بیوی نے اسے سے بولی۔

"یہ تو سائنس اصول ہے کہ ہماری چیز بڑھ جاتی ہے اور ہلکی چیز گھٹتی لگتی ہے۔"

لطیفہ سنا کر وہ خود ہی زور سے فحس دی۔ کھیل اٹھ کر لفظ سے متعلق جھانکنے لگے۔ حمیدہ کو یقیناً "چھپ کر

باتیں سننے کی عادت بھی تھی۔ اور ان کی داستان سے کھل حفظ افکار کو انہیں چھیڑ رہی تھی۔

"ہونہ! یہ بھی کوئی لطیفہ ہے۔" افکار نے شرمندگی سے سر جھکا۔

"تو اور کیا ہے؟" اس نے افکار کو گھورا۔ کوئی

وہ نے دلی بات بھی نہیں جو آپ یوں منہ بنا کر بیٹھ گئے اور سنا نہیں کھیل بھائی! وہ دوبارہ ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔ "رحمانہ بھابھی راضی ہوئیں چشمہ اتارنے

کا۔"

"کمال ہے عجب عورت ہیں۔" وہ پیر وائی۔

"انہیں کوئی شوق ہی نہیں ہے اچھا نظر آنے کا؟"

"کیا معلوم؟"

"تب دیکھئے نا کتنی جھانپیں ہیں ان کے چہرے پر۔ انہیں شاید اس کی بھی پروا نہ ہو۔"

"کیا ہیں؟" وہ چونکے۔

"جھانپیں! نشانات! کتنے بد فرما معلوم ہوتے ہیں۔"

"اچھا! رحمانہ کی جگہ وہ شرمندہ ہوئے۔ "پھر کیا کیا جائے ان کے لیے؟"

"مجھے ایک اچھی سی کریم کا نام معلوم ہے مگر رحمانہ بھابھی استعمال بھی کر رہی ہیں!"

"نہیں نہیں بھائی! آپ مجھے لکھ دیں۔ میں کون گا اسے استعمال کرنے کو۔"

"جی اچھا۔ جاتے وقت لکھوا لے جائیے گا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

پھر جلیبے وقت انہوں نے واقعی کریم کا نام لکھوا اور راستے میں آتے ہوئے میڈیکل اسٹور سے خرید کر گھر لے آئے۔

"بھئی! بی بی! بوجھ تو کیا اسے ہیں تمہارے لیے۔" بڑے خوش خوش وہ اندر داخل ہوئے۔

"پھر کچھ لے آئے! وہ پیر وائی۔ "اب کیا افکار لائے؟"

"یہ کچھ زرد۔" انہوں نے کریم اسے تھمائی۔ "بھابھی کتنی تھیں کچھ دن کے استعمال سے فرق پڑے گا۔"

"کس سلسلے میں؟" اس نے بڑی تکیجی نگاہ اٹھائی۔

"یہ جو پر چھانپیاں ہیں نا تمہارے چہرے پر سب مٹ جائیں گی۔" انہوں نے دانت نکالے۔

"یہ آگہی کی پر چھانپیاں ہیں کھیل احمد! اس نے کریم ڈرنگ ٹیکل برڈل دی۔ "فلم سے پیدا ہوئی ہیں آپ کیا جانتیں ان کی قدر۔"

"فلم کا ان داغوں سے کیا تعلق؟" وہ پریشان ہوئے۔

"کون سے داغ؟ وہ اچھا۔ تو یہ بات ہے مجھے ان داغوں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" اس نے کندھے

اچکائے۔ یہ کریم آپ استعمال کر لیں۔“
 فکیل احمد چیخ و بلب کھا کر رہ گئے۔ اسی وقت دروازہ بجا اور وہ ایک زخمی نگاہ اس پر ڈال کر دروازے کی جانب بڑھ گئے۔
 ”السلام علیکم!“ باہر جوڑی کھڑی مسکرا کر ان سے مخاطب ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ چند لمحوں پہنچو والی جھلاہٹ اور کوفت کو بھول گئے۔
 ”وعلیکم السلام!“ بڑی گرم جوشی سے جواب دیا۔
 ”رہخانہ باقی ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔ میں کزن ہوں ان کی۔“
 ”اوہ اچھا اچھا۔ باہر کیوں کھڑی ہیں آپ آئیے نا!“ انہوں نے لپک کر اس کا ہیک اٹھالیا اور اسے اندر لے آئے۔
 ”رہخانہ بھی دیکھو تو کون آیا ہے۔ تمہاری کزن آئی ہیں بھی۔“
 رہخانہ اندر سے نکلی تو وہ ٹوکی چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔
 ”ہائے رہخانہ باقی! مبارک ہو بہت بہت۔ آخر بسا ہی آیا نا۔“
 ”کوئی شرم!“ رہخانہ نے اس گرم جوشی کا کوئی خاص جواب نہ دیا۔ ”کب آئیں؟“
 ”ابھی تو آئی ہوں۔ پہلے آپ کے میکے گئی تھی لیکن بتول خاتہ میں نہیں۔ تیار ہوا تھا دروازے پر وہیں بڑوس سے ایک لڑکے کو لیا ساتھ مجھے کیا خبر تھی آپ کی سسرال کہاں ہے؟ شادی میں کہاں آپائی تھی میں۔“
 ”دفتری دن بعد آئی ہو؟“ رہخانہ نے اس کے ہیک پر نگاہ ڈالی۔
 ”جی ہاں! میرا سفر جو ہو گیا ہے یہاں۔ اب کچھ عرصہ آپ کے پاس رہوں گی پھر ہاٹل وغیرہ شقت ہو جاؤں گی۔ یہ وہ لہما بھائی ہیں نا! اس نے ایک شرر نگاہ فکیل احمد پر ڈالی۔
 ”ہوں۔“ رہخانہ نے کما اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”میں کھانے وغیرہ کا بندوبست کر لوں تم ان سے

باتیں کرو۔“
 ”میرا نام شمسہ ہے اور آپ کا نام؟“ جو تے آثار کر اس نے بے تکلفی سے اس کو پوچھ لیا۔
 ”فکیل احمد!“ وہ مسکرائے اور کرسی کھسکا کر اس کے قریب بیٹھ گئے۔
 ”میں اسکول میں پڑھاتی ہوں اور آپ؟“
 ”میں میں بھی ایک آفس میں ملازم ہوں۔“
 ”ہماری بھائی کیسی لگتی ہیں آپ کو؟“ اس نے شرارت سے آنکھیں کھائیں۔
 ”جی؟“ تھی ہیں۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔
 ”بالکل نہیں۔“ وہ مسکرائی۔
 ”جی؟“ وہ حیران ہوئے۔
 ”بہت اچھی ہیں۔“ وہ ہنس دی۔ ”صرف اچھی سے کام نہیں چلے گا لہما بھائی!“
 ”جی ہاں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔
 اور پھر شمسہ کے آجائے سے فکیل احمد کی زندگی میں جیسے انقلاب آیا۔ وہ ایک بے حد مذہب و دل نہیں کہہ لور زندگی سے بھرپور لگی تھی۔ ہنسی مروت اس کے لبوں سے مختلف بھجروں کی طرح چھوٹی رہتی تھی۔ صبح اسے اسکول جانا ہوتا تھا اس لیے وہ فکیل احمد کے ساتھ ہی گھر سے نکلتی تھی۔ واپسی پر بھی دونوں ایک ساتھ لوٹتے تھے۔ ہائی کاسار اور وہ مسلسل پڑ پڑ لوتی رہتی۔ رہخانہ تنگم تو اسی بے اعتنائی سے ہوں ہاں کرتی رہتیں۔ جبکہ فکیل احمد اس کے ساتھ جیسے زیادہ بولنے کا مقابلہ شروع کر دیتے وہ تمام فرمائشیں جو فکیل احمد رہخانہ کی زبان سے سننے کے منتظر تھے اب وہ ان سے کیا کرتی۔
 ”فکیل بھائی! اس وقت تو برائی کھانے کا موڑ ہے اور رہخانہ باقی نے بتائی ہے مسور کی وال۔ بس بتائیں بھلا وال اور برائی کا کیا مقابلہ؟“
 ”میں ابھی لے آتا ہوں برائی۔“ وہ جھٹ اٹھ کھڑے ہوئے۔
 بھی بیٹھے بیٹھے اسے شمسہ پان کا بیوت سوار ہو

ہاں۔ فکیل احمد فوراً جن کی طرح حاضر۔
 ”فکیل بھائی! دیکھیں نا کتنی اچھی فلم مکی ہے۔“
 ”جی میں۔“ آج تو چھٹی تھی ہے اور موسم بھی اچھا ہے۔“
 ”ہاں!“ رہخانہ جانے کس خیال میں تھی۔ ”کیا“
 ”میں کہہ رہی ہوں آج سینما چلتے ہیں فلم دیکھنے۔“
 ”فکیل بھائی؟“
 ”گفتے ان کو؟“ وہ جھٹ تیار۔
 ”اول ہوں۔ اسی وقت لے لیں گے تیار ہو جائیں رہخانہ باقی!“
 ”نہ بھی۔ یہ فضول شوق میں نے نہیں پایا۔ تم ہوا اپنے بھائی کے ساتھ آکر موڑے تو“ فکیل احمد نے باہر سے شمسہ کو کھلے۔
 ”تیار ہو جاؤ فکیل بھائی؟“ اس کے جھٹے نے انہیں جیسے نئی زندگی دے دی۔
 ”ہاں ہاں بالکل۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”راہی میں تمہیں پکرن سوپ پلاؤں گا بڑوست قسم“
 ”ہاں جی!“ وہ چیخ مار کر تیار ہوئے بھائی اور پھر اس کے ساتھ فلم دیکھتے ہوئے اور سوپ کھاتے ہوئے بیٹھا پان چاہتے ہوئے، فکیل احمد جیسے بالکل نئی دنیا میں پہنچ گئے۔
 انہیں اسی کی تلاش تھی۔ جانے کب سے کتنے سالوں سے وہ اسی کو کھوج رہے تھے اور وہ جیسے انعام لرا کر لوٹاں تک آ پہنچی تھی۔

 ”ہاں! ابھی ناشالا۔“ وہ پورے ہی ہے۔ انہوں نے کھانا کھا لیا۔
 ”فکیل بھائی! میں بھی آ رہی ہوں۔“ پٹپٹا کے آ رہی تھی۔ وہ ریڑ پٹ لگائی ہوئی شمسہ ایک سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے بولی۔ ”کیس پھوڑ“
 ”کیا دیکھتا ہے بھلا؟“

”ہاں ہاں جلدی آجائے۔ ناشالا بھی کر لو۔“
 رہخانہ نے ناشالا ان کے آگے رکھتے ہوئے فوراً سے انہیں دیکھا اور وہیں کرسی کھینٹ کر دھوپ میں بیٹھ گئی۔
 ”ہاں بھی رہخانہ باقی!“ شمسہ آکر فکیل احمد کے برابر بیٹھی اور احمد کی پٹپٹ اپنے آگے کھینٹ کر شرارت سے رہخانہ سے مخاطب ہوئی۔ ”سورج کی گرمی سے ہم کون سا دماغ حاصل کرتے ہیں؟ ڈائریکٹ؟“
 رہخانہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جیسے اندازہ لگا رہی ہو کہ وہ واقعی شمسہ ہے یا اس کا خدایا ڈاڑھی ہے۔
 ”دماغن ڈی۔“ اس نے مسرت سے کہہ کر دوبارہ گردن موڑ لی۔
 شمسہ زور سے ہنس دی۔ فکیل احمد نے خوش ہو کر اس کا بھرپور ساتھ دیا۔
 ”رہخانہ باقی! اندر آجائیں۔ کیس دماغن ڈی کے چکر میں کینسر کے جراثیم تل جائیں گی خانی میں زیادہ دیر دھوپ میں بیٹھنے کا نتیجہ۔“ شمسہ کھنکھناتے ہوئے بولی۔
 رہخانہ اٹھی اور ان دونوں کی جانب دیکھے بغیر سڑ سڑ کرتی پکرن کی طرف چلی گئی۔
 ”بھئی شمسہ! تم بولتی بہت اچھا ہو۔“
 ”اللہ فکیل بھائی! آپ مجھے شعی کہہ لیا کریں۔“
 ”مجھے اپنا نام بڑا عجیب سا لگتا ہے۔“
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمہیں پسند ہے تو شعی ہی کہوں گے۔“
 ”جی!“ وہ ہاتھ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”فکیل احمد!“ سوئیٹر پہنی رہخانہ اچانک ان سے مخاطب ہوئی۔
 ”ہوں کمو۔“
 ”آپ جانتے ہیں انسان خوابوں میں کیا دیکھتا ہے؟“



”کامل ہو؟“ مہمان آواز کے مخاطب کرنے پر کومل نے مڑ کر دیکھا اس کی سیٹ کی پشت سے بڑی سیٹ پر بیٹھی جہاں دیدہ عورت نے پوچھا تھا۔ چالیس سالہ عورت کی گود میں کسمن پپر سیا ہوا تھا سانس والی سیٹ پر اس کا ساتھی ”نٹھ سالہ بیٹا اور نو دس سالہ بیٹی دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔“

”جی۔“ بیٹھ کر اس کے منہ سے نکلا۔ اس عورت کے مخاطب کرنے پر اسے سست حوصلہ ملا تھا۔

”زمانہ ٹھیک نہیں، اگلی عورت کو سفر نہیں کرنا چاہیے۔“ ادباًش سے لڑنے کے جس نے کھانوں میں پانی پینی ہوئی تھی اسے کچھ ایسے لمبے میں لگا کہ خوف کی ایک لہر کومل کی ریڑھ کی ہڈی میں رینگ گئی اور اس کے پیچھے بھی عورت نے بھی منہ پھیر لیا۔

کومل ڈری سہمی بیٹھی تھی، بے حد خوف زدہ۔ وہ ادباًش دھیمی آواز میں کچھ گنگناٹے ہوئے چو گم چہا رہا تھا۔ کوئی اسٹیشن آنے والا تھا، ریل کی رفتار آہستہ اور سستی تیز ہو رہی تھی۔ کومل دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ اس اسٹیشن پر یہ پالی والا اتر جائے اور اس کی جگہ وہ بازگ سی بیٹی بیٹھ جائے جو کھڑے کھڑے تھک گئی تھی اور برتھ کی سیڑھی سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ اس کی دعا الو حوری قبول ہوئی۔ اسٹیشن پر گاڑی رکی، مسافروں میں یکدم ہلچل مچ گئی۔ کچھ مسافر اترے اور ان کے ساتھ وہ پالی والا بھی اتر گیا۔ کومل نے سکھ کا سانس لیا۔ دھکم پیل کرتے ٹرین میں چڑھتے مسافروں اور اترنے والوں کا شور تھا۔ کللی بیٹھ شرٹ میں ملبوس ایک امارت سانہ جوان مجلت کے ساتھ آیا

اور خالی سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے اس نے سامنے نظر ڈالی۔

”سیٹ خالی ہے کس؟“ اس نے منہ بند انداز میں جھٹکتے ہوئے پوچھا۔ جیسے وہ بیٹھنے یا نہ بیٹھنے کا فیصلہ نہ کر لیا ہو۔ کومل کی جان میں جان آئی، وہ ایک سلجھا ہوا انسان لگ رہا تھا۔

”جی۔“ کومل نے فوراً کہا۔ وہ اب پر سکون محسوس کر رہی تھی۔ نو جوان سیٹ پر بیٹھ گیا اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا بیگ سیٹ کے ساتھ نکال لیا۔ کومل نے المیہ منان کا ایک لمبا سانس لیا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ جہاں لوگوں کا جھوم تھا۔ آتے جانے والوں کی بھیر تھی۔ آفریقی مسافر مجلت میں ٹرین پر سوار ہو رہے تھے، کچھ بے زار بیٹھ چکے تھے، اپنے اپنی ٹرین کے انتظار میں تھے۔ چائے کے کھوپڑے پر رش تھا، کچھ کچے سڑے پھلوں کی ریڑھی پر لٹکاؤ کا عورتیں موجود تھیں اور سکرٹسٹان کی بوکلن پر کھڑا پالی والا سکرٹ کا پیکٹ لے کر پیسے دیکھن وار کودے رہا تھا۔ کومل نے فوراً اس منظر سے نظریں ہٹائیں۔ سامنے والا نو جوان جھجکا ہوا بیٹھا تھا اور کومل کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

کھڑی ہوئی عورتوں میں سے کوئی اب نظر نہیں آ رہی تھی یا تو وہ اتر گئی تھیں یا کسی اور ڈبے میں انہیں جگہ مل گئی تھی۔ مزالبتہ اسی طرح کچھ کچھ کھڑے تھے، ان میں کچھ نے شامل ہو گئے تھے، کچھ اس اسٹیشن پر اتر گئے تھے۔ سبکی گئی اور ٹرین نے دھیرے دھیرے پنڈی پر سرکنا شروع کیا۔ جھانکتے ہوئے کچھ لوگ ڈبے کے دروازے سے داخل ہوئے۔

”اگر سر سرکار؟“ کومل نے چونک کر پالی والے کی کواڑ سر اٹھایا اور اس کی تو جان ہی نکلی گئی۔ وہ بیان نہ دے پڑے درشت لمبے میں سیٹ پر بیٹھے نو جوان سے مخاطب تھا جو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”پالیو! شلباش۔“ پالی والے نے چنگی جھانکتے ہوئے انتہائی جنگ آہیزہ میں کہا۔

”جی؟“ نو جوان چہرے پر تڑپا تھا۔ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی اس کا چہرہ لہجہ۔

”میری سیٹ ہے سرکار۔“ سکرٹسٹان لینے گیا تھا میں۔“ پالی والے نے اس کی مشکل آسان کی۔ اس کا منہ پان کی پھلکی کر رہا تھا اور نظریں بار بار کومل کی طرف اٹھ جاتیں جو مضطرب بیٹھی انگلیاں چٹکار رہی تھی۔

”اگر سواری۔“ نو جوان شرمندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک بار اس نے کومل کی طرف دیکھا جیسے شکاریت کر رہا

ہو کہ کومل نے اس سے جھوٹ کیوں بولا کہ سیٹ خالی ہے۔ کومل اس سے نظریں ملا نہیں سکی۔ وہ تو یہ ہی سمجھتی تھی کہ پالی والے کا اسٹیشن آگیا ہے اور وہ ٹرین سے اتر گیا ہے۔ مگر یہاں چہا تا وہاں آگیا تھا۔

”بتایا نہیں اسے نہیں بیٹھا ہوں اس سیٹ پر؟“ پالی والے نے سیٹ پر بیٹھے ہوئے بے تکلفی سے کومل کو مخاطب کیا۔ یوں جیسے برسوں کی جان پہچان ہو، بلکہ یوں جیسے عمر بھر کا ساتھ ہو، بلکہ یوں جیسے وہ دونوں جیون سا بھی ہوں۔

کومل ہونٹ سمجھ کر رہ گئی۔ اس کے لب نہیں چلے۔ برتھ کی سیڑھی سے ٹیک لگائے کھڑا نو جوان بھی جھینپا ہوا کھڑا تھا کومل کو لگا وہ اس سے ناراض بھی ہے کہ گریوں کومل نے اس سے غلط بیانی کی۔ پالی والے نے کومل کا جواب نہ پا کر ہونٹ سکڑے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی تھی۔ پان چہا تے چہا تے اس نے جیب سے سکرٹ کا پیکٹ نکالا، سکرٹ ہونٹوں

<http://pakistanplace.com>



میں دیکر عجیب نظموں سے کومل کو دیکھا لاہور کا شعلہ
 نکلا، مسکرت ساگ۔ کان میں ہلانی والے نے مسکرت کا
 ایک طویل کش لیا اور بظاہر گھڑکی سے باہر دھواں
 پھینکا مگر کومل کا سارا چہرہ اس دھوئیں میں گم ہو گیا۔
 دھوئیں سے زیادہ بے چارگی کے احساس نے اس کی
 آنکھوں کو گھبرا دیا۔ ریل گاڑی مسافروں سے بھرا ہوا
 تھا، مگر کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اس بد تمیز کو
 اس گھٹیا حرکت سے باز رکھتا یا کم از کم لوگ ہی دیکھتے۔
 اپنی لمبی آنکھوں کو پھپھانے کے لیے کومل نے پرس
 میں سے سیاہ چشمہ نکل لیا، شاید وہ اپنی بے بسی چھپانا
 چاہ رہی تھی۔

”مسکرت شد۔ دیر۔ پلین۔“ نوجوان نے
 کھانسنے ہوئے ہلانی والے سے کہا۔
 ”کیوں؟“ ہلانی والے نے ایک اور لمبا کش لیا۔
 ”باہر لیٹتے۔“ دائیں ہاتھ والی سیٹ پر بیٹھی عمر
 رسیدہ عورت نے ناک پر چادر کا پلور کھینچے ہوئے کہا۔
 ”کیوں؟ یہاں کیا پینول چمڑکا ہوا ہے؟“ انتہائی
 گھٹیا لہجے میں اس نے بد تمیز سے کہا۔ عورت چپ
 ہو گئی۔

”سبب ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔“ نوجوان نے پھر
 ہلکی سی مزاحمت کی۔
 ”کیا ہو رہے ہیں؟ تجھے بڑی تکلیف ہے۔“ ہلانی والا
 یکدم ہستے سے اٹھ کر کومل کا دل دھک دھک کرنے
 لگا۔ اسے لگا وہ اٹھ کر نوجوان سے ہاتھ پائی شروع
 کر دے گا۔ نوجوان کو بھی شاید اندازہ ہو گیا کہ بے کار
 ایک چالور سے سر کھپا رہا ہے جسے اپنی عزت کا خیال
 ہے نہ دوسروں کا۔

”عجیب عجیب فیشن ہیں آج کل لوگ رات کو بھی
 کالی تنیک لگا لیتے ہیں۔“ ہلانی والے نے بظاہر کومل میں
 بیٹھے گئے شخص کو مخاطب کیا جو کن انکیوں سے سن
 گھاسر والی کومل کو دیکھ رہا تھا۔ کومل اس فقرے کی کٹ
 سے سلگ کے رہ گئی۔ ”مٹھا کھیلانی سی ہنسی ہنسی پالی
 والے کا منہ بیان چپا رہا، مسکرت پھوٹتا اور دھواں

اڑا رہا۔ کومل پہلو بدلتی رہی، مسکرت و شہوار ہو تا جا رہا
 تھا۔ وہ بے شمار لوگوں کے درمیان بیٹھی تھی اور اسے
 محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تنہا ہے۔ اتنے بڑے جھوم میں
 اکیلی ہے۔ ڈبے میں صرف وہ ایک مجبور لڑکی اور دوسرا
 وہ وحشی۔ اگلا اسٹیشن آیا اور نوجوان اپنا بیگ اٹھائے
 غلبت کے ساتھ نیچے اتر گیا۔

کومل کو لگا کہ ایک کمزور سارا بھی اس کا ساتھ چھوڑ
 گیا ہے۔ ہلانی والا بھی مسافروں کے ساتھ اتر اور کومل
 کا بھی جی چاہا کہ وہ نیچے اتر جائے اور اس سیٹ کی
 بجائے کسی اور ڈبے میں کسی اور سیٹ پر بیٹھ جائے مگر
 اس ڈبے میں کھڑے مسافروں کی لپکتی ہوئی نظروں کو
 دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ کب سے
 کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ کوئی غلی سیٹ انہیں مل
 جائے مگر ان کی خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی۔

کومل نے گھڑکی سے جھانکنا پلیٹ فارم پر بھی لوگوں
 کا جھوم تھا جو کسی بھی طرح تین میں سوار ہونے کے
 لیے بے تاب تھے۔ کومل نے اپنی سیٹ میں چھوڑی
 تھک کر آنکھیں موند لیں۔ ”کومل! کچھ کچھ“ ٹرین
 اگلے اسٹیشن کے لیے چل پڑی تھی۔ کومل کا ستر بہت
 طویل تھا۔ آنکھیں بند کیے وہ سیٹ کی پشت سے سر
 دیکھے ہوئے تھی۔

دسمبر کی۔ شب آخر۔ نہ پوچھو کس طرح گزری
 ہمیں ہر بل۔ یہ لگتا تھا کہ وہ کچھ پھول نیسے گا
 ہلانی والے نے اٹھتے ہوئے بے شکل شعر مکمل کیا۔
 کومل نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ سامنے سیٹ پر
 ناگہم ہر ناگہم جھانک رہا ہلانی والا بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں
 چھوٹی سی ایک کتب تھی۔ ”نئے سہیل کے عشقیہ
 اشعار۔“ جسے کھولے وہ شعر پڑھ رہا تھا اور اس کی
 نظریں کتاب کے صفحوں سے زیادہ کومل کے چہرے کو
 پڑھ رہی تھیں۔ ”یقیناً“ وہ اسٹیشن پر کسی بک لاشاک
 سے وہ کتب خرید کر لایا تھا اور اب آتے وہ اشعار کومل
 کو سناتے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اور اذیت تھی جو

کومل کو اس سفر میں برداشت کرنا تھی۔ اس کی منہل
 اہلی بہت دور تھی اور لگاتار یہ تھا کہ وہ جنگلی بھی اسی
 کے شہر کا پاسی ہے۔ یہ ساتھ جلد چھوٹے والا نہیں
 تھا۔

”دسمبر کی شب آخر۔ نہ پوچھو کس طرح
 گزری۔“ اسی ہی زندگی میں۔ کچھ نہ بھولنے والی شب
 ہوئی، سہیل کی آخری شام، ایک ایسا سفر جو کبھی میں نے
 سوچا نہ جس کی کبھی خواہش کی۔ کومل نے سوچا۔

پہلے بھی اسے کئی ایام کا سامنا رہا تھا مگر آج کے
 اس سفر نے اسے جو کڑواہٹ چھکادی تھی زندگی ایسے
 ہی ایک سفر کا نام ہے جس میں بے شمار لوگ ملتے ہیں،
 اچھے اور برے، کچھ کا ساتھ مل بھر کے لیے رہتا ہے،
 کوئی ایک اسٹیشن ساتھ چلتا ہے، کوئی دوسرے
 تیسرے پر جبکہ بدل لیتا ہے۔ بہت کم منہل تک ساتھ
 دیتے ہیں۔ اس سفر وہ کسے میوہ الزام گھرائی، یہ
 مصیبت اس نے خود مول لی تھی۔ عطیہ نے اسے
 بچھا رکھا تھا کہ آج رات وہ رگ جائے، اگلی صبح چلی
 جائے مگر کومل نے بات نہیں مانی۔ وہ عطیہ کی رخصتی
 کے ساتھ ہی اس سے رخصت ہوئی تھی۔ عطیہ اس
 کی بہترین دوست تھی، زیادہ شہرور کی رہا تھی کومل اس

کی شادی میں شرکت کے لیے گئی تھی اور مزید ملاقت
 اس سے یہ ہوئی تھی کہ وہ اپنا میوہ مل فون بھی کھر بھول
 گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شام چلے کھر بیچ جائے
 گی، مگر ٹرین لیٹ ہو جانے کی وجہ سے اس کا واپسی کا
 سفریشان کن ہو تا جا رہا تھا۔

”پیشل سے تمہارے پاس؟“ ہلانی والے نے اس
 سے پوچھا، کومل چونک کر خیالوں کی دنیا سے واپس
 آئی۔ زبان سے جواب دینے کی بجائے اس نے شخص
 نامی میں سر ملا دیا۔ چون اس کے پاس پرس میں موجود
 تھا، مگر وہ اس جاہل کو کیسے دے دیتی، اس کو توارنے کیا
 لکھا تھا پیشل سے ”یقیناً“ کوئی فضل حرکت ہی کر نہ
 ”تمہارے پاس پیشل ہے یا؟“ اس نے ذرا سا اٹھ
 کر کومل کے سر کے اوپر دیکھتے ہوئے کسی کو دور سے
 مخاطب کیا۔

”جی ہاں!“ کومل کی سیٹ کی پشت سے دور کھڑا وہ
 شخص بے شکل ہلانی والے کے پاس پہنچا۔ نہ جانے کیوں
 اسے دیکھ کر کومل کے دل میں ایک خوشگوار احساس
 نے جنم لیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو کچھ دیر اس کے
 سامنے سیٹ پر بیٹھا رہا تھا اور پھر ہلانی والے نے اسے
 شرمندہ کر کے اٹھا دیا تھا۔ پچھلے اسٹیشن پر وہ نوجوان اتر
 گیا تھا، کومل کا خیال تھا شاید اس کی منہل اب آگئی ہے مگر
 وہ تو ڈبے میں موجود تھا، صرف جبکہ بدل چکی تھی۔ اس کا
 مطلب ہے وہ بھی سیٹ کی تلاشی میں اتر تھا اور ناکام
 ہونے پر واپس اسی ڈبے میں آگیا تھا۔ نوجوان نے
 جب سے نکال کر کھم ہلانی والے کو پکڑا دیا۔ وہ کھم سے
 کتاب پر فضل نشان بنانے لگا ایسے بے معنی نشان جو
 کتاب دشمن لوگ کتاب کے صفحوں پر بے دردی سے
 کھینچتے ہیں دائرے، ٹیکس، ”پرستی“؟ کچھ ماس نے
 کومل کو مخاطب کیا۔ وہ کومل کو شاعری کی وہ کتب
 پڑھنے کی پیش کش کر رہا تھا جو اس کے ہاتھ میں تھی۔
 کومل نے انکار کیا، ان افراد میں جواب دیا۔ اس کے
 ہاتھ پر ناگوار کی ایک ٹیکر ابھری، جسے پاس کھڑے
 اس نوجوان نے بھی محسوس کیا، مگر وہ دل چپ رہا۔
 ”پڑھ لو، بہت اچھے شعریں۔“ ہلانی والے نے

کتاب والا ہاتھ آگے کیا۔ کومل نے بغیر کوئی جواب
 دیے گھڑکی کی طرف رخ پھیر لیا۔ اندر چر اپنا تسلسل
 جہا رہا تھا، پاہر کے مناظر، میوہ مل رہے تھے مگر ٹرین کے
 اس ڈبے میں ایک ہی منظر دیر سے گھبرا گیا تھا جو کومل
 کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ ہلانی والا کتاب کے صفحے
 پلٹتے ہوئے کبھی دھیمی، کبھی بلند آواز میں شعر پڑھ رہا
 تھا، اشعار اچھے تھے، مگر پڑھنے والا یقیناً ”جاہل“ تھا جو
 لفظوں کو توڑ توڑ کر پڑھ رہا تھا اور دونوں مصرعوں کو یوں
 ایک ساتھ ملا رہا تھا کہ پتا نہیں چلتا تھا وہ شعر پڑھ رہا
 ہے یا کتابوں کی کسی کتب کا پیرا گراف۔ دیر سے کھڑا
 نوجوان کبھی کبھار اس کے غلط تلفظ پر دھڑکے سے
 مسکراتے، کومل کو اس کی مسکراہٹ سے کوئی غرض تھی
 نہ غلط تلفظ والے شعروں کی لواٹیکر پر کوئی اعتراض نہ
 تو سفر کسی طرح جلدی کٹ جانے کی دھماکوں میں

مکتوب کی۔ ایک چھوٹے اسٹیشن پر ٹرین دیر اسی دیر کے لیے رکی، کچھ مسافر اتر گئے، وہ چار چڑھ آئے۔ نو جوان کو بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں ملی، وہ بدستور کھڑا رہا۔ کول کھڑکی سے سر نکالتے بیٹھی تھی، نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ کسی بڑے اسٹیشن کی آمد نے مسافروں میں ہلچل مچادی تھی، کول بھی جاگ گئی۔ کچھ مسافر اپنے سوتے ہوئے ساتھیوں کو جگا رہے تھے، کچھ اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ وکیل بجائی ہوئی ٹرین ہیٹ قارم پر رُک گئی۔ بہت سارے مسافر نیچے اتر گئے، نو جوان کو کول کے پاس ہاتھ والی خلی سیٹ مل گئی، وہ فوراً بیٹھ گیا۔ بہت سارے مسافر اس اسٹیشن پر اترے تھے، ایک آدھ سوار بھی ہوا، ڈبے میں کھڑے لوگوں کو سینکڑوں پر جگہ مل گئی۔ ہائی والا اس دوران تیزی کے ساتھ نیچے اترتا تھا، مگر جانے سے پہلے وہ قنبی بھی انداز میں کول کو سمجھا گیا تھا۔

”سیٹ خالی نہیں ہے“ کول نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ وہ کسی کی بے عزتی کا خلعو مول نہیں لے سکتی تھی۔ ایک اجیزو شخص نے اس کے سامنے خالی سیٹ پر بیٹھنا چاہا، کول نے فوراً کہا۔

”سیٹ بک ہے۔“ اجیزو مگر کول کی حالت میں ایک بل کے لیے کھڑا رہا، پھر آگے بڑھ گیا۔ نو جوان نے کول کی بات سن کر چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا، کول کی نظریں اس کی نظروں سے ٹکیں۔ کول کو لگا ان نظروں میں ایک شکایت نمایاں تھی۔ شاید وہ کہہ رہا ہو کہ جب میں اس سیٹ پر بیٹھا تو مجھے کیوں نہ بتایا۔

کچھ دیر رکنے کے بعد ٹرین نے وکیل دی، مہنگی، آہستہ آہستہ پٹری پر سرکی اور پھر چمک، چمک، چمکا چمک، چمکا چمک، تیز ہوئی چلی گئی۔ تیزی سے بھاگتی ہوئی ٹرین نے کول کو شلو کر دیا تھا، اس نے اطمینان کی حالت میں سانس لیا۔ ہائی والا دوبارہ ٹرین میں نہیں آیا تھا۔

”شاید وہ اسٹیشن پر ہی رہ گیا ہو، شاید اس کی منزل

آگئی ہو۔“ کول نے سوچا، یہ خیال ہی اس کے لیے فرحت بخش تھا کہ وہ جان کاغذ بلب مل گیا تھا۔ ”ہر شے کو آگ لگی ہوئی ہے، پان میں روپے کا یہ بھی کوئی بات ہے بھلا۔“ سانس کی طرح چمکنا کی آواز نے کول کی ساری خوشی بل میں عذارت کر دی۔ کول کی سیٹ کی پشت والے دروازے سے داخل ہونے والا گلاب کا ایک پھول سوکھتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”سپاری کا منورہ لالہ جی کا پھر بھی جیس روپے۔“ وہ بیڑا ہوا کول کے سامنے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کول جو اس کی عدم موجودگی میں ابڑی ہو گئی تھی پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”منورہ کالی نے مت ماری ہوئی ہے۔“ منورہ گھٹتے ہوئے کپکولے بوڑھے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”منورہ کا ہوا سستا، یار لوگوں نے شوق تو پورا کرنا ہی ہے۔“ اس نے ہاتھیں پھیلا کر پان کو منورہ میں گھمائی۔ ”ہاں جی، شوق کا کوئی مول نہیں۔“ نو جوان کے ساتھ بیٹھے ہوئے منورہ کے لڑکے نے اسے اپنی بات کا کول پچھا۔

”میرا قلم روپے دس، اگر فائن ہے۔“ نو جوان نے ہلوالے سے انتہائی شستہ لہجے میں کہا۔

”یہاں اچھا نہیں لگ رہا؟“ ہائی والی نے اپنی جیب میں موجود قلم پر ہاتھ پھیرا۔

”کیا مطلب؟“ نو جوان کا لہجہ حیرت میں ڈوب گیا۔ ”پاؤ جی، جو شے یار لوگوں کو پسند آجائے وہ اپنی ہو جاتی ہے۔“ ہائی والے نے کول کو کمری نظروں سے دیکھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

”یہ تو راز دانی ہے،“ میرا اسٹیشن آنے والا ہے“ پلیر نے نو جوان نے مذہب انداز میں ہلکا سا احتجاج کیا۔ ”جو بھی سمجھو، مگر بات یہ ہے۔“ وہ انتہائی بد مزیز اور اکثر شخص تھا، جسے اخلاقیات چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

”عجیب بات کر رہے ہیں آپ۔“ نو جوان نے بحث کرنا چاہی۔

”اچھا؟ پھر لہو لہو کر لے سکتے ہو۔“ ہائی والے کا لہجہ کدم کڑوا ہوا۔ اس کے تئیر بدل گئے تھے اور وہ اس کے سامنے سے نو جوان کو گھور رہا تھا۔ کول کانپ کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ نو جوان کو مزید بات کرنے سے باز رکھے، اس وحشی کے منہ لگنا نری حماقت تھی۔ کول کو کہہ نہیں پڑا کہ نو جوان نے انتہائی برواشت کا اظہار کیا اور ہونٹ سمجھ کر چپ ہو گیا، اس حال میں کچھ دیر کے لیے تکیہ کیا اور کیا تھا۔ سناٹا رہا اور اسی سناٹے میں ہائی والے نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے اظہار نظر بجا کر اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاب کا پھول کول کی گود میں رکھ دیا۔ کول برف کی ریل بن گئی۔

ہائی والے کی یہ حرکت کسی اور نے دیکھی یا نہیں، مگر نو جوان کی نظروں نے نہ سارا احتیاط دیکھ لیا۔ اسے بھی یہ حرکت یقیناً ”بہت ناگوار گزری تھی، مگر وہ محض پیشانی پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اس کا اسٹیشن آنے والا تھا، اس کو اتر جانا تھا، شاید اس نے پرانی آگ میں ہاتھ جلانا مناسب نہیں سمجھا، شاید ہائی والے کا خیال ہو کہ اسے میں بلب کی بدھم روختی میں کسی کو ڈھکی نہ دیا ہو۔ کچھ ہوا کہ سارے مسافر محکم سے چورینہ سے اسے میں بیٹھا یا اس نے یہ سوچا ہو کہ کول اس کی ہر

بے پرواہی حرکت پر چپ رہی ہے تو اس کی نیکل قدم پر بھی غلام رہے کی سیر اس کی خام خیال تھی۔ جو کسی اس نے اپنا راز کھانا ہوا تھا، کول کی برف بنی تھی پر رکھا وہ رکھ گیا۔

”نٹ آپ۔“ کول کی غصے اور بے بسی میں گندھی کو اڑ پر ہائی والا ایک بل کے لیے خشکا اور اسی ایک بل نے اسے سیٹ پر بیٹھے نو جوان کو اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خود انہوں سے آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے ہائی والے کا گریبان پکڑ کر اس نے بیٹھو ڈھالا تھا۔ کول کی آنکھیں بے بسی سے چمک رہی تھیں اور وہ دہشت زدہ ہو کر ان دونوں کو گھم رہا تھا ہوتے دیکھ رہی تھی۔ نو جوان نے ہائی والے کا جہاز زخمی کر دیا تھا، خون زخمی جہزے سے اگل رہا تھا۔ نو جوان کی شرٹ پھٹ گئی تھی، پھر اسے خراشیں ملی تھیں، منورہ ہائی والے

کو خوب رگید رہا تھا۔ کدم مسافروں میں ہلچل مچ گئی۔ جب تک وہ سچ بھلا کر اترے نو جوان نے ہائی والے کا حلیہ بگاڑ دیا تھا، وہ خون تھوک رہا تھا، زخمی ہائی والے کی آنکھوں میں خون اترتا ہوا تھا، مگر نو جوان کے اچانک حملے نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا، اگلا اسٹیشن نزدیک آیا تھا، ٹرین کی رفتار دھیمی ہوئی اور پھر رُک گئی۔ ”زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ہائی والا زخمی جہزے پر ہاتھ رکھے پھنکار رہا تھا۔

”کوئی حد ہوتی ہے بد تمیزی کی۔“ نو جوان اس حالت میں اسے اخلاقیات کا درس دے رہا تھا۔ ”یار لوگ بدلہ لیتے ہیں، چھوڑتے نہیں۔“ آگ اگلی نظروں والے کو مسافروں نے بڑی مشکل سے اس ڈبے سے اتار دیا۔

”میرا اسٹیشن آیا ہے۔“ نو جوان نے ٹیک اٹھاتے ہوئے دھیمی آواز میں کول سے کہا، نہ جانے کیوں وہ اس لڑکی سے نظریں نہیں ملا رہا تھا، جس کی چاہ یہ سوچ کر لنگی جاری تھی کہ اس کا اجنبی ہر دہر اس سے جدا ہو رہا ہے اور ابھی طویل سفر باقی ہے۔ ہائی والا اظہار دہلی سے چاہکا تھا، مگر کیا خبر وہ دوبارہ اسی ڈبے میں آجائے اور...

”شکر ہے۔“ ف۔“ ڈیڈ ہائی آنکھوں والی لڑکی کانپ رہی تھی، اس کے ہونٹوں سے لفظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔

”کمل جانا ہے آپ کو؟“ نو جوان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”خ۔ وہ۔ اب۔ ن۔ گ۔ ر۔“ ڈیڈ دل کے ساتھ ٹوٹے لفظوں میں کول نے کہا۔

”اور ابھی کافی سفر ہے۔“ نو جوان کے لہجے میں بھی تشویش در آئی۔

”جی۔“

ٹرین کی وکیل بج اٹھی تھی۔ نو جوان کے قدم دروازے کی طرف اٹھنے لگے، ٹرین کے پیچھے حرکت کرنے لگے۔ کول کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بھڑکی اترنے لگی۔ نو جوان نے ایک قدم پیادیاں پر رکھا، اس

نے پلیٹ کر دکھا، ہنسی کی طرح بھی ہوئی لڑکی کا سارا چہرہ گلیا تھا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی، ابھی میوں کا اسٹیشن گزر گیا۔ وہ بیگ اٹھائے آہستہ قدموں کے ساتھ آکر کول کے سامنے والی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ کول کا رزنا ہوا بدن شانت ہو گیا۔ وہ چلی اور نو جوان کے پیروں میں پڑا ہوا وزٹنگ کارڈ اپنی منگی میں دیا یا جو اس ابھی کی چپ پیٹنے سے نیچے کر گیا تھا۔ اگلا اسٹیشن آیا، ٹرین رکی اور چل دی۔ آسنے سامنے چپ چاپ بیٹھے تھے، دونوں کی زبان نہیں کھلی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تک نہیں۔ پھر ایک اور اسٹیشن آیا اور گزر گیا، دونوں اپنی اپنی دنیا میں گم۔

”نکٹ چپک کر آئیں۔“ نکٹ چپکے نے نو جوان کو چونکا دیا تھا۔ نو جوان نے جب میں ہاتھ والا بیوہ نکالا اور نکٹ تیز مسکراہٹ کے ساتھ نکٹ دکھایا۔

”دیکھنے میں تو آپ بڑے لکھے لگتے ہیں۔“ نکٹ چپکے کی چٹائی پر مل پڑا۔

”جی، نو جوان نے جیسے انداز میں اقرار کیا۔

”اب کا اسٹیشن گزر چکا ہے صاحب ہلور!“ نکٹ چپکے کا کچھ طنز تھا۔

”جی، مجھے معلوم ہے۔“ نو جوان نے وہی آواز میں کہا۔

”معلوم ہے؟ مطلب آپ جان بوجھ کر بغیر نکٹ سفر کر رہے ہیں؟“ چپکے کے کنبے میں سختی آ رہی تھی، نو جوان شرمندگی محسوس کر رہا تھا، سارے مسافروں کی طرف متوجہ تھے۔ کول کو شش کے باجوں چپکے کو اصل بات بتا نہیں سکی۔

”سوری! آپ نیا نکٹ بنا دیں۔“ نو جوان نے شرمندگی سے کہا۔

”وہ تو میں بناؤں گا مگر جرنلہ بھی وصول کروں گا۔“ نکٹ چپکے نے سختی سے کہا۔ نو جوان چپ رہا۔ کول کو بھی شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا، مگر اس کے لب بند تھے۔

”جانا کہاں ہے؟“

”خواب مگر۔“ نو جوان نے بیوے میں سے نوٹ نکالے ہوئے کہا۔ کول نے پہلی بار پوری نظر سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ روشن اور اچھا چہرہ۔

”چھوٹے اور بیٹے سارے اسٹیشن گزر گئے۔ طویل سفر خاموشی میں گزر گیا۔ کسی نے کچھ پوچھا نہ کچھ کسی نہ بتایا۔ کول کو دھڑکا کا تھا کسی بھی وقت وہ اوباش ہلی والا واپس آجائے گا مگر وہ مطمئن بھی تھی کہ ایک مضبوط سارا اس کے ساتھ تھا، جس کے ساتھ کوئی تعارف تھا نہ جان پہچان۔ کوئی رشتہ نہ تعلق۔

خواب مگر کا اسٹیشن آیا۔ کول کی منزل آگئی۔ رات نے پر پھیلا رکھے تھے جب وہ دونوں ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر ساتھ ساتھ چلے ہوئے باہر آئے۔ سیڑھیوں پر ڈگ کر نو جوان نے اجازت طلب نظروں سے کول کی طرف دیکھا۔ کول نے پھر بھی زبان سے کچھ نہیں کہا، شاید الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، مگر اس کی آنکھوں میں موجود تشکر نے ساری کہانی کہہ دی۔ جب تک وہ ٹیکسی میں نہیں بیٹھی، وہ سیڑھیوں پر کھڑا رہا۔ ٹیکسی چلی اور رک گئی، سیڑھیوں پر کھڑا رہا، پھر پلٹا اور ڈگ کر گیا۔ دونوں نے پلیٹ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ نو جوان کی آنکھوں میں شاید اوباشی تھی، مگر وہ ٹیکسی میں بیٹھی کول کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ اس نے پلٹ والے کو ٹیکسی اسٹیشن میں کھڑا دیکھ لیا تھا جو اس کی طرف دیکھ کر غیبت بھی ہنسا تھا۔ فائنٹ اب اکیلی تھی اور باز کے نیچے سے دور نہیں تھی وہ یقیناً اسے اپنے بچوں میں نوچ لیتا۔ رکی ہوئی ٹیکسی کو سیڑھیوں پر رکے ہوئے نو جوان نے حیرت سے دیکھا، پھر کول کی نظروں کے تعاقب میں اس کی نظروں نے سفر کیا اور وہ تیرہ قدموں سے سیڑھیوں اترتا ہوا آیا اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”چلو! اس نے مضبوط لمبے میں کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مرکز حیرت سے کول کو دیکھا جو پچھلی سیٹ پر یوں بیٹھی تھی جیسا تابلہ پاسفر کے بعد سستاری ہو۔

”اب چلو۔“ کول نے مختصر بات کی اور ٹیکسی کی کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ ہلی والا جرنلہ پر ہاتھ رکھے چھٹی نظروں سے یہ سارا دیکھ رہا تھا۔ نو جوان کے اٹھانے اس کا اپنے آپ پر اعتبار بھی سنی میں ملا ہوا تھا۔ ہلی والا اپنی جگہ سے ہلکا تک نہیں۔

ٹیکسی انجان راستوں پر چلی، ٹانوس سڑکوں پر بھاگی، آگ کیے موڑ مڑی، ابھی گلیوں میں بھاگتی ہوئی ایک بند خلی کے سامنے سہکت ہو گئی۔ کول پچھلی سیٹ سے اتری اور اگلے دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”چلو!“ نو جوان نے اس سے نظروں ملائے بغیر کہا۔ کول کا پرس میں رہ گیا ہوا ہاتھ وہیں رک گیا۔ وہ کچھ دیر اس کے چہرے پر نظروں جمائے کھڑی رہی، جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ اس ابھی میوں کو اپنے دروازے تک لے جائے یا نہیں سے اوداع کو ہے۔

”چلو!“ نو جوان نے ڈرائیور سے کہا۔ ٹیکسی مڑنے تک کول تیز قدموں کے ساتھ چلی اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ دروازے کی ٹھنکی پر اٹھ کر رکھ کر اس نے ٹرین موڑ کر دیکھا، ٹیکسی گلی کے سامنے رکی ہوئی تھی اور تب تک رکی رہی جب تک دروازہ کھل نہیں گیا، کول ہل گیا۔ ٹرین کے سینے سے ہٹ نہیں گئی۔ اس دوران میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے نو جوان نے ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

”ڈرائیور جی، یہ۔“ ڈرائیور نے نو جوان کو بتایا۔

”تم بھی چلو۔“ نو جوان نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”اب کہاں؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”واپس ریلوے اسٹیشن۔“ نو جوان نے سیٹ کی پشت سے سر کھینچے ہوئے اطمینان سے کہا۔ ڈرائیور نے اس عجیب آدمی کو ایک نظر دیکھا اور ٹیکسی چلنے لگی۔ نو جوان کو خبر نہیں ہوئی کہ ٹیکس میں بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی ماں کے کندھے سے چٹنی گلی کے موڑ تک اسے اوداع کرنے لگی تھی۔ وہ دسمبر کی آخری شب

تھی، ٹھیک وہ وقت جب ٹھنکی کی سونیاں بارہ کے بند سے گوجھو رہی تھیں۔ سہلی کی آخری شب، نئے سال کے پہلے دن سے مصافحہ کر رہی تھی۔ نہ جانے یہ ملاپ کلاوت تھا یا جدلی کا۔

رات گیارہ بجے خواب مگر کے اسٹیشن پر رکنے والی ٹرین سے ایک سرسبز مسافر بھی اتر رہا، ہلی مسافروں کی طرح اس کے پاس کوئی سامان تھا نہ ان کی طرح وہ جلالت میں تھا۔ اس کے قدم متوازن تھے، ٹھنکی کی دھڑکن شاید لڑان میں نہیں تھی۔ وہ ٹھیک ایک سال بعد اس ابھی شہر میں آیا تھا۔ پلیٹ فارم پر چلے ہوئے اس کی نظروں کسی کی متلاشی تھیں، نہ جانے وہ کس کی تلاش میں تھا۔ نہ جانے وہ کسے دھونڈتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ اپنے شہر سے بیٹھے شہر نے نہ جانے کس درد نے اسے ہوائی شہر میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہاں تک ہی گھر سے نکلا تھا، بے اختیار اس کے قدم ریلوے اسٹیشن کی سمت چل پڑے تھے۔ کچھ سوچے بغیر ہی اس نے ریل سکاٹ خرید لیا تھا، بے ارادہ ہی وہ ٹرین میں سوار ہو گیا تھا۔ وہاں اس نے جو نمبر دے گا، کب تک وہاں پر قدم رکھتا تھا۔ کسی اس کے ساتھ نہ تھی، سیٹ کے پاس جاکر ہوا تھا، جہلے سہلی دسمبر کی آخری شب ایک ابھی لڑکی ڈری تھی، بیٹھی تھی۔ آج وہ سوٹ خلی تھی۔ مسافر ہر اسٹیشن پر اترتا پھر ٹرین کے اگلے ڈبے میں سوار ہوا۔ پھر اگلے، اگلے، اس سے اگلے، پہلے سے آخری اسٹیشن پر پہلے سے آخری ڈبے تک وہ چہرے کس دھکائی میں دیا جس نے سال بھر اسے ستایا تھا، وہ سال کے آخری روز اس قدر بے چین کر دیا تھا کہ وہ خواب مگر کا ٹکٹ لے کر ٹرین میں سوار ہو گیا تھا۔

پلیٹ فارم سے باہر آکر وہ سیڑھیوں پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرا رہ گیا، اسی جگہ جہاں پچھلے سال کی آخری شب وہ کھڑا تھا اور سامنے ٹیکسی اسٹیشن میں لڑکی کا بیٹھی ایک دھڑکی ٹیکسی والے کو اپنے گھر کا پتا سمجھا رہی تھی۔ اب وہاں ایسا کوئی دھڑکی نہیں تھا۔

”میں کیوں آیا ہوں؟“ چٹائی مٹتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے وہ سوال کیا جس کا جواب اس سمیت کسی کے پاس نہیں تھا۔
 ”ٹیکسی صاحب!“ ایک ٹیکسی اس کے سامنے آ رہی۔ ڈرائیور نے گھڑکی سے سر نکال کر اسے متوجہ کیا۔ ابھی مسافر نے غور سے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا۔
 ”نہیں، یہ وہ نہیں ہے۔“ ٹیکسی ڈرائیور کا لٹکانوس چہ اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے ٹی میں سر ہلادیا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ میزبیاں اتر کر وہ ٹیکسی ہاسٹینڈ میں آگیا۔

”بھئی، سر! کمال جانا ہے؟“ ایک نو عمر لڑکے نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسے بٹھانے کی کوشش کی۔ مسافر نے نو عمر لڑکے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔
 ”میں لہو اتانم عمر نہیں تھا۔“ مسافر بیڑیا۔
 ”جی؟“ نو عمر ڈرائیور نے حیرت سے پوچھا۔ وہ پہلے ہی مسافر کی گہری نظروں سے گھبرا گیا تھا۔
 ”نہیں جانا!“ مسافر نے مختصر سا جواب دے کر قدم آگے بڑھا دیے۔

”کمال، چلیں گے؟“ ٹیکسی خالی ہے۔ ہماری بھر کم جتنے والے نے اسے متنبہ کیا۔ وہ درکار بھاری جتنے والے کو اپنی نظر سے دیکھا اور بغیر کچھ بولے مایوس آگے بڑھ گیا۔ آگے پھر آگے مزید آگے سارے ٹیکسی ڈرائیوروں کے چہرے اس نے بڑھ لیے وہ چہرہ کہیں نہیں تھا۔ ایک بند گلی ہے، محظوظ ہیشتم کا درخت، اس سے پہلے چوک میں لال رنگ کی بڑی عمارت، اس سے پہلے چوڑی سڑک بغیر فٹ پاتھ کے اس سے پہلے چھوٹا سا گول چکر۔ مسافر نے اوچیر عمر ٹیکسی والے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ٹیکسی والے نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔
 ”فٹ پاتھ سے معقول آدمی، لباس اور چال سے سلکھا ہوا لگتا تھا، مگر یوں۔۔۔ بند گلی۔۔۔ ہیشتم کا درخت۔۔۔ چوڑی سڑک۔“

ایک چھرے بدن والے نے اثبات میں یوں سر بلایا جیسے مسافر کی بات ٹھیک طرح سے سمجھ گیا ہو۔

مسافر دروازہ کھول کر اٹلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی پہلی چلتی گئی، چلتی رہی، پہلی چوڑی سڑک میں آگئی، بغیر فٹ پاتھ کے لال رنگ کی عمارت میں ٹکی کول چکر۔
 بے شمار عمارتیں، سڑک کی آخری شب الوداع ہو رہی تھی، نئے سال کا پہلا دن اس سے ملنے لگا رہا تھا، نہ جانے یہ بدلی کالہ تھا یا ملاپ کی گھڑی۔

ایک اجنبی شہر میں رات جگا کٹ کر وہ لوٹا تو عجیب احمد کی بے چین آنکھوں کو چین آیا۔
 ”کمال تھے؟“ باپ نے ٹیکسیوں بھری آواز میں سوال کیا۔

”سوری ابو! آپ کو بتائے بغیر میں چلا گیا۔“ اس نے شرمندگی سے جواب دیا۔ اس سوال کا یہ جواب کسی طور نہیں بنتا تھا۔ وہ بیل چیرے بیٹھے عجیب احمد نے دوبارہ بیٹے سے وہ سوال نہیں کیا۔ بیٹے کے چہرے پر جی بے سمت سفر کی دھول اس نے دیکھی تھی۔ وہ باپ کو بتائے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا، آج پہلی بار ایک انجانے سفر سے واپس آیا تھا اور شب بھری کھانکا نہ تھانے سے گریزوں تھا تو باپ نے اسے گروا نہیں،
 ”چپ رہا۔ یہ الگ بات کہ یہ رات عجیب احمد کی زندگی کی طویل ترین رات تھی۔“

”تمہارے کمرے میں کچھ پھول رکھے ہیں۔“ عجیب احمد نے اسے بتایا۔
 ”پھول؟“ وہ باپ کے سامنے کرسی پر ڈھے سا گیا۔
 ”احاصل سفر نے اسے تمہارا تھا۔“
 ”نئے سال کا ایک کارڈ بھی ہے۔“ عجیب احمد نے سر کو شی کی۔

”نئے سال کا کارڈ؟“ وہ چونکا۔
 ”کمال سے آیا؟ کس نے بھیجا؟“
 ”خود دیکھ لو۔“ عجیب احمد کے لبوں پر ہلکی سی مسکان تھی، جسے بیٹے نے دیکھا مگر سمجھ نہیں پایا۔ وہ ابھرا ہوا اپنے کمرے میں گیا اور ابھرا ہوا واپس آیا۔
 اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ تھا اور دوسرے میں نئے سال کا ایک کارڈ۔

”فراز عجیب کے لیے؟“ اس نے کارڈ کھول کر دیکھا

اور اسے لبوں سے باپ کی طرف دیکھا۔ عجیب احمد کی آنکھوں میں شرارت طاری رہی تھی۔
 ”وہاں والے نے اپنا نام نہیں لکھا۔“ وہ کارڈ کو بار بار دیکھ رہا تھا۔
 ”کمال! اندر لکھ لو۔“ عجیب احمد کے لبوں کی مسکان کابل رہی تھی۔

”کمال؟ کون؟“ فراز عجیب مزید الجھ گیا۔
 ”کمال کے سال نہیں میں نہیں ٹی تھی۔“ عجیب احمد نے بیٹے کی حیرت کا لطف لیا۔
 ”کمال کے سال نہیں میں؟“ فراز عجیب باپ کے سامنے آکر ابھرا۔

”ہاں! تمہارا وزٹنگ کارڈ وہ کیا تھا اس کے پاس۔“ عجیب احمد نے کارڈ نکال کر فراز عجیب کی جیب میں ڈال دیا۔

”میرا کارڈ؟“ فراز عجیب باپ کے بیروں میں بیٹوں کے دل پہنچ گیا۔

”نہیں میں گر گیا تھا، اس نے سارا سال منہالے رکھا۔“ عجیب بات ہے؟“ عجیب احمد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
 ”عجیب احمد، بہت عجیب۔“ فراز عجیب کادل عجیب طرح سے حیرت لگا تھا۔

”عجیب لڑکی تھی، عجیب عجیب باتیں کرتی تھیں۔“ عجیب احمد شاید اس کا ضبط آزاد ہوا تھا۔
 ”عجیب باتیں؟“ فراز عجیب کا بیان نہ مبرر تھلکتے ہی ڈالا تھا۔

”کہہ رہی تھی تین سو پینتھ دنوں میں کوئی ایک دن ایسا نہیں گزرے گا جب اس نے کارڈ پر لکھے فون نمبر کی کال نہ ملانی ہو۔“ فراز عجیب نے فوراً ”عجیب سے کارڈ اٹھ کر فون نمبر دیکھا۔

”اوہ! میرا پرانا فون نمبر۔“ فراز عجیب کے ہونٹ ہنسنے لگے۔
 ”آخر اسے آنا دیا۔“
 ”وہ آئی تھی؟“
 ”ہاں۔“

”کہ؟“ فراز عجیب نے بے تکی سے پوچھا۔
 ”کچل شام ۲ بجی ماں کے ساتھ۔“
 ”آپ نے روکا نہیں اسے؟“ وہ بہت بے چین تھا۔

”نہیں! کہہ رہی تھی بہت دور سے آئی ہوں، جلدی لوٹنا ہے۔“

”آپ روک لیتے تے میرے آتے تے۔“ فراز عجیب نے بے صبری میں باپ کا بازو پکڑ لیا۔
 ”وہ نہیں رکی میں نے کہا مگر وہ نہیں رکی۔“
 ”اس کا پتا؟“ فراز عجیب کی حالت بدلتی ہی تھی۔
 ”نہیں میں نے نہیں پوچھا۔“

”اس کا فون نمبر؟“ فراز عجیب بچوں کی طرح چل رہا تھا۔
 ”نہیں میں نے نہیں مانگا۔“

”ابو!“ فراز عجیب نے بے بسی سے منھیاں بھیج لیں۔ اس کی آنکھیں جھلکنے کے قریب تھیں۔ قسمت اس کے ساتھ کیا کھیل، کھیل رہی تھی۔ جسے

ایک نظر دوبارہ دیکھنے کی خواہش میں وہ اس کے شہر کی غناک چھان رہا تھا، وہ اس سے ملنے اس کے گھر پہلی آئی تھی اور پہلی ملاقات کی طرح دوسری بار نہ ملنا بھی اب اذیت ناک ہو جاتا تھا۔ اس نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بارے ہوئے جواری کی طرح اپنے کمرے کی طرف چلا۔

”میرا موبائل نمبر لے گئی، کہہ رہی تھی روزانہ بات کیا کرے گی۔“ فراز عجیب اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچا تو عجیب احمد کی شوخی بھری آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اس نے مڑ کر دیکھا، عجیب احمد کے چہرے پر خوشی اور لبوں پر شرارتی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہی مسکراہٹ فراز عجیب کے لبوں پر بھی چھپی، چھو خوشی سے کھل اٹھا اور وہ ہانکا ہوا باپ کے کھلے بازوؤں میں چھپ گیا۔

دسمبر کی شب آخر نہ پوچھو کس طرح گزری ہمیں ہر پہل یہ لگتا تھا کہ وہ کچھ پھول جیسے گا

جانی جانی



"کیوں نہ جھانکوں میرے چچا کا گھر ہے کسی غیر کا تو نہیں۔" وہ اس کی تقریر سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ "اور جہاں تک سوال ہے منہ اٹھا کے جھانکنے کا تو ڈیر کرزن! میرا خیال ہے جھانکا منہ اٹھا کر ہی جاسکتا ہے جزل بناج کے لیے تیار رہا ہوں۔" اس کے گھورنے پر وہ وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

"چچی کہاں ہیں؟" اس کے متوجہ نہ ہونے پر اس نے پھر پکارا۔

"خانہ رضیہ کے گھر مٹی ہیں۔" سنجیدگی سے جواب کیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" وہ ہوا اپنے دھیان میں مریخوں کو دائر ڈال رہی تھی اچھل پڑی۔

"نئی پار کما ہے ہمیں ایسے مت جھانکا کرو۔ اچھا بھلا دروازہ ہے ٹکاف کر کے آجاؤ مگر نہیں اس کے لیے تو مہنہ زکی ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ میں جب دل چاہا منہ اٹھا کے جھانک لیا۔" وہ غصے میں برہنہ دیکھ کر مریخوں کی طرف مڑ گئی۔

تلا و لپٹے

"خیر بہت؟" "ہاں ان کی طبیعت کچھ عجیب نہیں تھی۔" "امی کے ساتھ ہی مٹی ہیں۔" اس نے آرام سے بتایا تو ماہر نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے؟" "وہ ایسے ہی بات کرنے کے لیے پوچھ رہا تھا اور دوسرے گھر میں تمہاری دلچسپی کا اندازہ کرنا بھی مقصود تھا۔" وہ دیوار پر بازو ٹکائے بے نیازی سے بولا تو وہ سر تکیا پل مٹی۔

"صد سقے جاؤں تمہارے۔" "چچی۔" وہ خامسا خوش ہوا تھا۔

"اس مریخی کا نام مٹی ہے نا؟" ماہر نے کہا تو مٹی میں موجود مریخی کی طرف اشارہ کیا جسے وہ ہمار کر رہی تھی۔

"للی ہے اس کا نام۔" "ڈانٹ نہیں کر سچ کی مٹی۔" "اے سوہری مس للی! آپ کی شان اور نام میں کی سہی اس گستاخی کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔"



اس نے مرغی کے سامنے یا قاعدہ ہاتھ جوڑے تو وہ اسے دیکھ کر گرہ گئی۔ لب مزید اس کی بکواس برداشت کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اس نے آئین میں چہل قدمی کرتی مرغیوں کو گھیر گھاڑ کر دوپے میں بند کیا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ہادی جو بغور ساری کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا پکار مائی رہ گیا مگر وہ لگ نہئی کرتی اندر آ گئی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور اماں ابھی تک وہاں نہیں آئی تھیں وہ خالی گھر میں بولائی بولائی پھر رہی تھی۔

”پکانا کیا ہے یہی بتا جائیں تو کھانے کا ہی کچھ کر لیتی۔“ وہ سوچتی ہوئی باہر نکل دیوار کے پار سے ہادی کا چوکھٹا غائب ہو چکا تھا اس نے اطمینان کا سانس لیا اور بیڑھیوں پر آکر بیٹھ گئی جو اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ سردیوں کی آمد تھ گئی اور شام کے وقت فضا میں موجود خشکی طبیعت کو بھلی محسوس ہوتی تھی۔ گرمیوں کی رخصت کے ساتھ ہی سرشام آئین میں چاہا بیاں ڈالنے کا رواج ختم ہو چکا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر آثار اور امود کے درختوں کو دیکھا۔ انار سے بے تھوڑے کا عمل شروع ہو چکا تھا جبکہ امود کے تھے نا حال اپنے درخت کی شاخوں کو ڈھانچے ہوئے تھے کہ امود کے بے ذرا اور سے اور نہایت ست روی سے جھرتے تھے۔ دھریک بھی اپنی رہ نہ ہوتی شاخوں کو سینے کھڑی تھی۔

آسٹریلیاں توستے جو تمام دن خوب شور مچاتے شہام ہوتے ہی رات گزارنے کے لیے اپنی جگہوں کا تعین کرنے کے لیے کی جانے والی لڑائی کے بعد اب آرام سے بیٹھے نیند میں مجسم ہو رہے تھے وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ دھیمی سی چپٹی سبک ہوا کے باعث وہ پر پھیلائے سونے کی کوشش میں مشغول تھے۔ اسے ہنسنے دیکھ کر پیٹے طوطے نے آنکھیں پھٹا کر اسے دیکھا اور چونچ گردن کے بالوں میں پھیپھائی اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ ڈال دی۔

”ابھی تک گھر میں اندر صبر کر رکھا ہے غضب خدا کا

شام رات میں داخل گئی اور اس لڑکی کو لائیں جلائے کا ہوش نہیں اور دروازہ بھی کھلا چھوڑ کر نکلا۔ کچھ دیر کو گھر سے گیا نکل جاؤ زندگی کے آٹار ہی ختم ہو جاتے ہیں۔“ گھر میں داخل ہوتے ہی بولنے لگے اسے گھر سے لارہا، طوطوں میں گمن دیکھا تو گھر کر دیکھ دیا اور چادر اٹا کر اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

”کیا ہے لال! آپ جو اتنی دیر سے آئی ہیں شام ڈھلنے کے بعد وہ کوئی نہیں، جبکہ آپ کو بتا چکی تھاکہ میں گھر میں آگئی ہوں۔“ وہ بھی تیز تیز بولتی لال کے پیچھے اندر چلی آئی۔

”اکہل چھوڑ کر نہیں گئی تھی۔“ انہوں نے چیخے ہوئے اسے غورا۔ ”آئین میں ہادی موجود تھا کھڑا تھا؟“ لال کے اس انکشاف پر وہ ٹھٹھا اٹھی۔

”جی نہیں گھر تو نہیں آیا تھا میری بیک کی طرح دیوار سے ٹکنا ضرور پایا کیا تھا۔“ ماہ رخ اس کی اس حرکت سے مت چڑی گئی لال مسکرا اٹھیں۔

”بڑا سمجھ دار اور فرما دیوار پر ہے اور دیوار سے تو وہ جان بوجھ کر جھٹکتا ہے تم چڑی ہو۔“ ان کے لیےج میں بارہی بار تھا۔

”جی جانتی ہوں مجھے تو لگتا ہے موصوف کو دنیا میں بھیجا ہی مجھے چڑانے کے لیے گیا ہے اور کوئی مقصد حیات کم از کم مجھے تو نظر نہیں آتا اس کا۔“ اور اوپر سے ہر وقت کا سحرین ”سخت ناپسند ہے مجھے اور سب اسی سحرے بن کے دیوانے ہیں۔“ پتا نہیں کیا نظر آتا ہے اس میں ہنسنے دیکھو ہادی ہادی کرتا رہتا ہے۔ وہ چادر تہہ کر گئی جلی بھی کہہ رہی تھی۔

”کے یہ تو خوش مزاجی ہے اس کی ہنسناسا تارہتا ہے تمہاری طرح نہیں کہ ہر وقت انکارے چپائے رکھے۔“ لال نے پیش کی طرح اس کی طرف ڈاری کی تھی۔

”من لیا چچی کیا کہہ رہی ہیں، تسلی ہو گئی ہو تو کچھ کھانے کا بھی کرو۔ عجیب پھوڑ لڑکی ہو جس گھر جاؤ گی آلتا ہے سب کو بھوکا مارو گی کیوں پیاری چچی؟“ وہ شرارت سے اسے دیکھتا سا بے شکم کے پاس آکر بیٹھ گیا

”انہوں نے ہنسنے جیسے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ لال کے اس مغلطہ پر ماہ رخ کو گولیا لال بھجھو کا ہو گئی۔

”کیوں تمہاری طرف کیا کھانے کی پڑنل ہے جو اور کرو جاسکتے پھر رہے ہو۔“ اسے میری امی تو میرے لیے یکن پلاؤ بنا رہی ہیں کیونکہ ان کی چچی کی طرف کوئی پھوڑ اور کبھی بیٹی میں ہے کہ ہر حکم کے لیے اس کی طرف دیکھنا پڑے اس لیے ہر کام جلدی ہو جاتا ہے۔“ ہادی کے پاس اسے چڑانے کے سب سلائن موجود تھے لہذا وہ پیر چھٹی وہیں سے واک کوٹ کر گئی جبکہ وہ پیچھے چچی سے رازد نیاز میں مشغول تھا۔

”چچی جان! میں تو کہتا ہوں اس کے لیے کوئی تعویذ لے آئیں مجھے لگتا ہے کہ اس پر کسی جن کا قبضہ ہے اور جن بھی وہ جو خاص آگ سے بنا ہو کیونکہ جنوں میں بھی آج کل ملاوٹ ہو چکی ہے اور دیے بھی ماہ رخ مرید علی کو قاپو کرنا کسی پھولے سونے جن کے بس کی بات ہے بھی نہیں ہے نا چچی!“ وہ جان بوجھ کر اوچی آواز میں بولا تو ساتھ ہی کمری مسکرائی ہوئی۔

ہادی منور علی انہیں شروع سے ہی بہت پراں تھا اور متوجہ دامادی حیثیت سے اور بھی عزیز تھا۔ منصور علی کے گھر ہادی کی پیداوارش کے دو سال بعد جب ان کے ہاں سرخ و سفید گل کو مٹنی سی ماہ رخ آئی تو ان کی مرحومہ ساس نے دونوں بھائیوں کو قریب رکھنے کے لیے ہادی اور ماہ رخ کی نسبت طے کر دی تھی۔ وہ ایک زیرک خاتون تھیں لہذا فرید علی کی شادی کے بعد انہوں نے ساتھ ہی ایک اور گھر بنا کر دونوں بھائیوں کو الگ کر دیا کہ آج کی یہ معمولی داری پیش کی قربت کی پیش بندی تھی۔ چونکہ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار ایک سی تھی لہذا اسی دیوار سے ایک دروازہ نکال کر اس معمولی داری کو بھی ختم کر دیا گیا۔ دروازہ بھر کے وقت کھلتا اور رات جب دونوں گھروں پر نیند کی پری اپنے پر پھیلائی تو احتیاطاً بند کر دیا جاتا۔

ہادی شروع سے ہی شرارتی اور ہنس کھ تھا جبکہ

شرارتوں اور لوگی ہو گئی حرکتوں سے خوب چڑتی اور ہادی اسے چڑتے دیکھ کر اور چڑا جاتا تھا۔ بچپن کی یہ بے زاری بھانے کم ہونے کے برعکس گئی اور جب سے ماہ رخ کو پیار چلا کہ ان کی بات بچپن سے طے ہے وہ اس سے اور بھی غار کھانے لگی تھی۔ جبکہ اس کے برعکس ہادی کے لیے یہ خیر خاصی خوش کن ثابت ہوئی تھی کہ بچپن سے ہی یہ عیصلی ملی اسے بہت اچھی لگتی تھی اور عمر کے مداخلت طے کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ پسندیدگی محبت کے رنگ زار میں داخل ہو چکی تھی۔

اسے کالج میں آئے ڈیڑھ دو ماہ ہو چکے تھے۔ کئی لڑکیوں سے اچھی سلام دعا کے باوجود ابھی تک کسی سے دوستی نہ ہو سکی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ کالج میں سخت پور ہوئی تھی۔ انظر اس نے گلوں سے کچھ فاصلے پر واقع ایک سینڈری اسکول سے کیا تھا چونکہ قریب کوئی کالج نہیں تھا لہذا اسے مزید تعلیم کے لیے شہر کے اس ڈگری کالج میں داخلہ لینا پڑا۔ گلوں میں اس کی تمام سہیلیاں ان کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ چکی تھیں مگر چونکہ اس کے بابا کو اسے رجحانے کا شوق تھا اس لیے اس کی مزید تعلیم کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ آسکی۔ بس اسے لانے لے جانے کا مسئلہ تھا۔ ہاشل میں رہنے کا آئیڈیا لال نا منظور کر چکی تھیں کہ وہ کس قیمت پر اسے ہاشل بھیجے کو تیار نہ تھیں لہذا اب اسے لانے لے جانے کی ذمہ داری بابا کے سپرد تھی اور جو کبھی وہ مصروف ہوتے تو ہادی اسے بخوبی جھانکھا۔ وہ پولیٹیکل سائنس کی کلاس لینے بے زاری سے کلاس روم میں داخل ہوئی اور نسبتاً ”خالی جگہ دیکھ کر ایک سیٹ سنبھال لی۔“ نیچر کے آگے میں ابھی کچھ وقت تھا وہ دھیان ہٹانے کو شرارتیں کرتی لڑکیوں کو دیکھنے لگی تب ہی کوئی اس کے برابر میں آ بیٹھا اس نے چونک کر اپنی ساتھ والی سیٹ کو دیکھا۔ بالوں کی پونی تیل پٹائے ایک ماڈرن سی لڑکی تھی وہ کبھی بارہا سے دیکھ رہی تھی۔

وغیرہ میں جاتے ہوتا تو میں اپنے باغوں میں چلی جاتی ہوں۔ ہر سوسیزوی سبز اور درخت سے پھل توڑ کر کھانے کا موزوں سب سے جدا ہوتا ہے۔ تم تو شاید جانتی بھی نہ ہو۔" اس کی نظریں جیسے انہی مناظر کا طواف کر رہی تھیں۔

"واقعی یار! تم نے اتنی اچھی منظر کشی کی ہے کہ اب تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے یہ سب دیکھنے کو، مگر تو کسی دن چھاپے بندہاؤں تمہارے گلوں۔" اس نے شرارت سے اسے دیکھا تو وہ خوش دلی سے بولی۔

"وائے ٹاٹ بپ تمہارا دل چاہے۔"

"لیکن پہلے تو تمہیں آنا ہو گا میرے گھر۔" وہ بیک کھنگالتے ہوئے بولی۔

"وہ کس خوشی میں؟" لہ رخ کے دریافت کرنے پر اس نے ایک کارہ اس کے سامنے رکھا۔

"میرے می ڈیڈی کی ویڈیو گنگ انیور۔ ری اس ہفتے خانہ دلا میں شاندار طریقے سے منائی جا رہی ہے۔"

"کو شش کروں گی اگر گھر سے اجازت ملی تو۔" وہ کارڈ دیکھتے ہوئے ہلکی سی سے بولی تھی کہ لہاں سے اجازت ملنا ناممکن ہی تھا۔

"کوئی بہانہ نہیں تمہارا گلوں کو ن سادو رہے یہ ساتھ ہی تو کھڑا ہے اور جہاں تک سوال ہے رات کے فنکشن کا تو حالات چونکہ کچھ اتنے اچھے نہیں ہیں اور اوپر سے سردیاں اس لیے فنکشن جلد ہی شروع ہو جائے گا اب بولو!"

اس نے اصرار کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔

اس کی دعا پوری ہوئی تھی کہ ابھی تک بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ وہ گیٹ سے باہر نکلی جہاں ہادی بانیک لیے اس کا منتظر تھا۔

"بیا کمال ہیں؟" اس نے چھوٹے ہی سوال کیا۔

"ساتھ والے گلوں کا بڑا چودھری جس کو پچھلے سال فلج کا ایک ہوا تھا میں اس کی بیٹی کی شادی ہے ابو اور چچا وہیں گئے ہیں۔" اس نے بتانے کے ساتھ

ہی بانیک اشارت کر دی تو وہ سر ہلاتی اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

بادل کافی گہرے ہو گئے تھے لگتا تھا کسی بھی پل برس پڑیں گے ٹھنڈی ہوا سے سردی کی شدت میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا وہ منہ سے نکراتے تیز ہوا کے جھونکوں کے سبب اڑتے پاؤں اور دوڑنے کو پیشکل سمجھا لے ہوئے تھی۔ جیسے ہی شہری حدود ختم ہوئیں منظر اچانک ہی بدل گیا تھا ہر سو گہرے سبز چٹان سے ڈھکے مالٹوں کے درخت غراں کے موسم میں بھی عجیب ہی ہمار دکھا رہے تھے۔ سبز مالٹوں سے لدی ڈالیاں عابری سے جھکی جا رہی تھیں۔ گندم کے چھوٹے چھوٹے سبز پودے کسانوں کو آئندہ سال کے اٹن کی امید دلاتے، غراں اٹھائے کھڑے تھے۔

سڑک کے دونوں اطراف بلند و بالا، پتیل، سنسز اور سفیدے کے درخت ہوا میں جیسے جھوم رہے تھے۔ ان ہی مناظر میں کھوئے اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ گھر آ گیا وہ دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ ایک موٹی تازی پوند نے اس کا استقبال کیا وہ جلدی سے دروازہ کھول کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ ہی لمحوں میں موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی وہ کپڑے بدل کر لہاں کے پاس برآمدے میں آئی تھی جو تو توں کے لیے باہر صاف کر رہی تھیں۔

"کھانا کھاؤ۔"

"کیا پکا ہے؟"

"وہی رات کے شام۔"

"میرا جی نہیں چاہ رہا کچھ میں سموسے کھا لیے تھے۔" وہ دم آواز میں بولی نہ جانے کیوں سردیوں کی بارش اسے پیشہ آواز میں کر دیتی تھی، جو لہاں نے اسے گھورا، جانتی تھیں شام اور مٹی کی باری میں وہ ایسے ہی الٹا بگاڑ کر بیٹ بھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک لہاں کی نظر سامنے اچھی تو سر پٹ لیا۔

"اوفو۔" دیکھو تو کسدا دلخ ہے اتنے زور دلی کی بارش ہے اور تندوری دیکھنا دلی نہیں رہا ساری مٹی ہو رہی ہے۔ جاما ایجن سے رات لے کر تندوری تو

اسکد ہے جلدی ہے۔" لہاں کو ایک جی پریشانی سے لہاں کھرا تو وہ جھنجھلا گئی۔

"کیا ہے لہاں! اتنی تیز بارش ہے سارے کپڑے کپڑے ہو جائیں گے اور اوپر سے سردی۔"

"شبابش ہے جی! انہیں سردی لگ رہی ہے اور وہ پوڑی میں اس بارش میں کیلے محن میں گر کر کوئی نوڑنوا انہی تو تم خوش ہو۔" لہاں نے اسے لٹاؤ تو وہ منہ بسورتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کوئی پوڑی نہیں جس آپ ایسے ہی۔" وہ پڑھتے ہوئے تندوری کی طرف بڑھی تو لہاں نے اختیار مسکرا دیں۔ جانتی تھیں وہ غصہ کرتی ہے مگر ان سے بیا رہی بہت کرتی ہے۔ وہ رات لیے برآمد ہوئی۔

"دھیان سے چننا۔" لہاں اسے ہدایت دیتی باجرہ رکھنے اندر چلی گئیں۔ وہ احتیاط سے قدم بڑھاتی کچے محن میں آگے بڑھ رہی تھی تیز بارش میں محن کسی کھلیان کا نقشہ پیش کر رہا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ محن کے کچ وچ چاروں شانے چپ ہو گئی۔ اٹھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ سر سے اٹھتی ٹیڑھی ہو کر اکر رہ گئی۔ اسی پل دروازہ آواز سن کر ہادی نے دروازہ دروازے سے تھاناک۔

"ہیں۔ یہ کون سا موقع ہے آرام کرنے کا۔" اسے نحو استراحت پا کر حیرانی سے پوچھا تو وہ دانت چپیں کر رہ گئی۔

"ایک تو ہر ایسے موقع پر اس کی انٹری ضرور ہونی ہوتی ہے۔" جمل کر سوچی وہ اٹھ بیٹھی۔ جبکہ ہادی کو اصل صورت حال سمجھنے میں ایک پل ہی لگا اور پھر جو اس کے فلک شکاف قہقہے بلند ہوئے تو اندر سے لہاں اٹھ کر خیراں ہوئی آئیں۔

"اے ہائے۔" لہاں کی تھوڑی دھیان سے جانا گھر یہ لڑکی۔ "مٹی میں است پت اسے منہ بسورتے تو کھاتو بہت اچھوری چھوڑ دی۔"

"اور یہ تندوری ابھی تک بجی رہی ہے۔ یا اللہ! ہو گیا۔"

میں کیا کروں اس کا اس سے تو بہتر تھا خود ہی کچھ کر لیتی تھیں تندوری دیکھ کر لہاں نے سرے سے غصہ

کرتے لگیں تو ہادی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "کسی کو میری بیا نہیں گروں بھی میں اور ڈانٹ بھی میں کھاؤں۔" وہ کچھ میں تسخری ہشکل اٹھی اور باؤ اڑیلند بڑھتی برآمدے کی طرف بڑھی۔

"ہاں تو کس نے کہا تھا میں اسکی شنگ کرو خیال رکھنا چاہیے تھا کہ برف نہیں کچھو ہے۔"

وہ حسب معمول اسے چراتے ہوئے بولا تھا مگر بولا۔ "جن نفیوں سے بلا رخ نے اسے دیکھا اس کے پچھلے ہونٹ بل بھر میں سکڑ گئے۔ کیا تھا ان لگا ہوں میں شکایت! ابھن یا بے زاری وہ سمجھ نہیں سکا۔ وہ کیلے بھی اسے شک کر رہا تھا مگر ان جن لگا ہوں سے اس نے اسے دیکھا اس کر۔ لہی جی تھی۔

"شاید گرنے کے سبب زیادہ محسوس کیا ہے اس نے اور ہو سکتا ہے اسے جوت بھی تکی ہو اور بتائے اسے اٹھانے یا تکی دینے کے انامیں اس پر ہنسنے لگا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اسے افسوس ہونے لگا، جیسی بے کار اتوہ چونکا۔

"ہادی بیٹا! ذرا یہ رات تو تندوری پر دے دو ساری سہا ہو گئی۔" ان کا افسوس برقرار تھا۔

"جی اچھا۔" اس نے محن کے وسط میں پڑی پرات سے تندوری ڈھکی۔

"اس تم کیا کر رہے تھے سارے کپڑے کیلے ہو گئے اوپر سے سردی بھی بڑھ گئی ہے۔" تندوری سے دھیان ہٹاؤ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"جی وہ محن میں پڑی لکڑیاں برآمدے میں رکھ رہا تھا۔"

"اچھا۔ اچھا۔" اب جا کر نما وحو کر کپڑے بدل لو کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے میں ابھی پکڑے بنائی ہوں۔ نما کر کامل کر لھا کیں گے۔ میں ذرا جا کر اس لڑکی کو دیکھوں، منائی بھی یا ابھی تک بیٹھی دور رہی ہے۔" وہ بڑھاتے اندر بڑھ گئیں اور وہ پھر سے شرمندہ ہو گیا۔

اسے لگا آج وہ واقعی اس سے ناراض ہو گئی ہے اور یہ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے نہاتے ہی بچھا

کے گھر چلا آیا۔ چچی وی لاؤنج میں بیٹھے گرم گرم پکڑوں کے ساتھ سبز دھن کی چٹی سے لطف اندوز ہو رہے تھے وہ بھی ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ سامنے کچن کی کھڑکی سے (جونی وی لاؤنج میں کھلتی تھی) چائے بناتی بلورخ نظر آ رہی تھی اسے دیکھا تو منہ پھیر لیا وہ سر جھکا کر رہ گیا۔

"ارے بھئی ہائی بیٹی! اپنی ماں سے کو ہادی کے لیے بھی گرم گرم پکڑے لے آئیں۔" چچا نے صدا لگائی تھی کہ چچی پکڑے لیے نمودار ہوئیں۔

"مشاء اللہ! کیا سارے تازہ نکل آیا ہے پھر نہادو کے" ابھی بارش میں کیسا پگھلا کر بنا ہوا تھا! انہوں نے ہنسنے ہوئے پلیٹ اس کے سامنے رکھی۔

"چچی! ککو تو میں مانی کی مرغیوں کے لیے بنا تھا نا! سو جان کے لیے بھی کچھ بیچ ہونا چاہیے" ایک ہی مرنا دیکھ دیکھ کر بے چاری بور ہو گئی ہوں گی۔" اس نے چائے کپ میں انڈیلنے بلورخ کے عکس کو شرارت سے دیکھ کر اسے چمیزا کہ شاید اسی ہلنے وہ بولے اور ناراضی کچھ کم ہو۔

"میری مرغیوں کو تمہارے جیروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے ان کا مرنا سنا اور شریف ہے اور ان کا خیال بھی بہت رکھتا ہے۔" اس نے چائے کا کپ ہادی کے سامنے چنا اور غصے میں بولتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"ارے ارے۔" چچی اس بد تمیزی پر اسے پکارتی ہی رہ گئیں اور وہ چچا کے سامنے اس عزت افزائی پر مارے تخت کے گرم چائے کا کپ لیوں سے لگا گیا وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ وہ مرغ کی آؤ میں اسے کیا جتا سکتی تھی۔



جاتی دھوپ کی ہلکی ہلکی پر چھائیاں صحن میں موجو تھیں۔ بارش کی آڑے کر موسم سرما ہے پاؤں آنگن میں اتر آیا تھا اسی لیے دھوپ جسم اور مزاج پر ایک خوشگوار سا اثر ڈال رہی تھی۔ مرید علی کمروں کی

غٹنڈک سے خاک آف سار صحن میں چاہائی ڈالے چائے کامرولے رہے تھے سارے ٹیکم قریب ہی بیٹھی رات کے کھانے کے لیے چاول چن رہی تھیں۔

بلورخ نے تو توں کو یا جرحہ ڈالا اور مرغیوں کے ڈیپے کا دروازہ کھول کر ان کے پاس آ بیٹھی۔ مرغیاں پر پھڑپھڑاتے ہوئے سارے صحن میں بھاگنے لگیں۔ اس نے ہلکی سی سوجھوکی میں بات کرنے کی کھلتی کہ ان سے سپورٹ کی کچھ امید سرحال اسے تھی۔ گلا کھنکار کر لال کو مخاطب کیا۔

"لال! آپ سے ایک بات کرنا تھی۔" انہوں نے چاول چنے ایک نظر اسے دیکھا اور سمجھ گئیں کہ بات کچھ خاص ہے۔ "ہاں کو۔"

"لال۔! وہ میری دوست ہے نا ضویا! اس کے والدین کی شادی سالگرہ ہے مجھے بھی بلایا ہے۔" اس نے بھجکتے ہوئے مدعا بیان کیا۔

"ضویا! وہی شروالی؟" لال کو فوراً یاد آئی کہ وہ اکثر اس کا ذکر کرتی رہتی تھی۔

"اے لو۔ اب یہ شہر کی دوستیاں بھی بھائی جاتیں گی۔ مانی بی بی یہ کالج کی دوستیاں کمروں میں تمہارے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے حسب توقع اس کی بات سنتے ہی سختی سے رہ جھکت کر دی گھر ہمت نہ ہاری۔

"لال! دوست تو دوست ہوتی ہے نا! لالوں یا شہر کی تو نہیں! اور پھر میری تو ایک ہی دوست بنی ہے اب اسے بھی ناراض کر دوں اتنے اصرار سے بلایا ہے مجھے۔" وہ منہ بسور کر بولی تو پاپا پسیلی بار اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کون لوگ ہیں بیٹیا جلتی؟"

"بیٹا ویسے تو چھان ہیں! انوار خان نام ہے اس کے والد کا! حال ہی میں فیصل کیلورے لاہور شفٹ ہوئے ہیں۔" اسے جو بتا تھا سادگی سے بتا دیا۔

"ہوں۔" مرید علی نے ہنکارا بھرا "کرے کیا ہیں؟"

"اپنا پرنس ہے! کیا ہے یہ مجھے بتائیں۔"

"بیٹا ہال! جن دوستوں کے گھر جانا ہوتا ہے نا! ان کے بارے میں پہلے پوری معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔" لال نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گئی کہ واقعی اس کی لٹھلی تھی۔

"ارے بھئی! اس نے جاننا ہی نہیں تو معلومات لے کر کیا کرنا! تو جیو بھلا ماں باپ کی شادی کی سالگرہ ہے۔" مرید نے پوچھنے۔ "لال! جینجیلا کر بولیں تو وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔"

"سارے ٹیکم! ہماری بیٹی ماشاء اللہ! سمجھ دار ہے ہر بات پر یوں ڈانٹ دینا بھی دانش مندی نہیں۔ اسے دنیا کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھئے۔"

مرید علی دیکھتے تھے کہ عمو! بات آسانی سے مان جانے والی بلورخ! آج خند کر رہی تھی ڈالا کل لے رہی تھی یعنی اس فنکشن میں شرکت کرنے کی اس کی خواہش میں شدت تھی اور وہ اس خواہش کو دیا کر اس کے اندر تھی خیالات پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

"بسر حال میں رہا کرو! ناہوں! کچھ اچھے جاننے والے ہیں میرے شہر میں! کب ہے سالگرہ؟"

"پرسوں شام کو۔"

"اُوہ۔ یعنی رات کا فنکشن ہے۔" وہ سوچنے لگی۔

"بیٹا! نو! دس بجے تک تو ہم ویسے بھی سوئے ہیں! تب تک واپس آجائیں گے۔" وہ جلدی سے بولی تو پاپا مسکراتے لگے اور وہ اپنی جلد بازی پر خود کو برا بھلا کہتی سر جھکا گئی۔

"بات یہ ہے بیٹا! کہ مجھے تو پرسوں رات زمینوں کو پانی لگانا ہے تمہارے ناہا کے ساتھ۔" انہوں نے بتایا تو وہ مایوس ہو گئی! یہی کسے ہادی دروازے سے داخل ہو تو وہ چونک گئی۔

"بیٹا! میں ہادی کے ساتھ بھی تو جاسکتی ہوں۔"

ضرورت کے وقت گھر سے کو باپ بنانے والا محاورہ اسے حقیقتاً آج کچھ میں آیا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" بیٹا مان گئے تو بے اختیار لڑنے والی خوشی اس کے چہرے پر رنگین کے اترنے لگی۔

گئی۔ ہادی نے گلاب کی طرح کھلے اس کے چہرے پر ایک حیران نظر ڈالی۔

"کیا معاملہ ہے؟" بیٹا کپاس بیٹھے ہوئے اس نے پوچھا تو انہوں نے تمہا بات اسے بتادی۔

"جی! جی میں لے جاؤں گا! ایڈریس تو ہے نا! لہذا میں سرہلاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جی! کارڈ یا تھا اس نے مجھے اس پر لکھا ہے ایڈریس۔" وہ بیٹا کی طرف دیکھتی رہی۔

"کارڈ۔" بیٹا حیران ہوئے۔ "پری تقریب ہوگی؟"

"بیٹا! وہ اچھ کر جانے لگے کہ وہ پکار بیٹھی۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"گفت بھی لیتا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی تو وہ مسکراتے ہوئے بار بار ہنسنے لگے۔

"تو پیسے چاہئیں؟" وہ شرارت سے اسے دیکھنے لگے۔ "پانچ سو کفی ہوں گے؟"

"پانچ سو۔" وہ جی جی تھی۔

"اوتی منگنی ہے پانچ سو میں کیا آئے گا! اور اتنے امیر لوگ ہیں وہ۔" بتائیں کتنے تھے مگے کفنوں لائیں گے سب اور میرا پانچ سو کا! کہیں نہیں چا رہی ہیں۔" وہ نرولے پن سے بولی تو پاپا اس دیے اور ہادی دھچی سے اس کا روپ دیکھنے لگی۔

"اچھا کتنے چاہئیں؟" وہ جیب سے پرس نکالتے ہوئے بولے۔

"دو ہزار کافی ہوں گے؟"

"دو ہزار۔" لال تو اچھل ہی پڑیں۔ "ارے اتنے میں تو اچھا سودا آجائے مینے کا! پتا نہیں کون سے نواب خاندان میں دوستی کا ٹھکانہ ہے تمہارے۔" لال بنو بڑے صبر و تحمل سے باپ بیٹی کی گفتگو سن رہی تھیں آخر بول ہی پڑیں۔

"ارے! کچھ نہیں ہوتا سارے ٹیکم! اتنا تو اللہ نے دے ہی رکھا ہے کہ بھی کھسار کی اپنی بیٹی کی خواہش پوری کر سکوں اور پھر یہ تو ہماری بیٹی کی عزت کا سوال ہے۔" انہوں نے پرس سے دو سو تھار روپے گن کر نکالے۔

”ویسے بیٹا بی بی! اسی لیے کہتے ہیں کہ دوستی اپنے جیسوں میں کرنی چاہیے۔“ انہوں نے میرے اس کی طرف پوچھا ہے تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مگر انھیں سے لہجہ کی طرف دیکھتے ہوئے میرے پکڑ لیے ہو کھا جانے والی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

”کل توجہ ہے۔ پر سوں کا بج سے چھٹی کروا لیں صبح جا کر گفت کے لوں گی اور شام میں ضویا کو سر پر انڈولوں گی۔“ وہ جوش سے منصوبہ بناتی میرے رکھے اندر کی طرف بڑھ گئی اس بات سے بے خبر کہ وہ آنکھوں نے آخر تک اس کا پیچھا کیا تھا۔



پہننے کی صبح حساب رازہ اس نے چھٹی کر لی تھی اور اب وہ بابا سے بازار ملنے کو کہہ رہی تھی۔

”دیکھو مائی بیٹا! ایک تو مجھے تمہارے تلیا کے ساتھ بینک جانا ہے کسی کام سے اور پھر میں کہیں بازاروں میں خوار ہو یا پھولوں کا میں نے ہادی سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں لے جائے گی۔“ وہ کچھ حساب کتاب کرتے ہوئے قدرے ترک کر بولے تو ہادی کا من کر دیتی بھر کے بے زار ہوئی تھی۔

بہر حال وہ بازار آگئی تھی اور لب اپنی پسند کے منٹ کے لیے ماری ماری پھر رہی تھی۔ بلا آخر اسے ایک بے حد خوب صورت ڈیکوریشن پیش پسند آیا تھا۔ پر اس ٹیک پر قیمت بڑھتی وہ دکاندار کے پاس آگئی۔ اسے بیک کرنے کا کہہ کر خود پیسے نکالنے والی تھی جب ہادی نے اسے روک دیا۔

”میرے ساتھ ہوتے تم پیسے دو، مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“ کہتا ہوا وہ اپنا پرس نکالنے لگا تو مارش کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”مسٹر ہادی منصور علی! میں اپنے باپ کے گھر میں ہوں جو میری ذمہ داری بخوبی تمہارا ہے۔ لہذا آپ کو پریشان ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ایک ایک لفظ چپا چپا کر بولنے اور اس کے چوہ طبق روشن کرنے کے بعد وہ اطمینان سے بیک سے پیسے

نکالنے لگی اور دیکھو! مارش کے سامنے اس درگت پر وہ ساکت کھڑا رہ گیا پھر ایک جھٹکے سے مڑا اور دکان سے باہر نکل گیا۔

”اوندہ ڈرائے۔“ سر جھٹک کر بیک وصول کیا اور باہر آگئی جہاں وہ بایک اشارت کیے کھڑا تھا۔ ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ اس نے ایک جھٹکے سے بایک چلا دی اور مارش نے گرنے کے ڈر سے بے اختیار اسے پکڑ لیا۔ اپنی اس حرکت پر جہاں اس نے خود کو مارا وہیں قہقہے گے پلو جو ہادی کے لبوں پر مسکراہٹ ہو گئی۔ بیانی تمام راستہ گنگنا مارا اور مارش کی جانب کھاتی رہی۔

شام کو جب وہ تیار ہو کر باہر نکلے تو ہادی کے لیے خود کو جھپٹا کر اسٹاپ ہوئے لگا۔

دینے پر کچا کچا غصہ بھی بل بھی میں غائب ہو چکا تھا۔ وہ چھٹی عید پر اسی کی مائی کا رونا کولنا اور سبز سبز رنگ کا نہایت ٹھیکس سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھی۔

تھیں فٹنگ اور چوڑی داریاں تھیں اسے اس کا لباس اور خوب صورت سرلا مزید نمایاں ہو رہا تھا۔ ہادی کو سلیتے سے پاندھے۔ کالوں میں سبز رنگ کے ہی بڑے بڑے ہائیں پہنے۔ آنکھوں میں کامل اور موتوں پر لب اسٹیک لگائے اور ہادی میں گولڈن ماربل سے مزین گھسٹہ پہنے وہ کوئی منظر شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔

ہادی کے یوں مسلسل دیکھنے پر وہ اندر ہی اندر جڑ جڑ ہو رہی تھی اور جذبول کی شدت سے اوپر تکی آنکھیں اسے خائف کر رہی تھیں مگر بظاہر وہ اپنا نظرانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

لہلہ نے دیکھا تو زیر لب ماشاء اللہ کا ورد کرتی نظریں جرائیں اور اندر سے چادر اٹھا لیں۔

”بچے! یہ اچھی طرح اوندھ لو اور ہاں بڑے لوگ ہیں چلے۔“ کیسا مزاج ہو زور اوجھان سے رہتا۔ ”وہ اسے ہدایت دیتی ہادی کی طرف مڑے۔

”ہادی بچے! اس کا خیال رکھنا، بڑی سیدھی ہے میری بیٹی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”آج تو کچھ زیادہ ہی خیال رکھنا پڑے گا۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا جسے مارش بخوبی سن چکی تھی۔ جیسی تھلا کر

”اوندھ ڈرائے۔“ سر جھٹک کر بیک وصول کیا اور باہر آگئی جہاں وہ بایک اشارت کیے کھڑا تھا۔ ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ اس نے ایک جھٹکے سے بایک چلا دی اور مارش نے گرنے کے ڈر سے بے اختیار اسے پکڑ لیا۔ اپنی اس حرکت پر جہاں اس نے خود کو مارا وہیں قہقہے گے پلو جو ہادی کے لبوں پر مسکراہٹ ہو گئی۔ بیانی تمام راستہ گنگنا مارا اور مارش کی جانب کھاتی رہی۔

شام کو جب وہ تیار ہو کر باہر نکلے تو ہادی کے لیے خود کو جھپٹا کر اسٹاپ ہوئے لگا۔

دینے پر کچا کچا غصہ بھی بل بھی میں غائب ہو چکا تھا۔ وہ چھٹی عید پر اسی کی مائی کا رونا کولنا اور سبز سبز رنگ کا نہایت ٹھیکس سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھی۔

تھیں فٹنگ اور چوڑی داریاں تھیں اسے اس کا لباس اور خوب صورت سرلا مزید نمایاں ہو رہا تھا۔ ہادی کو سلیتے سے پاندھے۔ کالوں میں سبز رنگ کے ہی بڑے بڑے ہائیں پہنے۔ آنکھوں میں کامل اور موتوں پر لب اسٹیک لگائے اور ہادی میں گولڈن ماربل سے مزین گھسٹہ پہنے وہ کوئی منظر شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔

ہادی کے یوں مسلسل دیکھنے پر وہ اندر ہی اندر جڑ جڑ ہو رہی تھی اور جذبول کی شدت سے اوپر تکی آنکھیں اسے خائف کر رہی تھیں مگر بظاہر وہ اپنا نظرانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

لہلہ نے دیکھا تو زیر لب ماشاء اللہ کا ورد کرتی نظریں جرائیں اور اندر سے چادر اٹھا لیں۔

”بچے! یہ اچھی طرح اوندھ لو اور ہاں بڑے لوگ ہیں چلے۔“ کیسا مزاج ہو زور اوجھان سے رہتا۔ ”وہ اسے ہدایت دیتی ہادی کی طرف مڑے۔

”ہادی بچے! اس کا خیال رکھنا، بڑی سیدھی ہے میری بیٹی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”آج تو کچھ زیادہ ہی خیال رکھنا پڑے گا۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا جسے مارش بخوبی سن چکی تھی۔ جیسی تھلا کر

لہلہ نے دیکھا تو زیر لب ماشاء اللہ کا ورد کرتی نظریں جرائیں اور اندر سے چادر اٹھا لیں۔

”بچے! یہ اچھی طرح اوندھ لو اور ہاں بڑے لوگ ہیں چلے۔“ کیسا مزاج ہو زور اوجھان سے رہتا۔ ”وہ اسے ہدایت دیتی ہادی کی طرف مڑے۔

”ہادی بچے! اس کا خیال رکھنا، بڑی سیدھی ہے میری بیٹی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”آج تو کچھ زیادہ ہی خیال رکھنا پڑے گا۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا جسے مارش بخوبی سن چکی تھی۔ جیسی تھلا کر

”وہ یہ کہ پہلے تم کو کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تو وہ گڑبڑا گئی۔

”اوکے۔۔۔ میں ناراض نہیں ہوں۔“ قدرے توفیق کے بعد وہ بولی تو وہ خوش ہو گیا۔

”یہ ہوئی بات۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ویسے آج میں تمہیں ناراض رہنے بھی نہ دیتا۔“ مگر یہ نظریں کے سراپے پر ڈال کر کتا رہا بایک ہنگامہ کر لے گیا تو وہ در تک اسے جانے دیتی رہی۔

”بہیو بیٹے کی کوشش۔“ وہ سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور وہاں تو جیسے رنگ بولو کا ایک جہاں آباد تھا۔ اونچی سوسائٹی کی چکا چوند کو دیکھتی وہ جھٹک کر ترک گئی کہ پہلی بار کسی ایسے فنکشن میں آئی تھی۔ اس کی متاشی نظریں ضویا کو صوبنے لگیں جو ایک بینک سے جوڑے کے پاس کھڑی تھی وہ جو کھیرا رہی تھی بے اختیار اسے پکار رہی تھی۔ سب نے مڑ کر اسے دیکھا تو وہ اپنی بے وقوفانہ حرکت پر شرمندہ ہو گئی جیسی ضویا چلی آئی۔

”ارے مارش! تم مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ وہ خوشی سے اس کا ہاتھ تمام کر رہی تھی۔

”او تمہیں می سے ملوانی ہوں۔“ وہ اسے لیے ایک اسارٹ سی خاتون کے پاس چلی آئی۔

”مئی! یہ مارش ہے، میں نے آپ سے ذکر کیا تھا نا۔“ اس کے تعارف پر انہوں نے مسکرا کر سر ہلادیا۔

”بہیو بیٹے! سنا ہی ہو سہی آئی!“ اس نے انہیں دس کرنے کے ساتھ گٹ آگے بڑھایا۔

ضویا جانتی تھی کہ وہ کتنی ریزرو لڑکی ہے اور خاص کر انہیں لوگوں سے کتنا گھبراتی ہے لہذا اسے لے کر ایک فیسٹا کوئے والی فیلڈ کی طرف چلی آئی۔ وہ بیٹھی لوہر لوہر کی باتیں کر رہی تھیں جب کوئی ضویا کے پیچھے آکر ہوا۔

”ضویا!“ سنجیدگی سے پکارا تو ضویا بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”بی مائی!“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے

”میں نے پچا کو جو لب دتا ہے اس لیے میں تو کہیں نہیں جا رہا اور پھر تمہارے سامنے ہی تو چینی نے مجھے تمہارا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی، لب میں ان دونوں کے اٹھو کو دھوکہ تو نہیں دے سکتا۔“ وہ اطمینان سے کتا گیت کے ساتھ بنے چوہارے پر بیٹھ گیا تو مارش جھنجھڑا گئی۔

”کیا ہے۔۔۔ جب انہوں نے تمہیں بلایا نہیں تو اب بعد میں بلایا جاتا تھا لگتا ہے کیا۔“

”ہاں! یہ بات قابل غور ہے۔ ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں مگر ایک شرط ہے۔“

”اب کیا ہے؟“ اس کی پہلی بات پر آنا اطمینان ملی بھر میں رخصت ہو گیا۔

دیکھا۔

"بھائی! یہ میری دوست اور کلاس فیلو ہے مہاروخ اور مہاروخ نے زلیوار بھائی ہیں۔"

اس نے اٹھتے ہوئے تعارف کر دیا تو اس کی بدحواسی پر حیران ہوئی مہاروخ نے سلام کیا تو وہ ہوتا ہوا اسے دیکھ رہے تھے چونکہ گئے "سر ملا کر جواب دیا اور ضویا کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ماہی کافون ہے کیسذا سے تم سے بات کریں گی۔"

"جی۔۔۔" وہ چلتی مڑ کر مہاروخ کو جانے کیا اشارہ کیا اور اندر پرہہ گئی۔ زلیوار خان گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

اس پر بڑی پہلی نظر نے ہی انہیں چونکا دیا تھا۔ وہ اتنی ہی معصوم اور سادہ تھی جتنی کہ وہ چاہتے تھے ان کے طبقے کی طرح دار اور بے باک لڑکیوں سے یکسر مختلف مام اور ڈنڈا اپنی پسند کی ان ہی مغرب زدہ لڑکیوں کے لیے اصرار کر رہے تھے جن سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ وہ کسی ایسی لڑکی کے متلاشی تھے جس کی طرف سے ان کا دل مطمئن رہے اور جوان کی ہر بات بیاچارہ پران مان لے اور ایسی لڑکی انہیں مل کے نہیں دے رہی تھی مگر اب اسے دیکھ کر لگا کہ جیسے ان کی تلاش ختم ہوئی ہو۔ وہ ضویا کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس نے گہرا کر ضویا کو تلاش کیا مگر۔

"کہاں رہتی ہیں آپ؟" بڑبڑا کر اوپر دیکھا وہی کو شہر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے شہر نگاہوں سے دیکھا لیں۔

"جی گاؤں میں۔" کسی اجنبی موے سامنے بیٹھ کر بات کرنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا اسی لیے آواز میں کچکا پھاٹ تھی۔

"اچھی زمینیں ہیں؟" آواز میں موجود نرمی سے اسے حوصلہ ہوا تھا۔

"جی۔۔۔" ٹھوڑی بدستور گردن کے ساتھ جڑی تھی۔

"میں اتنا خوف ناک تو نہیں کہ ایک نظر بھی نہ ڈالی جائے۔" شرارت سے وہ بٹے کے بالے میں مقید

معصوم چہرے کو نگاہوں میں لے کر بوجھا گیا تو وہ حیران ہو گئی۔ سنجیدہ چہرے پر بدھم سی مسکراہٹ اور آنکھوں سے جماعتی شرارت نے اندر ڈپل پھیل چا دی تھی۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

مسکرا کر انہیں دیکھا وہ نہں نہ۔ "اچھا؟"

توجہ کی شام جس میں انہیں پہلے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اچانک بے حد خوب صورت ہو گئی تھی۔ سلیقے سے وہ پتہ سر پر اوڑھے قد رے گہرائی کی مہاروخ لان میں موجود بے باک اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی لڑکیوں میں سب سے منفرد اور ان پھولی گئی تھی۔ جیسے بیلے کی ہانڈ اور شفاف کلی۔

وہ اسے دیکھ رہے تھے اور اسے لگا دل اس کی آنکھوں اور چہرے پر دھڑکنے لگا ہے۔ ایک عجیب سا احساس تھا جو اسے اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ تب ہی ضویا آئی دیکھائی دی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کھر جا کر اپنی نظر ضرور آکر لیجیے گا، مشورہ مفت ہے۔" کہتے ہوئے وہ بیلٹ گئے اور وہ ان کی چوڑی پشت دیکھ رہی تھی۔ بیل پر وہی سی مسکرت چہرے پر گامیاں ضویا آئی تھوٹ گئی۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" اس کا لہجہ مشکوک تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" اس نے بے اختیار چہرے پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے کچھ مٹانا چاہتی ہو۔

"پھر بھی۔" وہ مطمئن نہ ہوئی۔

"ہاں تمہاری اسٹڈیز کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور یہ کہ ہماری دوستی کب سے ہو وغیرہ۔"

"اچھا۔" اسے یقین نہ آیا۔ "خیر چلو ایک کھٹے والا ہے۔" وہ اسے لے کر تھیل کی طرف آئی۔

پھر کھانا لگا دیا گیا کافی پوری تھی بہت سی ڈشز کے تو وہ نام بھی نہ جانتی تھی۔ اس لیے وہ ہر قسم کی کھکھش سے بچتے ہوئے ٹھوڑی سی برائی کی باب اور سلاڈیلیٹ میں ڈال کر اپنی تھیل پر آئی تھی۔ ضویا آواز میں میزبان ہونے میں مصروف تھی۔ ایک کھٹے سے اب تک وہ مسلسل خود کو کسی کی نگاہوں کے حصار میں محسوس کر

رہی تھی اور ابھی طرح جانتی تھی کہ وہ نظریں کس کی طرف مڑ رہی تھیں۔ اس لیے ان نگاہوں کا انہیں طرف آنا نظر آیا۔

"اے۔۔۔" وہ اوپر اٹھ کر دیکھنے لگی۔ زلیوار خان کی غصہ کی بات میں رعب اور دبید ہی اتنا تھا کہ چلیں اٹھ کے ہی نہ رہتی تھیں۔

"کی چیز کی ضرورت تو نہیں۔"

"جی نہیں شکریہ۔" وہ مسکرائی۔

"اوسے تب نے کچھ لیا ہی نہیں۔" وہ اس کی بات دیکھ کر کہے۔

"نہیں کٹانی ہے۔" وہ خواستوار شرمندہ ہو گئی تو وہ سر ہلاتے کھانے کی طرف پرہہ گئے اور کچھ ہی دیر میں ملازم تین پلٹوں میں مختلف چیزیں بھر کر لے آیا۔ تو وہ اسے دیکھ کر کہہ گئی۔

"صاحب کہہ رہے ہیں جو چیز دل چاہے لے لیجیے۔"

وہ پیغام پڑھا تو اب اسے چلا گیا تو وہ انہیں مختلف لوگوں سے باتیں کرتے دیکھنے لگی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اسے اپنی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہے اور وہ خود کو واقعی سخت سے سر جھکا گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ کھانے کے آکر پیغام دیا کہ اس کا بابا آیا ہے تو وہ باہر آ گئی۔ شہنشاہی کھڑا تھا۔

"اتنی جلدی آگئے تم؟" اس نے بچے کا کہا تھا۔ "اس نے کھائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا جو ساڑھے نو بج رہی تھی۔"

"مختصر۔" اچھا کا وہ مرتبہ فون آچکا ہے کہ وہ پانی لگانے جا چکے ہیں اور اسی اور پٹی کھرہ اکیلی ہیں جس لیے جلدی ہو رہی۔ "اس کے سننے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اصل بات بتائی تو وہ بے بس ہو گئی۔

"اچھا ضویا کو تو بتاؤں کہ جاری ہوں۔"

"وہ منٹ میں۔" اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا تو وہ ہنسی اندر چلی گئی۔

"یہ پیار سے بولتی سیسی لگے گی۔" وہ سوچنے لگا۔

ضویا کو بتایا تو وہ روزے تک آئی۔ "کون آیا ہے لینے؟"

"کزن سے لیا زاد۔" اسی کے ساتھ آئی تھی۔ ہمارے ساتھ ہی گھر ہے ان کا۔" وہ تفصیل بتاتی کسی کو دھونڈتی رہی۔

"اچھا تم نے بتایا ہی نہیں۔" ضویا حیران تھی۔

"کبھی خیالی ہی نہیں آیا۔" وہ مسکرائی، تلاش بدستور جاری تھی۔

"اچھا خدا حافظ۔" اس نے آخری نظر لان پر ڈالی اور میزبانی باہر آ گئی۔

آج تو ایسا جیسے آنکھوں سے روٹھ ہی گئی تھی۔ وہ جب سے پانی سے تلی تھی ایک عجیب سی بے چینی رک و بے میں خون کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ وہ جو نو بیٹھے ہی خینو سے مدہوش ہونے لگی تھی آج بلو جود ٹھکن کے جاگ رہی تھی۔

"شاید میری طرح کوئی اور بھی۔" ایک خیال اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر ٹھکر گیا۔

زلیوار خان پائل اس کی سوچوں کے عین مطابق تھے۔ ان میں وہ تمام خیالیں تھیں جو اسے صوبوں میں ابھی لگتی تھیں۔ لہذا جو ڈاکٹر کہ جس کے چہرے اگر کوئی چھپ جائے تو دنیا کی نظریں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں۔ مضبوط پانڈ کہ جن کو دیکھتے ہی تحفظ کا احساس ہونے لگے یہ احساس کہ ان کے ہوتے کوئی معصیت کوئی پریشانی آپ کو نہیں چھو سکتی۔ نظریں اتنی گہری کہ اندر اتر کر بیل بحر میں دل کے سارے عہد جان لیں۔ ثقافت لہجہ مضبوط چال مسجد اندازہ اطوار۔ دھیمی سی مسکراہٹ "بلو قار شخصیت۔" یکدم ذہن کے کیوس پر زلیوار خان کا سر لہا ہوا۔

"کھر جا کر اپنی نظر ضرور آکر لیجیے گا۔"

وہ چونک گئی "کدھر کدھر دیکھا پھر ماتھے پر ہاتھ مار کر ہنس پڑی۔

رات کے بارہ بج رہے تھے وہ تنگ آکر اٹھ بیٹھی۔ ایک نظر گہری خینو سولی لہا کو دیکھا اور شال اٹھا کر باہر نکل آئی۔ بارش کے بعد سے گھنٹوں میں شدت آچکی

تھی۔ وہ مثل اچھی طرح اپنے گرد لپٹی جھٹ پر چلی آئی۔ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر سو سفید چاندنی کا راج تھا۔ آسمان سے نور برس رہا ہے۔ چاند کی پر اسرار خاموشی پر ہر شے جیسے دم سلو ہے اسے ہی تک رہی تھی۔ اس نے اس سحر زدہ ماحول کو ایک گہری سانس کے ذریعے اپنے اندر جذب کیا اور ارد گرد دیکھا۔ بڑے بڑے پتھر خاموشی سے سر جھکائے ٹھہرے۔ "تھوڑے مطلق کی طاقت کے سامنے اپنی بے بسی تسلیم کر رہے تھے۔ کیونکہ پناہ میں کچھ لائیف لائنیں ابھر اوجھر گردش کر رہی تھیں۔ سرکاری پالیسی کی باری کے لیے کسٹن اپنی نیند کی قربانی دیے۔ زمینوں کو سیراب کر رہے تھے۔"

کسٹن کی سانس بھی جیسے موسموں کے ساتھ بڑی ہوتی ہے۔ فصل کی دیکھ بھل میں نہ دن کا خیال نہ رات کی پروا اور نہ نیند آرام کی فکر۔ زمین ہی زندگی اور زمین ہی محبت اور سال کے آخر میں جب فصل یک کر تیار ہو جاتی ہے تو کسٹن کی انگلیں بھی جھان ہو جاتی ہیں۔ ہر روانہ اس کی محنت کا خران اور مستقبل کا تئیں ہوتا ہے۔

دلچسپ کردار چاند کو دیکھنے لگی۔
بھروسہ کر لوں
ساتھ بھانوں کا
ستاروں کی بونیا میں
تم کو لے جاؤں گا
کر لو میرا اعتبار چلو
چاند کے پار چلو
چاند کے پار چلو

کوئی خوب صورت اور وحشی آواز میں بہت سُر کے ساتھ گارہا تھا۔ چونک گئی۔ آواز کہیں قریب ہی سے آئی تھی۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ آہستگی سے چلتی ہوئی آئی اور ساتھ والی چھت پر جھانکا۔
"تم۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ہادی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ چمک کر کھڑا ہو گیا۔
"ہائیں، تم آج رات کو یہاں کیا کر رہی ہو؟"

ہادی نے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں۔
"میں۔" وہ گڑبڑائی۔ "وہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو چل بیٹھی کرتے ملی آئی۔"
"خیر ہے؟" اس نے پوچھا۔
"وہی ہے۔ خوش آندہ بات ہے کہ تمہاری اور میری نیندیں بھی اب مشترک ہو چکی ہیں۔"
"جی نہیں۔ منہ وجود رکھنا پڑا۔ مجھے تو اس لیے نیند نہیں آ رہی تھی کہ فنکشن کی وجہ سے نیند کا نام گزر گیا تھا۔"

"اچھا۔" ہادی قدرے مایوس ہوا۔ "وہی مجھے نیند نہ آنے کی وجہ ہرگز نہیں ہے۔"
"تو پھر کیا وجہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"لکھنؤ کی شام کو میں نے آسمان سے اتنی ایک پری کو دیکھ لیا تھا جس تب سے نیند ایسی اڑی کہ آگے ہی نہیں دے رہی۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" وہ دیوار پر بازو دکھائے شرارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سچا کر نظروں کا زوئیہ بدلا۔

"مجھے کیا پتا کسی پری سے جا کر پوچھو۔" وہ بات ختم کرنے لگی۔

"اسی سے تو پوچھ رہا ہوں۔" اس کا ہونہار گہیر تھا۔
"مارخ نے بے اعتبار اسے دیکھا جس کی آنکھوں میں شوق اور چاہت کا آگ جھان آ رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر نہ دیکھ سکی اور خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی کہ یہ آنکھیں اس کی منزل نہ تھیں اور اب تو بالکل نہیں۔
"سنو مائی!" وہ رک گئی مگر چلتی نہیں۔
"میرے ساتھ چلو کی؟" اس نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"چاند کے پار۔" وہ اس کے چہرے میں چاند کو دیکھنے لگا۔

"تم نے لی اے سے آگے کیوں نہیں بڑھا؟"
"مارخ نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تو وہ اس کے بات بدلنے پر غصہ دیا پھر سڑکی سے کہنے لگا۔
"ابو اور بچا پر کام کا بہت لوڑ تھا انہیں گھر اور زمین دونوں کو دیکھنا پڑا تھا اور مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ

ایک ہوانہ بننے کے ہوتے وہ یوں بلکان ہوتے پھر اس کو آگرمیں انہیں مدد کے لیے کتا بھی تو وہ میری برصالحی کے خیال سے انکار کر دیتے لہذا میں نے کرپویشن کے بعد برصالحی کو خیر یاد کہہ دیا۔ حالانکہ میرا ذرا راحت میں ایم اے کا ارادہ تھا مگر خیر۔ آخر سب اونی رنجھے رہیں ہی ہیں نا!" اس نے دور چمکتے روشن ستارے کو دیکھا پھر تنک کر اس سے پوچھا۔
"نہیں یہ خیال کیسے آیا؟"

"وہ ضویا کے بھائی ہیں نا زلیوار خان انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا ہے۔" وہ برصالحی میں کہتے کہتے رک گئی تو وہ اس کے چہرے پر کچھ کھوٹے لگا۔ اس کے انداز بدلے بدلے لگ رہے تھے ہادی کو ایسا محسوس ہوا مگر اس کے اندر کہیں بہت زور سے لارم بجا تھا۔

"تم نے کہاں دیکھا؟"
"آن لائن فکشن میں ہی۔" وہ بول کر پچھتائی۔
"اچھا میں چلوں۔" مجھے نیند آ رہی ہے۔" مزید وہ اس سے بچنے کے لیے سیڑھیوں کی طرف مڑی۔
"اور میرا سوال۔" مارخ نے ایک نظر اسے دیکھا۔
"سیڑھیوں اتر گئی۔"

ہادی کی پُرسوج نظروں نے جب تک کہ وہ درعے میں غائب نہیں ہو گئی اس کا پیچھا کیا۔ وہ مغرب کی سمت محو سفر چاند کو دیکھا پھر سے وہی لفظ سنانے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆
پھر ایسا ہونے لگا کہ ضویا اکثر زلیوار خان کا ذکر کرتے تھی۔ جی ان کی زندگی بابت نہ کبھی مزاج اس کا ہر عضو سماعت بن جاتا اور گھر آکر بھی کھنوں وہی باتیں سوچتی اور مسکراتی رہتی۔ لہٰذا کی ہر بات خاموشی سے مان لیتی۔ نہ غصہ کرتی نہ پیر چنتی کئی حیران ہوتی رہتیں اور ساتھ ساتھ پریشان بھی۔ ہادی جان بوجھ کے چھیڑنا وہ پھر بھی نہ چڑتی تو مایوس ہو کر کہتا۔
"زندگی سے مزید اٹھ گیا ہے۔"

ایک دن ضویا نے اس سے براہ راست بات کی۔
"بھائی اکثر تمہارا پوچھتے ہیں۔" وہ چوکی زلیوار خان کے پوچھنے پر نہیں بلکہ ضویا کے انداز پر اس کا لہجہ عام نہیں تھا۔ وہ غور ضویا کا چہرہ دیکھنے لگی۔
"کیا اسے زلیوار خان کا اس کے بارے میں پوچھنا اچھا نہیں لگتا تھا؟" وہ سمجھ نہیں پاتی۔
"تم نے جواب نہیں دیا۔" اس نے گہری نظروں سے مارخ کا جائزہ لیا تو وہ قصداً مسکرائی۔
"اچھا کیا پوچھتے ہیں؟"

ضویا نے گہری سانس خارج کی۔ "میں کی تم کالج آتی ہو کہ نہیں، تمہاری دوستی کسی جا رہی ہے۔؟ تمہارا گھر کبلا ہے وغیرہ۔"
"اور تم کیا کہتی ہو؟" اس نے ضویا کا رد عمل جاننا چاہا۔

"میں نے سہ دیا کہ میں نے تمہارے گھڑوں کے بارے میں کبھی پوچھا نہیں تو ناراض ہونے لگے کہ مجھ پر بدست ہو تم دوست کے گھر کا نہیں بنا اب جا کر پوچھ لیتا۔"
"تو تمہیں برا لگتا ہے جب وہ میرے بارے میں بات کرتے ہیں۔" مارخ نے اس کے چہرے پر کچھ دھونڈنا چاہا۔
"شاید۔ شاید ہاں۔" اس کا انداز جسم تھا۔
"پتا نہیں کیا بات ہے مارخ! تم مجھے بہت عزیز ہو گئی ہو۔"

اس نے دور آسمان کی دستوں میں پرواز کرتے پنچھی کو دیکھا اور پتہ لینے اٹھ گئی۔ اس نے دور جاتی ضویا کو اٹھ کر دیکھا اور پھر اس پنچھی کو بوجھ تک کر پڑ پڑتے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
روز و شب کسی بیش قیمت موتی کی طرح وقت کی جھولی میں گر رہے تھے۔ اس کی اور ضویا کی شگفت کے بیشتر لمحات خاموشی کی نذر ہو جاتے تھے۔ ضویا اکثر دور خلاؤں میں دیکھتی جاتے کیا سوچتی رہتی تھی۔ شاید

اسے زاویہ رخان کا اس میں بڑھتی ہوئی دلچسپی لگتی رہی تھی مگر مہاراجا کو حیرت ہوئی کہ آخر ضویا کو زاویہ رخافت اور اس کا اعتراض ہے اپنی دوستوں کو بھابھی بتانے کے لیے تو لڑکیاں ایزی چلی کا زور لگاتی ہیں اور ضویا جس کے لیے آواز پیدا ہو رہے تھے تو وہ کتھاری تھی بلکہ کچھ کم عمر بھی تھی۔ بلاشبہ دلچسپی جاتی اور بعض اوقات ثمرتہ بھی کہ شاید ضویا کسی اور کو اس حیثیت سے پسند کرتی ہو اور اب زاویہ رخان اور اس کی پسند اس راہ میں حائل ہو رہی ہو۔ گو کہ اس سلسلے میں ابھی تک اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

دو دن سے ضویا کچھ نہیں آ رہی تھی مہاراجا کو فکر ہونے لگی تو اس کا موبائل نمبر لایا۔ سیل فون مسلسل آکٹ جا رہا تھا۔ اس نے دھونڈ ڈھانڈ کے لینڈ لائن نمبر پر کال کی۔ تیل مکمل جا رہی تھی۔ جب وہ مایوس ہو کر کال ڈراپ کرنے لگی تو ریسیو کر لی گئی۔

"ہیلو۔" بھاری گیس آواز نے اس کے الفاظ کو ساکت کر دیا۔ اسے امید نہ تھی کہ اس وقت زاویہ رخان گھر پر موجود ہوں گے۔

"کون ہے؟" اس بار آواز میں سختی نمایاں تھی۔ اس سے پہلے کہ کچھ سخت سننے کو ملتا اس نے فہر کر سلام کر دیا۔ دوسری جانب پل بھر کو خاموشی چھا گئی۔

"ضویا ہے نہیں مہاراجا بات کر رہی ہوں۔" اس نے بے تحاشہ تعارف کر دیا تو دوسری طرف کمری سانس خارج ہوئی۔

"اوہ تو آپ ہیں؟" وہ نصیب کہ آج آپ سے بات ہو رہی ہے یہی ہیں آپ؟" جسم گمبیر لہجہ بہت اپنا اپنا لگا۔

"جی ہر تہ۔ آپ کیسے ہیں؟"

"ہم تو بس عمو بخار ہیں۔ آپ نے تو جانے کے بعد خبری ندی مڑنے دیکھا ہی نہیں کہ رستہ سنسان رہا آپ کے قدموں کے نقش و صورت تا پھرتا ہے۔"

خاصا شاعرانہ لہجہ تھا۔

"جی وہ پھر کوئی موقع ہی نہیں ملا آپ کے گھر آنے

کا۔" اس نے ہلکی کر وضاحت دی۔

"میں کمری نہیں دل کی بات کر رہا ہوں۔ کبھی آئیے نا۔ یہ راہ صرف آپ کی چاب پہنچاتی ہے۔"

جانے کیا تھا جس سے کچھ میں کی گئی اس سرگوشی میں کہ مہاراجا کو اپنا آپ بھولنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ساری کائنات دم ساڑھے کھڑی ہے۔

"آپ نے جواب نہیں دیا میں خنجر ہوں۔" وہ فوراً سنہل گئی۔

"دل کا معاملہ تو خالصتاً آپ کا اپنا ہے۔ میں تو صرف گھر کا رستہ جانتی ہوں۔" گواڑ میں مسکراہٹ نمایاں تھی۔ زاویہ رخان دل کھول کر رہے۔

"خوب۔ تو ایسا کرتے ہیں کہ آپ کو گھر تک لانے کا بندوبست کرتے ہیں پھر دل کے معاملات بھی طے کر لیں گے کیا خیال ہے۔" انداز شرارتی ضرور تھا مگر بات واضح تھی۔ دل تھا کہ دیواریں توڑنے کے درپے تھا اب مزید بات کرنا مقل پر اس کی بوکھلاہٹ آشکار کر دیتا اور یہ وہ قضی نہیں چاہتی تھی۔

"ضویا کو کتنا دیکھ گا کہ میرا فون تھا۔ اچھا خدا حافظ۔" اس نے جلدی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اور اپنی دھڑکنوں کو سنبھالنے لگی۔ پھر سوچنے لگی تو فوٹو ابول کے درمیان اک انجیل مگر مسکور کن خوشبو سے مٹکنے لگے تھے۔ خزاں میں بھی ہمارے سارے رنگ رقصاں تھے۔

شام میں وہ اپنے کمرے میں بند پڑھیں کتابیں پھیلانے بیٹھی تھی۔ ایک کتب سانسے کھلی پڑی تھی۔ وہ بے توجہی سے چوٹیاں کھمکائی جانے لگیں خیال میں کہ کچھ دیکھیں گی مکان نے چہرے پر ایک نرم سا تاثر پھیر رکھا تھا۔ لہذا اس کے انداز کھنجر کر دیکھے اور اندر آ گئے۔

"مرحہ تو تم رہی نہیں ہو۔" میرا تھہ ہی بنا دیتیں۔"

ان کی گواڑ سن کر وہ چوکی۔

"جی لہذا۔! مجھ سے کچھ کہا؟"

"کن سوچ میں ہو کہ دھیان سے بڑھتی ہو نہ کھاتی ہو اور تو اور تمہارے دونوں اور سرخیوں کو بھی

دیکھ رہی ہو۔" گھٹا پڑتا ہے۔ لہذا اس پر کمری نظر تھی وہ گزرتی تھی۔

"کچھ بھی تو نہیں لہذا آپ جانتیں کوئی کام تھا؟"

اس نے لہذا کے عجیبہ چہرے کو دیکھ کر بات بدلی۔

"کچھ بات کرنی تھی تم سے۔" ان کے انداز کسی خاص بات کا اشارہ دے رہے تھے وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور سوالیہ نظریں ان کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"تمہاری باتی آتا چلا رہی ہیں۔" تو آخر وہ کراہی ہو کر تھن پانچا۔ اس نے خود کو مضبوط کیا اور انجیل بن کر ہولی۔

"تو۔" باتی تو آتی ہی رہتی ہیں۔"

"دراصل ہم تمہاری اور باوی کی مشکلی کرنا چاہ رہے ہیں باقاعدہ طریقے سے اس عید پر۔" انہوں نے کھل کر بات کی تو اس نے بھی بات مٹا کرنے کی کھائی۔

"مجھ سے تو نہیں پوچھا آپ نے؟"

"تو تم سے کیا پوچھتا کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہاری اور باوی کی بات بچپن سے ملے ہے۔" لہذا نے اسے کھرا ل۔

"بچپن سے نہیں لہذا! میری پیدائش سے۔"

پہلی اس بار سے میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔

"تو اب کہہ لو اب تو کہہ سکتی ہو نا! لہذا کو اس کی لہذا رازازی بیٹھ مشغول کرتی تھی۔ اسی لیے وہ محتاط انداز میں ہولی۔

"لہذا! مجھے باوی سے شادی نہیں کرنی۔ بہت دھمکائی سے ہی سہی مگر اس نے کہہ دیا تھا جسے سن کر لہذا کو جھٹکا لگ گیا۔

"ا! کیا باتی ہے اس میں۔" شراب جیتا ہے۔" تو اور لہذا نے اسے ساتھ کوئی لفظ حرکت کی ہے اس نے؟

"ا! کیا بات ہے؟"

"ا! کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی باوی میں کوئی بات ہے۔" اس نے کچھ اس کے انداز سے نہیں کہا۔ ہر لہذا کا اپنی کھنڈل، فضاں اور اوچھی حرکتیں، کھنڈل اپنی کھنڈل یہ سب سخت نا پسند ہے۔ آپ باقی

ہیں مجھے سنجیدہ اور سویر لوگ اچھے لگتے ہیں اور کسی کی وقت تو میں یہ سب برداشت کر سکتی ہوں مگر ہر وقت کا طوق گھٹیں نہیں ڈال سکتی۔"

وہ جھٹکا کر بول رہی تھی اور لہذا ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھیں جس چیز کو وہ اس کی فوجی چرچا بٹ سمجھ کر آج تک نظر انداز کرتی رہی تھیں وہ جسم ہو کر سامنے کھڑی تھی وہ بیڑ پڑھے لکھے۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس کی خوش مزاجی اور معصوم شرارتوں کو اس انداز میں لو لے۔"

اسے وہ تو صرف تمہیں شک کرتا تھا اور اس کا خیال ہے ہی کون، مگر تم پر نصیب اس کی محبت کو سمجھ ہی نہیں سکیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے باپ کی محبت کا ہی خیال کر لو اور یہ بھی نہیں تو دونوں گھروں کے تعلقات کا ہی کچھ احساس کر لو۔ کیوں محبتیں برباد کرنے پر تلی ہو۔" لہذا کا ٹوٹا ٹوٹا لہجہ اسے کمزور کر رہا تھا اور وہ کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

"لہذا! اگر کیا ہو مجھ سے محبت ہے تو انہیں میری خوشی ہی سب سے زیادہ عزیز ہوگی۔" اور لہذا باتی سے ہمارے تعلقات کوئی اس رشتے کی وجہ سے تو نہیں ہیں۔ اس لیے اگر یہ رشتہ نہ جی ہو تو تو کیا کے بھائی بھابھی ہی رہیں گے۔"

وہ سر جھکائے اپنے موقف کے حق میں دلائل پہ دلائل دے رہی تھی یہ دیکھے بغیر کہ اس کی ماں کے دلائل "اولاد کے توڑے ہوئے ماں کی کرچیوں میں لولہاں ہے بس بڑے تھے۔"

"ماں! ایس کوئی اور تو نہیں؟" انہوں نے انجیلانے خوف کے تحت پوچھا تو وہ پل بھر کو خاموش ہو گئی۔ پھر سوچا کہ ابھی اسے زاویہ رخان کے بارے میں لہذا کو کچھ نہیں بتانا چاہیے کہ ان کو پہلے ہی اس کے انکار نے شدید دھچکا پہنچایا تھا اور ایسے میں زاویہ رخان کا نام لیتا خود ہی اپنے پاؤں پر کھڑائی مارنے کے مترادف تھا۔ مگر کوئی میں بلا دیا۔

"نہیں لہذا! ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر پھر بھی میں باوی سے شادی نہیں کروں گی۔"

اس کے لیے کی مضبوطی سے ہادی کا ہاتھ لگایا اور کالج کے برتن بچا گئے۔ وہ جو برتن واپس کرنے گیا تھا کہ اپنا نام سن کر قدم خم گئے۔ پھر جو کچھ اس کے کالوں نے سنا تو دل نے جیسے دھڑکنے سے ہی انکار کر دیا۔ برتن کھینکنے کی آواز سے ماہر اور لالہ چونک گئے مگر جب ٹنل لالہ اٹھ کر باہر جاتیں وہ برتن میز پر رکھ کر جا چکا تھا۔ ساتھ ساتھ بیگم نے دروازے کے پیچھے غائب ہونے ہادی کی پشت کو دکھ اور حسرت سے دیکھا۔ "اسی لیے کتنی بھی مرید علی سے مت پر حوا سے شہر کے کالج میں مگر کسی نے میری نہیں سنی۔ اب بتاؤں گی اس کے باپ کو خود ہی بات کرے گا اپنی لادنی سے۔" انہوں نے کہا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور علی گئیں۔

ماہ رخ کو کچھ سکون ہوا کہ ایک مرحلہ تو ختم ہوا اب باپ کے بات کرنے سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ایک مل کو اسے ہادی کے لیے بھی انوس ہوا تھا پھر بے بسی سے سر جھٹک دیا۔ مگر پھر یوں ہوا کہ اگلے صبح صبح سے دن گزر گئے۔ بیابانے اس سے بات کی اور نہ ہی لالہ نے دوبارہ یہ موضوع چھیڑا۔

اس دن کے بعد اس نے ہادی کو نہیں دیکھا تھا۔ لالہ کا رویہ بھی بہت عجیب تھا کوئی کام کرنے کو نہ کہتیں۔ وہ خود سے ہی کچھ کر دیتی تو ٹھیک ہے ورنہ اکیلی گئی رہتیں۔ نہ اسے باتیں نہ ڈانٹیں۔ وہ شرمندہ سی ہو جاتی۔ بابا بھی خاموش سے ہو گئے تھے۔ پہلے کی طرح ہنسنے نہ بات کرتے، وہ انہیں دیکھتی رہتی مگر بانی کی ہمت نہ ہوتی۔ پھر خود کو تسلی دیتی کہ یہ سب فطری تو عمل ہے۔ آخر اس نے ان کی برسوں کی خواہش کو رد کیا ہے اتنا تو ان کا حق بننا ہی ہے البتہ کیا تلی کا رویہ بالکل ہی تھا شاید ان کو کچھ بتایا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ سوچتی رہتی پھر سر جھٹک کر زوایار خان کے خواب پلکوں پر سجا کر آنکھیں موندتی اور مسکرا دیتی۔ ان کے لب و لہجے کی گہیرا آہن کی باتوں اور شخصیت کے سحر نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اتنا کہ اس کے لیے ہر چیز بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ ہادی کی پشت سے ٹیک لگائے ایک ٹک ساٹنے دیوار کو دیکھ رہا تھا جہاں اس کی اور مانی کی بچپن کی تصویر خوب صورت فریم میں مقید دیوار پر توڑی تھی۔ وہ مانی کے کندھے پر پاؤں پھیلائے آنکھوں میں معصومی شرارت اور چہرے پر بھرپور مسکراہٹ سجائے کمرے کی آنکھ میں جھانک رہا تھا جبکہ ماہ رخ اس اچانک افکار پر کھلائی منت بسورے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کو یہ تصویر بالکل پسند نہیں تھی اسی لیے ایک دن ہادی نے چپکے سے یہ تصویر ان کے اہم سے نکال لی تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ جب مانی اس کمرے میں بالکل نہ تھی تو اس کے ساتھ آئے گی تو اس تصویر کو اٹھا کر ساتھ میں دیوار پر توڑواں دیکھ کر اس کا رد عمل کیا ہو گا۔ اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ بکھر گئی جو اگلے ہی بل معدوم ہوتے ہوئے بالکل ختم ہو گئی تھی۔

وہ گہرا سانس خارج کرتا یہ پرچت لیٹ گیا۔ ہادی کے خیالات نے تو اسے دھچکا پھینکا ہی تھا مگر اس کے انکار نے تو جیسے اس سے مستقبل کی تمام خوشیوں ہی بچھین لی تھیں۔

ماہ رخ کے لیے اس کی پسندیدگی سے سب ہی واقف تھے۔ بچپنی بے چارے جو اس سارے معاملے میں بالکل بے بس تھے اس سے سخت شرمندہ تھے اور اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ماہ رخ کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیں گے مگر اسے ماہ رخ چاہیے تھی عمل اور بھرپور۔ اپنے تمام تر جذبات اور احساسات کے ساتھ "دل اور دماغ" کی بھرپور آلودگی لیے۔ اسے آسوی ادھوری "دل میں اس کے لیے بے زاری لیے" مارے باہر سے مل باپ کی بلیک میڈنگ سے مجبور اور ان کی عزت کی بی بیایاں پاؤں میں ڈالے۔ ماہ رخ نہیں چاہیے تھی یا ہو سکتا ہے کسی اور کے لیے کچھ خاص جذبات دل کے نمل خانوں میں قید کیے ہو۔ جن پہ صرف شوہر کا حق ہوتا ہے۔

میں نے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا مگر جب سے وہ اپنی سے اٹلی تھی اس کے انداز و اطوار میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس کا کھنکا کھنکا انداز اور خاص کر زوایار خان کے نام پر جو چٹک اس کی آنکھوں میں گونڈی تھی اس نے ہادی منصور علی کو چونکا دیا تھا۔ یہ اس کا لالہ بھی ہو سکتا تھا خاص کر اس صورت میں ایک ماہ رخ خود بھی کسی ایسے امکان سے انکار کر چکی تھی کہ مل ہو مسلسل سرخنی کا اشارہ دے رہا تھا اس کا ایا کرنا گنڈا اس نے بچپنی کوئی لالہ اس سے کوئی بھی بات کرنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اسے کچھ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے سب کچھ جانچ کر کہہ کر خود فیصلہ کرے۔ وہ خواہ تو بھی ہو ہادی اسے قبول کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد وہ چاہا کہ گھر نہیں گیا تھا اور بچپنی خود بھی اسے اپنے کمرے متعلق کوئی بھی کام کرنے سے بچھڑاتے تھے۔ اسی تو ممکن کے لیے آناؤں ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے کچھ عرصہ گھر کے کی بات پر پہلے تو بہت ناراض ہو میں مگر پھر اس کی سنجیدگی محسوس کر کے جب ہو رہی۔ مل واقعی۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ پہلے ہی شرارتیں نہ بنی مذاق۔ اول تو گھر میں ہادی کی کم جاتا ہو نا بھی تو سب چاہیے نہ تھا۔

ای ابو پوچھ پوچھ کر تھک گئے اور وہ ہریار "ایسا کچھ نہیں ہے بس آپ لوگوں کا وہم ہے" کہہ کر ٹال جاتا کہ اس نے انہیں ماہ رخ کے انکار کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا اور وہ یہی سمجھتے تھے کہ دیر ہادی کی طرف سے ہو رہی ہے اس پر بھی بچپنی اس کے مشکور تھے۔ مگر اس دل کو کیسے سمجھا کہ جو اس دشمن جاں کے پھنچ جانے کے ڈر سے ہی کھلا کر دیا تھا اور جو بچ بچ ایسا ہو گیا تو۔ ہادی نے بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ لیا اور سامنے گئی تصویر کو دیکھے گیا۔ مگر اسے اطمینان بھی ہو نا کہ ایک چیز ہوتی ہے تقدیر۔ جو آپ کے فیصلہ کا کسی کو نہیں دیتی چاہے کوئی کتنا زور لگائے اور جو چیز آپ کی نہ ہو آپ کو بھی نہیں ملتی۔ خود آپ اس کے پیچھے تاثر بھانگے رہیں۔ البتہ یا ہو جائیں یا لولہ لالہ

آپ لا حاصل کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اور یہی بات ہادی کے اضطراب کو کم کر دیتی تھی کہ اسے دیکھنا تھا کہ اس کی تقدیر نے اس کے لیے کیا فیصلہ کیا ہے اور وہ سرا امتحان اس کی محبت کا بھی تو تھا اگر وہ اتنی طاقت ور ہے تو ماہ رخ چاہے کتنا بھی بھانگے "لوٹ کر اسی کی طرف آئے گی اور ہادی منصور علی کو اس وقت کا انتظار کرنا تھا۔"

بہت بے کیف سے لگے بندھے دن گزر رہے تھے۔ سڑکی کی شدت اب کپکپانے لگی تھی۔ پورے دو دن بدلوں کی آوٹ میں روپوش رہنے کے بعد آج سورج نے دھرتی کو شرف دیدار بخشا تھا جس پر زندگی مسکرا اٹھی تھی۔

ضویا دو دن سے کالج نہیں آ رہی تھی۔ اس نے فون پر رابطہ کیا تو پتا چلا کہ ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ اور اب وہ یہ تھا دن بہت پوریت سے کات رہی تھی۔ چھٹی ہوئے پر شکوہ کر گئی وہ باہر تکی تو ٹھنڈ کر رک گئی ہادی اسے کہنے آیا تھا۔ اپنے انکار کے بعد وہ آج پہلی بار اسے دیکھ رہی تھی۔ انتہائی سنجیدہ چہرے کے ساتھ ہوش ہے۔ وہ اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں تھا۔ کلنی کمزور ہو گیا تھا۔

"چلیں؟" وہ آہستگی سے بولی تو اس نے چونک کر اسے دیکھا اور خاموشی سے ہائیک اشارت کر دی۔ وہ اس کی خاموشی سے خائف سی ہوتی پیچھے بیٹھ گئی۔ اسے بیشک یہ شکوہ رہا کہ ہادی غیر سنجیدہ ہے اور کن وہ اتنا سنجیدہ تھا کہ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی صورت حال تو زوایار خان سے بات کرتے ہوئے بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سوچتے سوچتے چونک گئی "ایک خیال نے آنکھوں کی طرح ذہن کو جکڑ لیا اور وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"وہ ہادی۔" کچھ دنوں سے ضویا کالج نہیں آ رہی، لکھ جو سبکی اسے بخار ہے تو۔" ہادی نے ہائیک ایک دم روک دی وہ جھجک کر خاموش ہو گئی۔

"تو۔۔؟" ہادی نے اس سارے عرصے میں پہلا لفظ بولا تو اس کو حوصلہ ملا۔

"تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ منٹ کو اس کی خیریت پوچھ لیتی، بس کھڑے کھڑے ہی۔" ہادی نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ سچا کر نظریں چرائی۔ مگر پھر خود کو تسلی دی کہ ہادی کو کیا پلک۔ اس نے پھر وہ مسکراہٹ کے ساتھ ہائیک اشارت کر دی۔

ہائیک ضویا کے گھر کے سامنے ٹکی کو اس کے دل کی دھڑکن جیسے چہرے پر اترنے لگی۔

"ہا نہیں، زلیخا رخاں گھر پر ہوں گے یا نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے ہادی کی طرف مڑی۔ "میں ابھی آتی ہوں۔" اور قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔ ہادی نے اس کی جگہ سی پھینکی آنکھیں دیکھی تو نگاہیں دعا کی صورت آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

نگہری کا بھاری منتظر دروازہ اس کے ہاتھ کے دباؤ سے بنا آواز نکالنے لگا۔ چلا گیا۔ مختصر سے کارڈور سے آگے شاید ہی وی لاؤنگ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی تاکہ اچانک پہنچ کر ضویا کو سر پر از روئے سکے کہ اچانک ایک جھڑپ ہوئی تو اس نے اس کے قدم روک دیے۔ "کیوں آیا تھا یہاں؟" اسے زلیخا رخاں کی گواہ پہچاننے میں مشکل نہیں ہوئی تھی۔

"بس بیٹا! ایسے ہی کہہ رہا تھا میں سے گزرا تو سوچا آئی کو سلام کر لوں۔" آخری کی گھٹکیاتی آواز سے اسے تشویش ہوئی۔

"بہت خوب۔ یعنی کہ اتنے عرصے میں اسے آج ہی آئی کو سلام کرنا یاد آیا جبکہ ضویا بی بی بھی گھر پر موجود ہے۔ مجھے تو یہ ان دونوں کی ملی جھلتی لگتی ہے جیہٹا۔" ان کاٹوں پر بھی رابطہ ہوگا۔ "زلیخا رخاں کی گواہ فیسے سے بھٹ پڑی تھی۔"

"نہیں بیٹا۔ اتم غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ تو ابھی لٹی تھی جب میں چائے پینے لگا۔"

"آپ۔۔" اس نے ان کی بات کاٹ کر انگلی اٹھائی۔

"آپ کیوں ان کی اتنی سائیڈ لے رہی ہیں۔ مجھے تو

لگتا ہے آپ بھی اس سازش میں برابر کی شریک ہیں مگر کل گھول کر سن لیں، میرے سامنے۔ میرے ہی گھر میں۔ بے غیری کا ڈراما نہیں ہوگا، بہت کچھ چکا ہوں میں ایسے ڈرامے۔ وہاں تو میرا کوئی بس نہیں چلتا تھا لیکن یہاں میں یہ سب نہیں ہونے دلاں گا۔" سمجھیں تم۔۔۔"

غرائی ہوئی گواہ کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ شاید ضویا کی اسے لگا ضویا کی آواز ہے اس کی باتیں بے تحاشا کتب رہی تھیں۔ گزارتا وہ بھر ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً دروازہ کا سارا ایلہ۔ ضویا کی گھٹی گھٹی جھپٹیں وقفہ وقفہ سے ستائی دے رہی تھیں۔ شاید اسے مارا تھا زلیخا رخاں نے۔

"بھلا کیسے؟" اس کے اعصاب جیسے مفلوج ہو رہے تھے۔

"آپ بھی اسے سمجھاویں جب تک یہ۔" اس "گھر میں ہے اپنی حرکتوں کو قابو میں رکھے۔ گراہوں اس کا کوئی ہندوستان۔ فحش خدا کا گھر میں پینے کا ایسی بڑی دلیری جانے اور کب کب یہ ہماری آنکھوں میں دھول نہیں جھونکتی ہوگی۔ جو آج میں اچانک گھڑ آیا ہوتا تو۔۔۔ میں سمجھا شاید سحر جی ہوئی گھڑ نہیں۔"

بہر حال میں یہ بے خیالی اپنے گھر میں تو کسی صورت برداشت نہیں کروں گا۔ آپ اس کو بتاویں کہ اگر اب بھی اس نے ایسے ہی عشق و عاشقی کے مظاہرے جاری رکھے تو بچہ کی نہیں یہ میرے ہاتھوں۔ جان سار ڈالوں گا میں اسے۔" جذباتی انداز میں چونکا وہ کوئی نفسیاتی مریض لگ رہا تھا اس کے گھر میں تو کیا، پلا جی کہ ہادی کو بھی اس نے کبھی بلند آواز میں بولتے نہیں دیکھا تھا۔

"اب دفع ہو جاؤ یہاں سے،" دور ہو جاؤ میری نظروں سے،" جاؤ۔ وہ عذارت سے پھکارنا جیسے دل سے اترتا جا رہا تھا بہت نیچے۔ کسی گہری کھالی میں۔ اسی بل اس کی نظریں بیڑیوں کی طرف بروقتی ضویا پر پڑی تو دل میں جیسے تیس سی اٹھی۔ بکھرے بل پھرے پر پڑتے آنسو، متورم بے جان آنکھیں۔ یہ وہ ضویا تو

تھی جسے وہ باقی تھی۔

سراٹھاتے ہی ضویا نے بھی اسے کچھ لیا اور ساکت رہ گئی۔ عزیز دوست کے سامنے، سنبھل سنبھل کر رکھا بزم لڑا تو اذیت جیسے آنکھوں میں کڑیاں بن کر بہنے لگی۔ بلاترک کے لیے گھڑا رہا مشکل ہونے لگا تو نظریں چرائی دردناک حلیل کر رہا ہر نکل آتی۔

قدم بہ قدم کایو جہ اٹھانے سے انکاری ہو رہے تھے کہ اسلیت کا جو یہ اس کے سامنے جاگ ہوا بہت تکلیف دہ تھا۔ ضویا ایک مضبوط کردار کی لڑکی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی گزرا زلیخا رخاں۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے سلب ہو رہی تھی۔ سویرن اور سنجیدگی کا بٹ پاش پاش ہو چکا تھا۔ وہ جیسی "نرم آواز" بچوں میں دب کر رہ گئی تھی۔ مہین مسکراہٹ اٹھنے لگتی زبان سے باہر نکلتی تھی۔

وہ شخص جسے دیکھتے ہی خوف کا احساس ہوتا ہو، ہر وی ہاتھوں میں پتھر پکڑے سنگدار کرنے کے درد پے ہو تو۔۔؟

جب محفوظ ہی سر سے اوپر نہ کھینچ لے تو کیسا لگے گا؟ بلاترک کو غرائی آگے بڑھ رہی تھی۔ دروازے سے ایک تنک کا مختصر سارا ستھیل پر بیٹھا ہو چکا تھا۔

جو شخص اپنی بن کی عزت کی وجہاں اڑا رہا ہو وہ دوسری عورتوں کی کیا عزت کرے گا اور عورت محبت کے بغیر تو زندہ رہ سکتی ہے لیکن عزت کے بغیر نہیں۔

"اس کے گلن سامنے سامنے کر کے لگے تھے۔ گیٹ سے نکلتے ہی جانے کس چیز سے ٹھوکر لگی کہ وہ لڑکھرائی۔ گرنے کو تھی کہ وہ مضبوط بازوؤں سے اسے تھام لیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اسے سنبھالے پریشان چہرے پر پوچھ رہا تھا۔

"کیا ہوا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ اس کا سفید پڑا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ میں کچھ نہیں۔" وہ جیسے یکدم حواسوں میں لوٹ آئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں، تم چلو یہاں سے۔" اس کے سارے نے اس کے قدموں کو مضبوطی بخشی تھی۔ یہ

احساس کہ "وہ اکیلی نہیں ہے" اس کے ٹوٹنے حوصلوں کو تقویت دے رہا تھا۔ وہ اب بھی اس کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔

"چلو۔" ہادی نے ہائیک تھا تو وہ ایک الوداعی نگاہ اس گھر پر ڈالتے ہوئے آنسو صاف کر گئی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرائی اپنے مخصوص شیخ پر جیسی تھیں۔ آج بہت دنوں بعد ان کا سامنا ہوا تھا اور دونوں ہی بات کرتے گھبراہٹ تھیں۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" ہادری کو پہل کرنی پڑی۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے ہادری کی جانب دیکھتے سے گزری کیا۔ ہادری کچھ دیر اسے دیکھتی رہی اور جیسے ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ اس نے بات کرنے کی ٹھانی تاکہ ضویا اس سے سب کچھ سیکڑ کر کے اپنے اندر کی ٹھنکوں کو باہر نکالے جو نجانے کب سے جمع ہو کر اسے لائیت میں جھلا کیے ہوئے تھی۔

"ضویا۔! اس دن کیا ہوا تھا؟" اس نے بہت عرصے سے پوچھا کہ رستے زخموں کو چھیننا آسان نہیں ہوتا۔

تو آخر وہ لمحہ آئی گیا جس سے بچنے کے لیے وہ کانچ سے بھاگ رہی تھی۔ گھراے ہادری سے کہنا تھا کہ یہ اس پر قرضی تھا۔ اس نے گھراسا اس نے کرکٹ کے لیے وقت پہنچا دیا۔

"زلیخا کچھ نہیں، بس میرے بھائی کو شک رہتا ہے کہ میں ان کی غیر موجودگی میں لڑکوں سے رلو اور رم بڑھانے کے مواقع دھونڈتی ہوں۔ اسی لیے جب بھی وہ مجھے کسی کے پاس بیٹھے دیکھتے ہیں تو ہوش و حواس کھوٹے لیتے ہیں کہ میں یقیناً، اس سے محبت کی توقعیں بڑھا رہی ہوں گی۔" وہ خود لڑائی کا شکار بہت سفاکی سے اپنے بچے اوپر مڑی تھی۔

"اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ حذرت خان۔ ڈیڑے کے دوست کا بیٹا۔ حال ہی میں امریکہ سے یہاں

تھکت ہوا ہے۔ اٹھنے سے اور دوسرے گزارا تو می سے ملنے چلا گیا۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ دھوپ نکلی تو لان میں بیٹھنے کوئی چلا۔ مجھے آگئی تو وہ سامنے بیٹھا تھا می پرچن میں چائے دیکھنے لگی تھیں۔ مجھے اچھا نہ لگا کہ خاموشی سے گزر جاؤں جبکہ وہ مجھے دیکھ بھی چکا تھا۔ میں مجبوراً "می کی دباہی تک کا خیال لے لے دوں بیٹھ گئی۔ بس تب ہی زانو پڑھائی بھی اپنی کوئی فائل لینے چلے آئے۔ ہمیں اکیلے بیٹھ دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مجھے اسی بات کا اندیشہ تھا۔ اسی لیے میں خوف زدہ ہو گئی "جانتی تھی آگے کیا ہونے والا ہے۔ لیکن کسی دوسرے کے سامنے عزت نفس کا چندار نوٹے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مگر اللہ نے میری عزت رکھ لی اور وہ بھائی کے رونے سے بے زار ہو کر جلد ہی چلا گیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا تم جانتی ہی ہو۔ لیکن تم پریشان نہ ہو۔ میں یہ سب سہا سیکھ رہی ہوں کہ جو چیز ہماری زندگیوں کا حصہ بن چائے اس کی عادت ڈال لیتا ہے ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے پر دل بھی تا ایک بار تو جینے سے ہی انکاری ہو جاتا ہے مگر کیا کرے۔ مجبور ہے تا میری طرح۔ چنانچہ پڑا ہے۔" اس کا خط لٹ کر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ہمارے کانوں اپنی دوست کے اس درد پر زور ہوا تھا۔ اس نے ضویا کو ساتھ لگا کر تسلی دی اور اسے جی بھر کر روئے دیا۔

یہ مولا کا گون سا روپ تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے گھر میں تو مولا محفوظ تھا۔ شفیق تھا، عورت خواہ وہ ماں ہو، بیوی یا بیٹی۔ ہر روپ میں معتبر تھی ہر حال میں باخبر تھی۔ وہ سر جھٹک کر دکھ سے بولی۔

"یقین نہیں آتا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا ڈگری ہولڈر اتنا سہیل کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سارا کیا دھرا ہی اسی آکسفورڈ کا ہے۔ پہلے بھائی تھوڑا بہت شکی مزاج تو تھے مگر مجھ سے بہت پار کرتے تھے۔" اس کی آنکھوں میں خوب صورت ماتمی کے جگنو چمکنے لگے تھے۔ "پھر وہ باہر ہر جتنے چلے گئے اور وہاں انہوں نے عورت کی سبے وفائی اور قریب کے جانے

کون سے مظاہرے دیکھے کہ ان کا عورت پر سے اہتمام ہی اٹھ گیا۔ ان کے دل میں یہ بات جیسے بیٹھ گئی کہ عورت چاہے کتنی بھی آپ کی بیوی رہے اس کی فطرت میں دھوکا ہے۔ پھر یہاں اگر بھی ہمارے چاہنے والوں میں کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ ان کی بے اعتباری بڑھتی گئی۔ بس پھر انہیں مجھ پر بھی شک ہونے لگا۔ جب بھی مجھے کسی کے ساتھ جتنے باتیں کرتے دیکھتے تھے مٹھکوں ہو جاتے اور خوب واویلا مچاتے۔ مگر اب تو قوت مار پیٹ تک پہنچ گئی ہے۔ حالانکہ ہماری سوسائٹی میں لوگ مڑی کی دوستی کو محبوب نہیں سمجھا جاتا۔ پھر بھی میں بہت احتیاط کرتی ہوں کیونکہ مجھے خود یہ سب کچھ پسند نہیں ہے مگر بھائی۔۔۔" اس نے بھرائی کواڑ میں بات اور حوری چھوڑ دی۔

"اوہ مائی گاڈ! حالانکہ باہر جا کر لوگ مزید آزاد خیال ہو جاتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے لیکن یہ دنیا ہے یہاں سب کچھ ممکن ہے کچھ بھی باعث حیرت نہیں۔" وہ ابتدائی شاک کی کیفیت سے نکلتے ہوئے نہایت افسوس سے اس ساری صورت کا تجزیہ کر رہی تھی۔

"دیئے میں نے سنا تھا بھائی می کو تمہارے بارے میں بتا رہے تھے شاید وہ جلد ہی تمہاری طرف آئیں۔" ضویا سب کچھ کہہ چکنے کے بعد اب قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی جبکہ ہمارے خ کی اپنی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔

"کیوں؟" اس نے تجاہل جا رقائے سے کام لیا۔

"ظاہر ہے تمہارے رشتے کے لیے۔" ضویا نے اس کی اجنبیت کو حیرت سے دیکھا۔

"مگر یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ میرا رشتہ تو اپنے دیکھا زاد سے بچپن سے ملے ہے۔" اس نے باز اراہ دی وہ سب کہہ دیا جس سے اسے جڑ تھی اسے خود پر حیرت ہوئی۔

"اچھا! ضویا نے انہیں سے اسے دیکھا۔" تم نے پہلے تو بھی نہیں بتایا؟"

"پہلے سبھی اس بارے میں بات ہی نہیں ہوئی۔"

وہ اس سے نظریں چرا کر قصداً "مسکرائی۔

"بہت بہت مبارک ہو۔" ضویا کے زنجوش اور بہت مست انداز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں لکھا سوال پڑھ کر بڑھوٹی سے مسکرائی۔

"میں جانتی ہوں تم میرے بارے میں کیا سوچتی تھیں۔" می تاکہ میں جیسی دوست ہوں جسے اپنی عزیز ترین دوست بطور بھائی قبول نہیں تھیں شاید یاد ہو ایک بار میں نے تم سے کہا تھا کہ تم مجھے بہت عزیز ہو اور اس محبت کا میں بھٹا تھا کہ میں جانتے بوجھتے تھیں اس جنم میں نہ دھکیلوں۔ میں مستقبل کے لیے پرامید ہوں کہ مجھے پوشہ اس گھر میں نہیں رہنا۔ می میرے لیے پرنسپل فاضل کر رہی ہیں۔ مگر بھائی سے شادی کے بعد چھ مہینے وہیں رہنا تھا لہذا بہت جلد چھ مہینے اپنے جذباتی فیصلے کی تکنی کا احساس ہو جانا کہ عزت نفس کی دھجیاں سمیٹنا آسان نہیں ہوتا۔ ویسے بھی بھائی کو تم سے محبت نہیں ہے انہیں صرف تمہاری معصومیت اور حیا نے متاثر کیا ہے اور تم بھی شاید ان کی شخصیت سے متاثر ہو گئیں۔ بہت سی لڑکیاں ہو جاتی ہیں لیکن صرف پسند لقا کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں محبت انسان کو کافی مضبوط اور ہلوار بنا دیتی ہے مگر بعض چیزیں محبت میں بھی برداشت نہیں کی جاسکتیں۔

قریب مت مجھ کو مجھے اپنے بھائی سے محبت نہیں ہے۔ یہ تو میرے خون میں شامل ہے یا یوں کہو کہ میری بیجوری ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ ان کے لیے ہماری سوسائٹی کی کوئی لڑکی ہی سوٹ کرے گی۔ جس پر گھر کا پریشاں ہو۔ مضبوط فیملی بیک گراؤ نہ ہو جو اپنے حق کے لیے بول سکتی ہو یا کوئی بھی اور بھائی کی پسند سے ہو۔ مگر کم از کم تم میں ہمارے رشتے۔ تم بہت معصوم ہو۔ تمہارا ماحول تمہارا فیملی بیک گراؤ نہ چھوڑے گا۔ اس سب کی اجازت کبھی نہیں دیتا اور نتیجتاً تم دنیا سے زندگی سے کٹ کر رہ جاتیں۔ کیونکہ فی الحال بھائی کی بہتری کے کوئی چانسز نہیں ہیں۔ ڈاکٹریا سائیکالوسٹ کے ذکر پر ہی وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں کہ سب

انہیں یا گل قرار دے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر وہ بہتر ہو جائیں اور میں تو پہل دے گا کرتی ہوں کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی "آنکھوں میں پھر سے نمی تیرے لگی تھی۔ ہمارے اس کے ہاتھ تھام لیے تو وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"بس یہی سب سوچتی رہتی تھی میں اور تم شاید میرے غلوں پر مٹھک تھیں۔"

اب سوسائٹی کی یہ باتوں لڑکی بھلا پر لا پڑا۔ مگر اندر سے کتنی پر غلوں۔۔۔ کتنی حساس تھی۔ ہمارے اس کی دوست پر غر تھا۔ وہ اس کی ممنون تھی اور اپنے اندازوں پر شرمندہ بھی۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے اس سے لپٹ گئی تھی۔

اور ضویا ٹھیک ہی تو کہتی تھی کہ وہ صرف زانو پر خان سے متاثر تھی، نہیں پسند کرتی تھی جو ان کا دوسرا روپ دیکھتے ہی کہیں کھو گئی تھی۔ وہ اسے کھویا ہی رہنے دینا چاہتی تھی کہ ایک محبت اس کی راہ دکھ رہی تھی جو واقعی تھی می کی کہ اسے لوٹا پڑا تھا۔ ہمارے رشتے کے تصور میں محبت کی چمک لیے وہ ستارہ آنکھیں جھلکاتی تھیں۔ اسے "بیا" لیں، "نایا" لگی سب کے چہرے یاد آئے تھے۔ یہ یقیناً "ان کی دعا میں ہی تھیں جنہوں نے اسے اس آزمائش سے بچالیا تھا۔ وہ سب اس سے محبت کرتے تھے اور وہ اتنی بے وقوف ہرگز نہ تھی کہ ایک وقتی پسند کے لیے اتنی محبتیں قربان کر دیتی۔ اس کا دل اس نے فیصلے سے بہت پر سکون تھا۔

اس نے اہل کو جب ہادی کے لیے ہاں کی تو وہ اتنی خوش ہو میں کہ ہمارے شرمندہ ہو گئی "انہوں نے اسے لینا کہ بہت دعا میں دیں اور کم گو سے پاپا بات بات پہ قہقہے لگنے لگے۔ اہل کے جسم میں تو جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں وہ بالکل پہلے جیسی ہو گئی تھیں۔ ہاں بس یہ فرق پڑا تھا کہ وہ اسے ڈانٹتی نہیں تھیں اس لیے کہ اب وہ ان کے گھر میں مہمان تھی۔ اہل، "نایا" لگی

کی خوشی نے مجھے اس سے پہلے ہی کھینچ لیا تھا۔
 بھی جو بھی دل میں جاگتی تھی اور ہادی سے بہت
 سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کے مثبت جواب کے بعد ایک بار
 گھر آیا تھا۔ سنجیدہ چہرے پر توری چڑھائے وہ خوش ہو
 گئی۔
 "شاید یہ میرے انکار سے ناراض ہے اور اب مجھ
 سے بدلے لے گا۔" وہ سوچے گی مگر میرے تسلی ہوئی
 کہ اسی بلبلانے تیار کیا اس کے ساتھ تھے وہ اپنی نہیں
 تھی۔

آج چاند رات تھی۔ تیار تائی اس کی عیدی اور
 مشکلی کی چیزیں لے کر آئے تھے جو عید کے تیسرے دن
 قرار پائی تھی۔ وہ ان سے پیار لیتی پخت پر چلی نکلی۔
 جرسی اور شل نے سوری کو کسی حد تک روک رکھا
 تھا۔ ناول بھرا آسمان روشن چاند دل میں سکون اور
 خوشیوں ہی خوشیوں۔ وہ سرشاری ہادی کو سوجھنے لگی
 جو آج بھی نہیں آیا تھا۔ تب ہی اس کے پیچھے آہٹ
 ہوئی۔

"بہت سہ مبارک ہو۔" وہ اچھل پڑی۔
 "نہ تم نے تو مجھے ڈرایا تھا۔" وہ دل پر ہاتھ
 رکھ کر بولی مگر وہ نوز سنجیدہ رہا وہ کھیلانی ہی ہو گئی۔
 "تمہیں بھی مبارک ہو۔"

"کس چیز کی؟" وہ بدستور سنجیدہ تھا۔
 "ظاہر ہے چاند رات کی۔" میرت سے اسے دیکھنے
 لگی۔

"مگر تم تو مشکلی کی دے رہا تھا۔" وہ مسکراہٹ
 ہونٹوں میں دبائے آرام سے بولا تو وہ جھل ہو گئی اور رخ
 دوسری طرف موڑ لیا۔ مگر وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو
 گیا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم ضرور لوٹ آؤ گی۔" بچپن سے
 لے کر آج تک میں نے اپنا ہر جذبہ تمہارے نام کیا
 ہے۔ مگر تمہارا انتظار کیا ہے۔ مجھے اپنی محبت پر یقین
 تھا اور لہجہ پر مجھو سا بھی کہ وہ کسی کی لگن ضائع نہیں
 کرتا۔"

وہ اس کے یقین پر حیران ہو رہی تھی۔

"اتنی محبت۔" وہ سوچ رہی تھی اور وہ بول رہا تھا۔
 "چچا! بچپن تمہارے انکار کے بعد بہت پریشان تھے
 کہ وہ امی ابو کو کیا جواب دیں گے مگر میں نے انہیں
 روک دیا۔ میں چاہتا تھا کہ تم سوچ سیکھ کر فیصلہ کرو اور
 اگر اس کے بعد بھی تمہارا جواب انکار ہی ہوتا تو میں یہ
 الزام بھی اپنے سر لے لیتا۔ کیونکہ تمہاری رسولی ہو
 لوگ انہیں برا بھلا کہیں۔ یہ میں برداشت کر رہی
 نہیں سکتا۔" بھی بھی نہیں۔"

وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا اور وہ سوچ رہی
 تھی کہ یہ سب تو وہ شخص ہے جسے وہ بچپن سے کھانے ڈھونڈ
 رہی تھی۔ جو اس کا محافظ تھا اس کا کھولا۔ جو محبت
 بعد میں کرنا تھا پہلے اسے عزت دیتا تھا۔ جو اس کے
 انکار پر بھی بدگمان نہ ہوا تھا۔ اور وہ جو سمجھتی تھی کہ
 کبھی نہ کبھی اسے ہادی سے محبت ہو ہی جائے گی
 حیران تھی کہ محبت کی کوئلیوں تو اس کے اندر پھوٹ
 رہی تھیں نہ تھا پھوٹ رہی تھیں یا شاید ایک
 ٹھوکر نے اسے محبت کی قدر کرنا سکھا دیا تھا۔ اس نے
 اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا کہ جس کے چہرے
 سے تپتی محبت کی روشنی چاند اور چاندی رہی تھی۔
 اس نے لہجہ کا شکر ادا کیا جس نے اس کے لیے بہترین
 کا انتخاب کیا تھا اور وہ اپنی پہلی ہو کر مسکرا دی۔

"اور یہ تم اتنے سنجیدہ کیوں ہو گئے ہو؟" وہ
 جھنجکے ہوئے پوچھنے لگی تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"تجربہ۔" اچھا یہ تو میں مستقبل کی پریکٹس کر رہا
 ہوں۔ تمہیں سنجیدہ لوگ اچھے لگتے ہیں نا تو بوس میں
 نے سوچا کہ شادی کے بعد سنجیدہ شوہر بن کر تم پر اتنا
 رعب بھانڈوں گا کہ تمہیں کہنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔" نیسے
 جی۔ آپ بڑے کیوں نہیں؟ وہ غصہ کیا کر رہی جون
 میں لوٹ چکا تھا اور لہجہ اس کے رنگ میں رنگ رہی
 تھی۔

"اور میں تو جیسے تمہارے رعب میں آبی جاؤں گی
 نا! تیار سے شکایت لگا کر وہ پٹائی کرواؤں گی تاکہ سارا
 رعب و عجب بھول جاؤ گے۔" وہ بددہاتہ نچا کر بولی تو
 ہادی اس خالص بیویوں والے اسٹائل پر جیسے ڈرایا ہو

کہا۔
 "پتا ہے میں نے اپنے کمرے میں ہمارے بچپن کی
 وہ تصویر اتار لی کہ اگر گھر بھی ہے جو تمہیں ناپسند
 ہے۔" وہ جو اسے سر پر اتارنا چاہتا تھا جوش میں بتاتا
 چلا گیا۔

"کیا؟" میں وہ تصویر اس جگہ ہرگز نہیں رہنے
 دلی کی۔ "وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر چلائی۔
 "آخر کیوں؟" وہ اپنی جلد بازی پر چچھتا آگھبرا کر
 بولا۔

"بھئی وہاں تو ہماری شادی کی تصویر لگے گی نا! وہ
 بے ساختہ بولی تو ہادی کا بلند و بانگ قہقہہ اسے اپنے
 لالچ کا احساس دلا گیا۔

"سنو۔" وہ اس کے جھنجھٹے جھنجھٹے۔
 "روپ پر
 اپنی پریشانی لگائیں، جہاں کر بولا تو لہجہ رخ نے سوالیہ نظروں
 سے اسے دیکھا۔

"میرے ساتھ چلو گی؟" وہ جانتی تھی لیکن مگر پھر
 بھی پوچھ بیٹھی۔
 "کیوں؟"

"دور۔۔۔ چاند کے پار۔" وہ اپنے چاند کو لگا ہوں
 میں بھاگ کر بولا۔

"اٹوں۔" اسے تنگ کرنے کے لیے ٹھوڑی پر
 انگلی رکھ کر پھر اس کے شہر چرے کو دیکھا اور مسکرا
 دی۔ "جہاں جی چاہے لے جاؤ میرے اختیار میں کیا
 ہے۔ سب کچھ تو اب تمہارا ہے۔"

اسنے واضح اقرار پر ہادی کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح
 ستارہ بن گئیں۔ وہ اس سے بالکل نہیں پوچھتا چاہتا تھا
 کہ اس کے انکار کے بعد اقرار کے پیچھے کیا وجہ تھی۔
 وہ یہ بھی نہیں جانتا چاہتا تھا کہ شادی کے گھر سے لگتے
 وقت اس کی رخت سفید اور ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ
 کیوں تھی کہ یہ اس کا بھرم تھا اور اس کا بھرم اسے
 خود سے بڑھ کر عزیز تھا۔ وہ جو سننا چاہتا تھا اس کا تھا۔

ماہ رخ کے لیے کی سچائی نے اس کے رعب سے
 خدشات بھی ختم کر دیے تھے اس نے چاندنی میں
 دھلے چہرے کو محبت سے دیکھا اور ماہ رخ کو اس ہنسنے

مسکراتے شخص کے رنگ ہمیشہ خوشی اور محبت عزت
 کے ساتھ ملتا تھا۔ یہ اسے یقین تھا۔ اس نے بدگمانی
 کے بادلوں سے بھاگتے محبت کے اس چاند کو مسکرا کر
 دیکھا جس نے ہر سوا جالائی ایسا لکھ دیا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت	موضوع	صفحہ
500/-	رہبانہ گارہ خان	دعائی اک روشنی
200/-	رہبانہ گارہ خان	خوشبو کا کوئی گھر نہیں
400/-	شاز پور جہری	شہول کے دروازے
200/-	شاز پور جہری	خیر سے نام کی محبت
450/-	آبیہ مرزا	دل ایک شہر جوتوں
500/-	فاکڑہ خان	آنکھوں کا شہر
200/-	فاکڑہ خان	کھانا دیکھنے کے لیے
200/-	فرحانہ مرزا	میں سے محبت
350/-	آبیہ مرزا	دل اسے اصرار دیا
200/-	آبیہ مرزا	تجربہ نام کی محبت
200/-	سعدیال کاشف	غلاب دیکھ
200/-	عزیزہ سعید	لہان کا چاند
450/-	انوارہ آفریدی	رنگ خوشبو ہوا دل
500/-	رجینہ جیل	دور کے کلاسیک
200/-	رجینہ جیل	آج ممکن پر چاہتیں
200/-	رجینہ جیل	مدد کی جوت
250/-	جہیز مرزا	میرت سے میرت ساگر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
 2246361
 2011



اوپر چھتوں اور سبز روشن دانوں والے اس گھر میں آج علی الصبح ہی سناٹا چھا گیا تھا۔ چار جانب پیلی خاموشی میں عجیب قسم کی وحشت اور درمندی کھلی پڑی تھی بقول شاعر۔

اویسی بال کھولے سو رہی ہے
کریم میاں جن کی حیثیت آج کل گھر کے سربراہی ہے
لبے برآمدے کے آخری کونے میں کبھی کبھی پتہ ہاتھ میں اخبار لیے بیٹھے تھے۔ یہاں دن چڑھے تک سایہ رہتا تھا۔ کچھ جگہ کے محل وقوع کا تقاضا تھا اور کچھ برآمدے کے بالکل ساتھ صحن کے آخری سرے پر آگے پھیل کے درخت کی مہمیاں کہ دوپہر سناٹے دنوں میں جب سب ہی تپش ہر طرف ڈیرہ ڈال گئی تھی یہاں بے حد سکون بھری ٹھنڈک کا احساس دیر تک رہتا تھا۔

کریم میاں سے چند باشت کے فاصلے پر خدیجہ لی بیٹھی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پہ دھرے تھے اور چہرے پہ نظر پڑشالی کا جیل بچا تھا۔

وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے شوہر کے چہرے پہ نظر ڈالنا نہ بھولتیں۔ جو بظاہر اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ مگر اندرون خانہ اپنی پوری ہی کی طرح کمری فکر بلکہ پریشانی میں مبتلا تھے۔ لیکن نہ تو وہ ان کی طرح گاہے بگاہے سر آہیں بھر رہے تھے اور نہ ہی بار بار کبھی گھڑی اور کبھی دروازے پہ نظر دوڑا رہے تھے۔
”کچھ زیادہ دیر نہیں ہوگئی تمہیدہ آکا کو نکلے ہوئے؟ اب تک تو اسٹیر، دالہس آجیانا چاہیے تھا یا کم از کم فون

ہی کر دیتیں۔“ کزشتہ ایک گھنٹے سے دوران یہ جملے انہوں نے چوتھی مرتبہ دہرائے تھے۔
اور کریم میاں ہر دفعہ کی طرح ”ہوں“ کر کے رہ گئے تھے۔

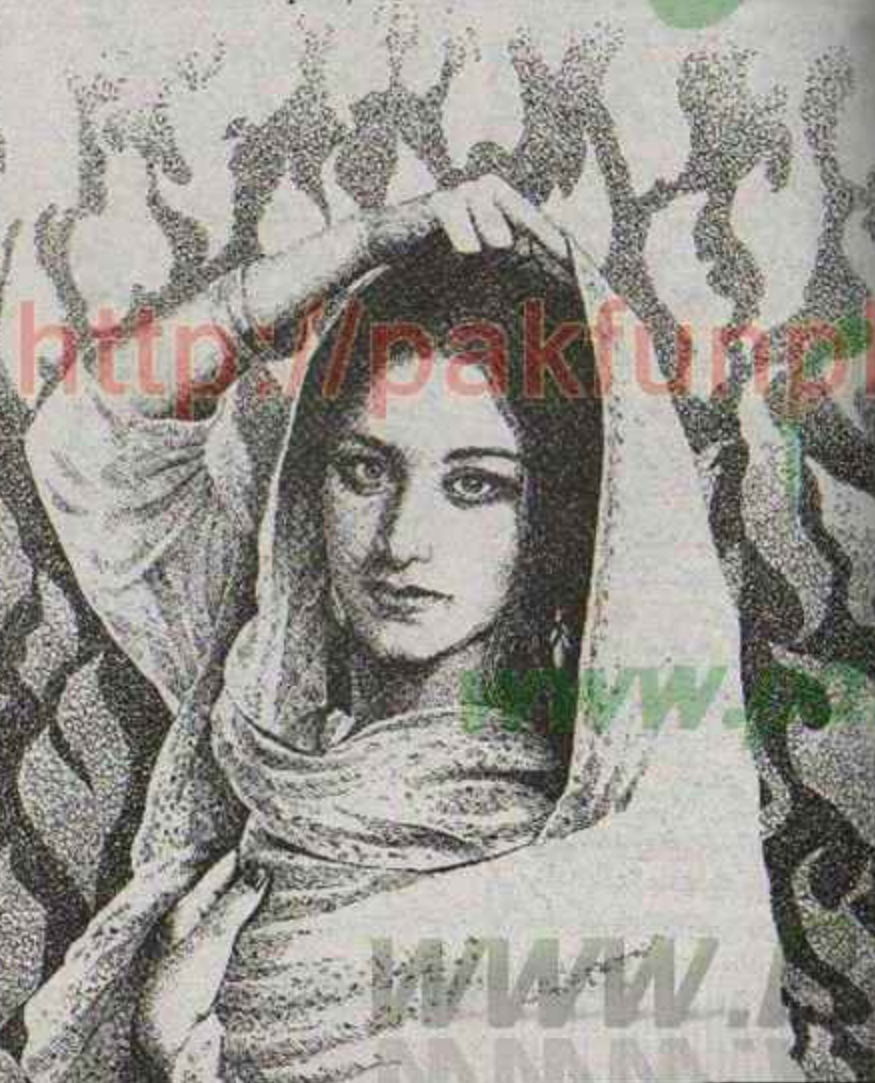
”خدا خیر کا دن چڑھائے اور انہوں نے سے بچائے۔“ یہ دعا وہ ہر صبح کے آغاز میں کیا کرتی تھیں۔ مگر آج انہوں نے ہوگئی تھی۔
جانے کون سی منحوس گھڑی تھی۔ جب زہرہ خاتون ان کے گھر میں داخل ہوئیں۔

خدیجہ کی حالت تھی کہ صبح صبح منہ ہزاروں لڑکاں وغیرہ سے فارغ ہو کر صحن میں کھل آئیں۔ ہاتھ لٹکائی ہوا کالٹ لیتے ہوئے وہ سلمیٰ کے ہاتھوں لگائے پودوں کو پانی دیتیں۔ کسی کائنات جھانٹ کی ضرورت ہوئی تو لگے ہاتھوں وہ بھی اسی وقت گر لیتیں۔ سلمیٰ کے جانے کے بعد انہوں نے اس کے آگے پھول چٹوں کا خیال اس سے بڑھ کے رکھا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ صحن کا یہ حصہ پہلے سے زیادہ لہلہانے لگا تھا۔

بات ہو رہی تھی آج صبح کی۔
جب وہ حسب معمول باہر آتے ہوئے برآمدے کی بیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ دھاڑ سے دروازہ کھلا۔ اور زہرہ خاتون دونوں ہاتھوں سے اپنی چادر سنبھالے اٹھیں وغیرہ اندر داخل ہوئیں۔

”اللہ خیر کرے اتنی بج کر؟ خیریت سے تو ہو زہرہ؟“
”خیریت کہاں آیا؟“ زہرہ خاتون اتنی دیر میں نہ صرف قریب آگئیں بلکہ اپنی پھولی سانسوں کو ہموار

لے ہوئے وہیں برآمدے کی کرسی پہ بیٹھ چکی
”کھیر میاں تو ٹھیک ہیں؟“
زہرہ خاتون کا انداز دل ہولانے دے رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی رہیں۔
”کچھ تو چھوڑو۔“
وہ خود بھی ہاتھ میں پکڑی پھول پتے کاٹنے کی قبضی نیچے فرش پہ ڈال دوں دوسری کرسی پہ بیٹھ گئیں۔
”بات منہ سے نکلی نہیں کیا! منہ چھوٹا ہے بات بڑی۔“
”کسی بھی کیا کن پڑی ہے زہرہ! اب ہل بھی چکے۔“
”تمہیدہ بیگم خدیجہ لی کی منہ بھی اتنی دیر میں کمرے



فہمیدہ تینم آتھ لڑی ہو میں۔ سہلی روٹی روٹی۔
 "چھوچھو آگنا کھا کر جائیے گا یا اسل تیار ہے۔" مراد
 بھی اٹھ کر آیا۔
 مردہ اس کے اصرار پر بھی نہیں رکھیں۔
 معلوم تھا گھر میں بھائی اور بھانجی کا محل لکنا پتا
 ہو گا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو فون پر انہیں تاخیر کا اٹھا کر
 ٹھہر جاتیں مگر اب سب کے سامنے اس موضوع پر
 بات کرنا ہے محل تھا پھر وہ کہیں بھی تو کیا؟ ہزاروں
 سوالوں کا سامنا کرنا تھا انہیں وہ کیا جواب دیتیں اور
 کس کس کا ہتھ۔
 "چلو بولی ہی سہی" دیر آید درست آید۔ اب گھر
 پہنچ کر انہیں سہلی بولی ہوں گے پتا کر م کیا ہے۔
 باہر نظیں تو سونے سوانے پر تھا اور سہلی وہاں ہر
 جگہ سنانے کا راز۔ چہ نہ پر نہ بھی گری سے گھبرا کر
 کہیں سبز چتر کے سایوں میں جا پیچھے تھے سڑک پر
 دور دور تک کسی سواری کا ٹیم و نشان نہ تھا اور لوگ
 پیچھے تھے کہ سیدھے منہ پر پڑے جاتے تھے۔
 سہلی کی ٹکڑی کھڑے کھڑے چند منٹ انتظار کے بعد کسی
 سواری کی حلتا میں سڑک کے کنارے انارے چلنے
 کو نہیں کہ انہیں عاصمہ کا خیال آیا۔
 "وہی تو ہے آفت کی پرکھ" بی جوا کہیں کی۔ اپنی
 اماں جیسی طبیعت پانی ہے سا جزاوی نے لے لے کے
 بے برکی اڑا دی۔ کیوں نہ اس سے دو دو ہاتھ کرتی
 چلوں میری بچی۔ اتنی بڑی تھمت لگانے کی ہمت کیسے
 ہوتی اور اس کی ساس تو یہ ہے "کوئے کا آوازی بگڑا ہوا
 ہے۔"
 اس خیال کے آتے ہی انہوں نے رخ موڑ کر پچھلی
 گلی کی جانب کر لیا۔ جہاں زہرہ خاتون کی بیٹی عاصمہ کا
 سر لٹھ کر تھا۔
 عاصمہ اور سہلی کے گھر ایک ہی مکے کی گلیوں میں
 واقع تھے یہ ہی وجہ تھی کہ جب زہرہ خاتون نے سہلی
 کے متعلق بات کی تو انہوں نے یہ سوچتے ہوئے یقین
 کر لیا کہ نزدیک رہنے کی وجہ سے وہ اس کے حالات کو
 فوری جان لے ہوگی۔

عاصمہ کے گھر میں اس وقت دینے کے کھانے کی
 تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ اور اس کی دونوں چھٹیاں
 بھانجی میں مصروف تھیں۔ بچوں کا شروع غل اٹھا تھا کہ
 کان بڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ عاصمہ بڑے کنبے
 میں بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر لٹکے سے زیادہ پھٹی
 بازار کا ملن ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بار بار زہرہ
 خاتون کے ساتھ اس کے بھائی کی گلی میں اور پھر اسی
 طرح کا آواز سننے کا ماحول دیکھنے کو ملتا تھا۔ جیسے کسی
 پلیٹ فارم پر گاڑی آئے ہو یا گاڑی سے اتر رہی ہو۔ اس کی
 ساس اچھی خاصی وضع و آواز سن سکتی تھیں۔ مگر انہیں تو
 آج صرف عاصمہ درکار تھی۔ ان کے تورا رہے
 تھے کہ اگر وہ انہیں اس وقت مل جائے تو اسے کیا
 چہلے سے دریغ نہ کریں گی۔
 ان پر نظر پڑے ہی ایک بچہ عاصمہ چاچی کو بلانے
 دوڑا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بچن کی چاہت چلی
 آئیں۔ عاصمہ کو انہوں نے دروازے میں ہی آیا۔
 "اسلام علیکم خالہ!"
 "و علیکم السلام" جواب خالہ نے کڑے توروں میں
 عاصمہ نے چہرے پر افسوس کی غاری کرتے کی
 کوشش کی۔
 "تو آپ کو پتا نہیں کیا میں تو خود سہلی ہی کی طرف
 جانے والی تھی۔ آج کام روز سے کچھ زیادہ تھا۔ ابھی
 فارغ ہو کر۔"
 "باس۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ بھی
 کہنے سے روکا۔
 "تم فارغ ہو یا مصروف مجھے اس سے کوئی غرض
 نہیں۔ میں تو صرف یہ پتا کرنے آئی ہوں کہ تم نے
 ہماری بچی کے بارے میں یہ زہر افشانی کیوں کی؟ اس
 بات کا بدلہ لیا ہے تم نے اس سے؟"
 عاصمہ کا کان کاچوٹنے لگی۔
 یہ خالہ کیسی زبان بولی رہی ہیں؟ اوپر سے ان کا لہجہ
 یعنی ایک تو کڑا اور سے ہم پر تھا۔
 "آئیے خالہ! اندر بیٹھیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔"
 اس کی خالہ نے آگے بڑھ کر بات سننا چاہی۔

"تم پر سے رو۔" میرا اس کا معاملہ ہے۔" انہوں
 نے اٹھ کر اسے باغیچہ چل دیا۔
 عاصمہ نے ان کے لوگوں کے دیدوں کا پانی مر گیا
 ہے۔ اس میں وہ گتے ہیں دن چڑھنے کا انتظار بھی
 نہ اور راتوں رات انہیں پھیلا دی گئیں۔ اوپر سے
 وہ وہاں پہنچتی ہیں کہ بیٹیاں تو سانس بھی ہوتی ہیں۔
 اسے میں پوچھتی ہوں اگر سہلی کی جگہ عاصمہ کا ٹیم لیتا
 کوئی تو؟"
 شور کی آواز سن کر عاصمہ کی ساس بھی آگئیں۔
 عاصمہ کو گویا لاکھوں دنوں میں بس نہیں سنے جانے رفتن نہ
 پاس نہ تھا۔
 "خالہ! ہوا کیا ہے؟ آپ اتنی ناراض کیوں ہیں؟"
 وہ روٹتی ہو کر بولی۔
 "قرآن چاؤں اس مصیبت کے جس بے نیازی
 سے فرمایا جا رہا ہے کہ ہوا کیا ہے۔ میں کتنی ہوں کیا
 نہیں ہوا ہے وہ تو شکر ہے میری عقل نے کام کیا میں
 اپنے ہی اٹھ کر چلی دی۔ ورنہ کہیں میاں کے فیصے کا
 "میں تیار ہے۔ کوئی بڑا فیصلہ ہو جائے تو ہماری بچی بچ
 کر رہ جائی۔" وہ منہ پر دوشہ رکھ کر پک پک کر کہنے لگی۔
 عاصمہ کی ساس انہیں قہقہہ کر کے میں لے
 آئیں۔
 "بیٹہ جانیے میں! عالاہ! کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔
 آرام سے بیٹھ کر سکون سے بات کرتے ہیں۔"
 "عاصمہ بیٹا لپٹی لے کر آؤ۔"
 اور وہ ایک سی جھونٹ گلاس نکالی کر گئیں۔
 "زہرہ! میں کو فون میں نے ہی کیا تھا۔ عاصمہ نے
 بھی بات کی تھی۔ وہ تو سہلی کی بہت ہمدرد ہے۔ کل
 سے بہت پریشان۔"
 "لے لے کہے کی پریشانی؟ سہلی اپنے گھر میں خوش
 ہے۔ میں ابھی وہیں سے آ رہی ہوں۔"
 عاصمہ اور اس کی ساس نے چونک کر اک دو بے
 کی جانب دیکھا۔
 "تو کیا انکسائی یو اسے جھوٹ بولا تھا۔" وہ بے ساختہ

بولی۔
 "کیوں انکسائی بولا؟"
 "سہلی کی خالہ دار ہے۔ بھلی عورت ہے۔ پیوہ ہے
 اور مکے کے گھروں میں خوب آتا جاتا ہے۔ کوئی ایسی ہی
 جوا بھی نہیں کہ دوسری کو دھڑکاؤ پھرے۔"
 "تو سہلی پہ تو وہ ہاتھ دکھائی۔" فہمیدہ تینم چرک
 کے بولیں۔
 "خیر میں اسے آپ کے سامنے بلوائے لیتی ہوں۔
 دیکھیے کیا کہتی ہے۔" عاصمہ کی ساس حقیقتاً
 شرمندہ تھیں۔ بات ان کے گھر سے نکلی تھی اور یہی
 بے سرو پا۔
 ذرا سی دیر میں انکسائی بوا بھی آگئیں۔
 "اللہ جھوٹ نہ بلوائے یو! خود اپنے گنہ گار
 کاٹوں سے تاپے خدا کو جان دیتی ہے۔ برا بھلا سب
 آگے آئے گا۔ میں کیوں بچیوں کی راہ کھولنی کرتی
 لگی۔"
 وہ تو پرول پاپانی نے بڑے دے رہی تھیں۔
 "کس سے سنا ہے تم نے؟ کیا مرلو کے منہ سے؟"
 فہمیدہ تینم ایک مرتبہ پھر پریشان ہو گئیں۔ کہیں
 سہلی نے ہماری پریشانی دیکھتے ہوئے کچھ چھپانے لیا ہو۔
 یہ کوئی خاموش جھجھوٹ نہ ہو۔ مراد میاں بھی تو افس
 نہیں کرتے۔
 "گھر نہیں۔" انکسائی نے انہوں نے خود کو جھٹلا
 دیا۔ "یہ معاملہ ایسا ملکا تو نہیں۔"
 "خیر مراد سے تو نہیں۔" انکسائی بوا کو یاد کر بولیں۔
 "مجھ سے تو عارف نے بات کی تھی۔ اور بی بی امیں
 نے تم لوگوں سے آکر صرف اس لیے کہہ دیا کہ
 تمہاری قربت داری ہے بس۔"
 عاصمہ کی ساس نے ٹھنڈی سانس بھری۔
 "گوایا بات ابھی دور تک جانی ہے۔" سب ان عارف
 تینم کا کیا عارف ہے؟"
 فہمیدہ تینم کا طنز لہجہ عاصمہ کی ساس سے چھپانے
 روکا۔ گھر موندی گئیں۔
 "انکسائی بوا کی دیوار سے دیواری ہے۔ اپنی سہلی بچی

اصل بات کا کھوج کانے کی انہی بڑی تہی کہ وہ کمر
 کھنڈر بنے ہوئی پہاڑی کو بھی فراموش کر بیٹھیں۔
 "اے بی بی! اسے دینی ہو۔ اچھا ہے۔ ۱۱۰۰ کا ۱۱۰۰ اور
 پانی کا پانی ہو جائے۔" وہ تیری طرح اٹھ گئیں۔
 تھوڑی دیر بعد اٹھارہ بیس سال کے لگ بھگ ۱۱
 لوگ ہیں ذرا تنگ روم میں داخل ہوئیں۔ طے سے
 اچھے کمرے کی سنبھلی ہوئی بچیاں کھتی تھیں۔
 "جی آئی! آپ نے بلوایا؟" سلام دعا اور خیریت
 کے تبادلے کے بعد انہوں نے استفسار کیا۔
 "بیٹا! یہ سنبھلی کی علیحدگی کا کیا قصہ ہے؟" عاصمہ کی
 ساس نے صاف صاف بات کرنے کی غفلت۔
 "سنبھلی کی علیحدگی؟ کیا مطلب آئی؟ میں سمجھی
 نہیں۔" ان میں سے ایک جو دوسری سے بڑی معلوم
 ہوئی تھی۔ اچھے اچھے انداز میں بولی۔
 "اے وہی طلاق کی بات پوچھ رہی ہیں خالہ۔"
 عارفہ بیگم نے رہی سہی کسر نکال دی۔
 "طلاق؟ کس کی طلاق؟ سیدھی بات کریں خالہ!"
 "اس میں سمجھنے سمجھانے کی کیا بات ہے۔ کل تم
 لوگ بات نہ کر رہی تھیں اپنی سنبھلی سے کہ طلاق تو
 ہو گئی ہے۔ کمرے کی وجہ سے سنبھلی پریشان ہے۔ اس
 کا کیا ہے گا۔ اسے ملے گا یا پاپ کو۔"
 "وہ! کڑی نے تاسف سے ہاتھ مارا۔
 "وہ تو ہم سلیمہ آپا کی بات کر رہے تھے۔"
 "سلیمہ کیا؟" سب کے منہ سے یکسو وقت نکلا۔
 "جی ہاں! نکڑ والے حکیم صاحب کی بیٹی سلیمہ
 آپا۔"
 "مگر اسے تو طلاق ہوئے سال بھر ہو چکا ہے۔"
 نظامی بوا بولیں۔
 "جی ہاں۔ مگر ان کے بچے کا مسئلہ لگا ہوا ہے۔ ابھی
 تک تو وہ ماں کے پاس رہا ہے۔ مگر اب باپ نے عدالت
 میں کیس دائر کر دیا ہے۔ ہماری اس دوست کی بہن
 وکیل ہے۔ فیملی کیس جیتی ہے۔ سلیمہ آپا کے کہنے پہ
 ہی ہم اس سے بات کر رہے تھے۔"
 اور عارفہ بیگم کو لگا۔
 کہ قیامت کی گھڑی آج کے بعد نہ آئے گی۔

کے کمرے سے تیسرا کمرہ ہے ان کا۔ چلے میں آپ کو لیے
 چلتی ہوں۔ آپ اپنی کرسی کر لیں۔ بہن۔"
 عاصمہ کی ساس کا بس نہ چٹا تھا کہ اپنے کمرے پہ
 بڑی ملامت کی گرد کو کسی طرح سے دھوا لیں۔
 ذرا دیر میں نظامی بوا غصہ و بیگم اور عاصمہ کی ساس
 پر مشتمل یہ وفد عارفہ بیگم کے کمرے میں تھا۔
 یہ محترمہ بہت اچھے طریقے سے ملیں۔
 آنے والوں کی گہری بنیادی کو دیکھتے ہوئے انہیں
 زیادہ انتظار نہیں کروایا اور پانچ منٹ میں اسکو امش کا
 جگہ لیے ان کے پاس آ بیٹھی۔
 "عارفہ! ہم تم سے کچھ پوچھنے آئے ہیں۔"
 عاصمہ کی ساس نے گھنٹا اٹھا کر گلاس ہاتھ میں
 تھامے ہوئے بات شروع کی۔
 "پوچھنے خالہ! ایسی کیا خاص بات ہو گئی؟"
 "کون سا عارفہ! تم نے نہ ذکر کیا تھا مجھ سے سنبھلی کے
 حادثے کا؟"
 نظامی بوا کو الفاظ کا چٹاؤ نہ آیا تھا۔ فمیدہ بیگم اپنی
 جگہ پہ پلویا کر رہ گئیں۔
 "ہاں تو کچھ غلط تو نہ کہا تھا میں نے۔ اب تک تو
 سارے مجھے کو خبر ہو چکی ہوگی۔ عذر اور مہذہ ان کی
 جہاں سے ہم نوالہ وہم بیاہ ہیں۔ ان سے کیا چھپا ہے
 بھلا؟"
 "عذر اور مہذہ؟" عاصمہ کی ساس نے سوالیہ
 نظروں سے اسے دیکھا۔ سلطان خان صاحب کی
 بچیاں۔ فرید صاحب کے ساتھ والا کمرہ ہے ان کا۔ وہ
 نشاندہی کرتے بولیں۔
 "اچھا! اچھا! یہ ان کا کیا قصہ ہے؟" انہوں نے
 بات برسرِ حال کی۔
 "میں کل ان کے ہاں گئی تھی۔ سلطان صاحب کی
 بیگم سے کلام تھا۔ مجھے گی تو وہ کمرہ نہ ملیں اور بچیوں کی
 کالچ کی کوئی کرسی آئی جیسی تھی۔ اسی کو بتا رہے تھے یہ
 لوگ۔ میں تو ان ہی قدموں پہ لوٹ آئی دل دھکتا ہے
 اس طرح کی باتوں پہ۔ گنہ سب کی بچیوں کا نصیب۔"
 "آپ ان لوگوں کو یہاں بلا سکتی ہیں؟"
 فمیدہ بیگم نے اس دوران پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

میں کی گئی یادگار

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے کیا ہو گا؟" ہاتھ میں
تھامے کانڈ پر غور دواتے ہوئے وہ اچھی خاصی شکر ہوئی
"ارے کچھ نہیں ہوتا" رطاب نے اس کے
کنڈھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا اس کا تھوٹا ہونٹا
کی کوشش کی۔
"میری زندگی کا پہلا موقع ہے یہ اتنا بڑا مشاعرہ اور
میں ان سب میں نوآموز ہوں۔ اتنے بڑے بڑے شاعر
ہوں گے وہاں۔ میں کیسے پڑھوں گی ان کے سامنے۔"
"جیسے پہلے پڑھتی رہی ہو یونور شی میں کلج میں۔
اسی طرح ان سب کے سامنے بھی پڑھ دینا۔"
"کلج یونور شی کی اور بات تھی وہاں یہ ساقی

اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز ہی ہوتے تھے اور یہاں تو پورے
ملک کے نامی گرامی شعراء ہوں گے میں تو ابھی سے
نروس ہو رہی ہوں۔" اس نے بے چارگی سے رطابہ
اور ماہ کی طرف دیکھا۔
"تم پڑھو تا میرے سامنے اور یہ تصور کرو جیسے
مشاعرے میں سب کے سامنے پڑھ رہی ہو۔" کلج نے
کانڈ پر لکھی غزل اس کی طرف بڑھائی۔ یہ غزل اس
نے یونور شی میں ہونے والے بین الاقوامی مشاعرے
میں پڑھی تھی اور پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ پھر اس نے
ایک ایلی بلسا میں بھی لکھی۔ اسے جینے کی امید تو
نہیں تھی مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہاء نہ رہی

مکمل ٹائون



جب اولیٰ رسالے کے مدیر کا اسے خط ملا۔ پروانے اس کے بعد اپنی کچھ اور تخلیقات بھی ان کو بھیجی۔ جس پر اسے تحریری خطوط موصول ہوئے۔ پھر ان مدیر کے توسط سے اس کا رابطہ دیگر شعراء سے ہوا اور ان ہی کے توسط سے اسے مقامی مشاعرے میں حصہ لینے کا موقع ملا۔

یونیورسٹی میں تو وہ مشہور ہو ہی چکی تھی مگر اب ادبی حلقوں میں بھی اس کی پذیرائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس کا ثبوت یہ دعوت ہے کہ اسے توبہ کچھ خواب لگ رہا تھا جیسے وہ آنکھ کھولے گی تو ٹوٹ جائے گا۔ طلبہ اور گل اس کی کزن بھی تھیں اور دوست بھی۔ اپنے خوف اور گھبراہٹ کا اظہار اس نے سب سے پہلے ان دونوں کے سامنے ہی کیا۔ پر گل خاطر میں ہی نہیں لائی۔

”چلو پر جواب۔“

وہ یقین اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ پروانے اپنا حوصلہ جمع کیا اور بڑے اطمینان سے غزل پڑھ دی۔ ”گدھ اس غزل کے ساتھ ایک اور غزل پر نظم بھی پڑھ دیا۔“ ”طلبہ اس کی شاعری والی فائل انٹرنیٹ پر دیکھ رہی تھی۔“

”پڑھنے کوں سے پنوں کی۔“ لب اسے کہنوں کی فکر لاحق ہوئی تو رطلابہ اور ماہ گل اس کے کہنوں کی الماری کھول کر کھڑی ہو گئیں۔ بڑی دیر اور بحث کے بعد پروانہ فیزی لانا تک شرت کے ہمراہ بینک پر منتقل ہوا۔ وہ پینڈ آیا۔ شرت پہ بہت خوب صورت لیس گئی تھی ساتھ چوڑی دار پائیکامہ اس نے بہت شوق سے بولا تھا۔ رطلابہ نے بہت چاکو سے چوڑیاں بھی نکالیں۔

”یہ دونوں سیٹ بھی پینڈا نام کھائیں میں۔“ فیزیوزی اور گلابی بیچنگ چوڑیاں اس نے پروا کی بیڑ کے سائیز میں بیچ رہے ہوئے یا دہلی کروائی۔ ماہ گل نے ڈھونڈ کر ہم رنگ اسکارف بھی نکال دیا۔ ساتھ گلوں والی بہت تازہ اور اسٹائلش سی جوتی بھی۔

ان دونوں نے بار بار غزلیں اور نظمیں پروانے پر صوفائی۔ رات گئے سونے سے پہلے تک یہ بحث چلتی رہی۔

اقراء اور انجم بخاری دیکھ کر شرت سے پروانہ کی ایک سی تو ادا رہی۔ جس کو دیکھ کر وہ حقیقی معنوں میں جیتے تھے۔

انجم بخاری داکٹر تھے جبکہ اقراء پوس وائف تھیں۔ ان کا ارادہ پروا کو بھی ڈاکٹر بنانے کا تھا مگر اس کا رجحان اس طرف نہیں تھا۔

وہ شروع سے ہی بہت اچھی اور اپنے استاد کی منگور نظر طلب رہی تھی۔ کھیل کامیاب ان ہو کہ تقریری مقابلہ یا کوئی میوزیکل ایونٹ ہو وہ ہر جگہ نمایاں ہی رہتی تھی۔

اس کے کمرے میں تقریبی سرٹیکلیش اور ٹرائیاں بھی ہوتی ہر آنے جانے والے کو اس کی دلچسپی اور کامیابی کی کہانیاں سناتی تھی۔ جنہیں سن کر اس کا سر فخر سے بلند ہونے لگتا تھا۔

یونیورسٹی میں داخلے کے وقت اس نے اپنی مرضی سے انٹر میڈیٹ ریشیز کو بطور مضمون چنا۔ ایڈمیشن کے بعد حسب عادت اس نے زور و شور سے غیر نسلی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور کچھ ہی عرصے میں اس کا شمار یونیورسٹی کے قابل ذکر طلباء میں ہونے لگا۔ غیر نسلی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس کی توجہ بڑھانی پر بھی برقرار تھی یہی وجہ تھی کہ جب پہلے سنسور کا رزلٹ آؤٹ ہوا تو بیشک کی طرح وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئی۔

دور در شووار سلوکی اور راہیہ اکٹھے جیسے شام کی چائے پی رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں فیصل لغاری اور اور پار بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ فیصل دو دن سے گھر ہی تھا اس سے پہلے وہ مسلسل کچھ مینٹوں سے بڑی تھا۔ حالیہ کیس کو کامیابی سے مکمل کرنے

کے بعد اس نے پولیس ڈپارٹمنٹ سے کچھ دن کی چھٹی لی تھی تاکہ ذاتی اور نسلی طور پر پھر سے تازہ دم ہو کر اپنی پسندیدہ سرگرمیوں میں حصہ لے سکے۔

فاس وقت میں وہ جم چلا جاتا، ٹینس کھیل لیتا۔ ان سرگرمیوں میں بھرپور طور پر اس کا ساتھ باہر دیتا جو نہ صرف اس کا ہنسوتا بلکہ کزن بھی تھا۔ فیصل اور پار کے والد انہیں میں بھائی تھے۔ دونوں کے گھر بھی اکٹھے تھے۔ دونوں خاندانیں اور ایک چھوٹا بھائی اور چھ بھین۔ فیصل ڈر شوار اور حیاتین تین۔ من بھائی تھے۔ پار کی صرف ایک بہن سلوکی تھی۔ راہیہ ان کی چھوٹو کی بیٹی تھی جبکہ دوری بڑی خالہ کی صاحبزادی تھی جو اکثر اوقات انہی کے گھر پائی جاتی۔

راہیلہ اور سلوکی کو کل ایک مشاعرے میں جانا تھا۔ دونوں قائد اعظم یونیورسٹی میں اکٹھے زیر تعلیم تھیں، اسی کے حوالے سے باتیں ہو رہی تھیں۔

”ہماری لائف میں کوئی نیا پن نہیں ہے وہی روز کی رو میں گئی ہے۔“ زیادہ سے زیادہ پار جا کر ہوٹلنگ کر رہی تھی۔ پار اکٹھی بورل لائف ہے ہماری۔ راہیہ نے بڑے مظلوم انداز میں ان سب کو کھنا تھا۔ ”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو پہلے کبھی کبھار ہم لوگ میوڈک کسٹرس میں بھی چلے جاتے تھے اور اب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ گھر واپس آنا ہی نصیب نہ ہو۔“

ڈر شوار نے ان کی بات میں ہل مدنی تو سلوکی کی آنکھیں پٹک تھیں۔

”کیوں نہ آپ بھی کل مشاعرے میں ہمارے ساتھ چلیں۔ کیوں پار بھائی کیا خیال ہے؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ فیصل سے باتوں میں مصروف تھا جو تک کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”بھائی آپ بھی چلیں نا ہمارے ساتھ۔“ سلوکی نے ان کا کندھا تھام لیا۔

”شاعرے میں اور کہاں۔ ذرا چنچ ہو جائے گا۔“ پار فوراً ”میں گیا۔ پار نے فیصل کو بھی آفر کر دی۔

”آپ کو پتہ ہے کل مشاعرے میں ہماری یونیورسٹی کی پروا اور گل بھی حصہ لے گی اس لیے تو ہم بھی جا رہے ہیں۔“ سلوکی نے انکشاف کیا۔ فیصل کو مشاعرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ان سب کی وجہ سے بالکل خواستہ جانے کے لیے راضی ہو گیا۔

تراب لغاری ڈی ایس پی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کا سروس ریکارڈ بے داغ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شروع سے ہی فیصل کا آئیڈل تھے اسی وجہ سے ہی ایس ایس کرنے کے بعد اس نے پولیس ڈپارٹمنٹ جوائن کیا تھا۔ جبکہ پار نے اپنے والد رجب لغاری کی طرح پوس میں ان کا ہاتھ بنانے کو ترجیح دی تھی۔

”اس پورے خاندان کی محبت آپس میں مثالی تھی۔ جس نے سب کو ایک دوسرے میں پندھا ہوا تھا وہ ہستی مصفورا انیمک تھی۔ ان کی محبت کرنے والی مشفق اور دو جوان سب سے یکساں محبت کرتی تھیں۔ وہ سب ان سے بہت قریب تھے۔ وہ سب کی خوشی دکھ سکھ میں شریک رہا کرتی جس کی وجہ سے ہر کوئی انہیں چاہتا تھا۔ فیصل لغاری ان کا سب سے لاڈلا تھا۔ پار تو وہ حیات اور پار سے بھی کڑی تھیں مگر فیصل سے انہیں کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا۔“

ڈر شوار اور پار کی شادی کے بعد سب کی نظریں فیصل کی طرف مرکوز تھیں۔ خود مصفورا انیمک چاہتی تھیں کہ اس کی شادی ان کی زندگی میں ہی ہو جائے۔ اس کے لیے جیسے جیسے لڑکیاں دیکھی جا رہی تھیں۔

بڑی چھوٹا کابل تھا کہ فیصل کی دو بہن راہیہ بنے۔ اور خالہ کا بھی کچھ ایسا ہی ارادہ تھا مگر فیصل نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے خاندان کی سب لڑکیاں بہنوں کی طرح لگتی ہیں۔ اس بات پر بڑی چھوٹا اندر ہی اندر خفا تھیں کہ فیصل نے اچھا بہانہ تراشا ہے۔ پھر بھی اندر ہی اندر انہوں نے اپنی کوششیں جاری رکھی ہوئی تھیں۔

اتنے نای گرامی شعرا سے ملنے اور قریب سے دیکھنے کا پہلا موقع تھا۔ بیک وقت وہ خوش فہمی تھی اور غور سے بھی۔

مشاعرو شروع ہو چکا تھا۔ گلاب بگاہے اپنی کلاس فیلو زہ نظر ڈال کر اس کی بہت بڑھ جاتی۔ رملاب اور ام کل بونٹے بونٹے سے پروا کی بہت بڑھ رہی تھیں۔

فیصل نے لاکھ واٹمن چٹا چٹا جاکہ میں آپ لوگوں کو ڈراپ کر کے کلاش کی طرف چلا جاؤں گا گھر بار پرے ایک نہ چلے دی۔ سلوی اور راجیہ کی خوشی دینی تھی ان کے ساتھ وہی بھی شوق میں چلی آئی تھی کہ میں نے بھی کسی شاعر کو قریب سے نہیں دیکھا۔

وہ اگلی صفوں میں تھے۔ اسٹیج کے سین سامنے اس وقت ایک نو آموز شاعر اپنا کلام سنار تھا۔ حاضرین محفل میں ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل تھے۔

اس لیے محفل میں بڑی رفتار لگی سی تھی۔

"اب اپنا کلام پیش کرنے کے لیے پروا لوڑ گل تشریف لاتی ہیں۔" صدر مشاعرو اس کا نام پکار رہے تھے۔

ماہ گل اور رملاب نے آنکھوں آنکھوں میں اس کا حوصلہ بڑھایا۔

صرف ایک لمبے کی بات تھی۔ شرکاپہ نظر دوڑاتے ہی پروا کا اچھو بھل ہو گیا۔ اس نے نازک باتوں سے سائیک کلاس اپنی طرف موڑا۔

"یہ ہے ہماری یونیورسٹی کی پروا اوز گل! دیکھیں کتنی پیاری ہے۔" سلوی فیصل کی سیٹ سے تیسرے نمبر پر بیٹھی تھی۔

اس نے اپنا کلام شروع کیا تو روٹی کی آنکھوں میں پسینہ کی اترنے لگی۔

گزری ہوئی رات سے ڈر لگتا ہے نہ چھیر کہ جبر کی بات سے ڈر لگتا ہے نہ جانے دل کیا کر بیٹھے میرے ساتھ کیا کول اپنی ہی ذات سے ڈر لگتا ہے پروا اوز گل اپنی مخصوص دلکش آواز میں کلام پیش

کر رہی تھی۔ پابہ در شہوار اور راجیہ کے ساتھ اب فیصل بھی متوجہ تھا۔

اس کی آواز کا دلکش زیر و بم پوری طرح حاضرین محفل کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

فیصل کی نگاہ اس پر جبر سی تھی۔ ایک پر غور سی تمنکات اور محسوس سی سرکشی اس حسینہ کے سراپے سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

اب وہ اپنی ایک نظم "نار سائیں" سناری تھی۔

فیصل بھی اوروں کی طرح اس کی دلکش آواز میں کم سا تھا۔ وہ اپنا کلام سنار کر جا چکی تھی۔ پابہ نے فیصل کی دلچسپی محسوس کر لی تھی۔

"کیا بات ہے؟ اس نے فیصل کی طرف جھٹکتے ہوئے چھیرا اڑا دیا۔

آنکھوں میں چمک لیے لیے لہجے میں دلکش کھنکھ سموتے وہ بہت سے شعراء کو اپنی طرف متوجہ کر چکی تھی۔

مشاعرو کا اختتام ہوتے ہی راجیہ اور سلوی پروا کی طرف بڑھ گئیں۔ آخر کو ان ہی کی ٹیڑھ ٹیڑھ کی سلوی نے در شہوار بھائی اور روٹی کو بھی کہیں لیا اور سیدھی پروا کے پاس جا رہی۔ وہ بہت خوش تھی۔

ساتھی اسٹوڈنٹ کو اپنے درمیان پا کر سلوی نے بھی دل کھول کر اس کی تعریف کی ساتھ در شہوار اور روٹی کا تعارف بھی کروایا۔

"پروا! میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔"

راجیہ نے لگے ہاتھوں اپنی خواہش بیان کر دی۔

"ہوئی نہیں" میں آپ کی دوستی تو ہوں۔ پروا ہولے سے مسکائی۔ اور فیصل اور رملاب انہیں ہی دیکھتے رہے تھے جو اچانک ہی ان کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔

"پابہ! ڈاؤن امیں گھر بھی چلنا ہے۔ تو توجہ ہی گئے ہیں۔" اسے اب غصہ آ رہا تھا۔

"کو چلتے ہیں ورنہ ان کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔"

پابہ نے قدم آگے بڑھاتے تو پابہ اسے بھی تھکید

کے توجہ سے نہیں جانے رات اور جبر کی گزارنے کا ارادہ تو نہیں۔ پروا کی پشت اس کی طرف بھی وہ اسے نہیں دیکھ پلا۔ لیکن اس کا مطلب یہ چاروں ہی تھیں۔

"اور فیصل بھائی ہیں۔ پروا! یہ میرے گزن اور در شہوار بھائی کے بھائی ہیں فیصل لغاری۔ اس شخص کو میں ڈیڑھ ٹیڑھ میں ہیں۔" سلوی نے اس کا تعارف کرتے کر لیا تو پروا نے رخ موڑ کر اچھی سی نگاہ اس پر ڈالی تو فیصل نے بغور اسے دیکھا۔ تو وہی مشاعرو تھی جس کے ایک ایک شعر خوب یاد دی گئی تھی۔

چاہے بقوش اور بادی چمک دار آنکھوں سے سجا چہرا۔ سر پہ تنگ لٹکے لوڑھے۔ لڑکی خاصی حد تک بے نیاز لگ رہی تھی انداز میں واضح تمنکات فہمیاں تھیں۔

"پابہ! توجہ کی مشاعرو بلکہ کسی شاعر کی جیتی جاگتی غزل لگ رہی ہے۔" پابہ نے وہ بارہ اس کی نگاہوں کے ارتکاز کو محسوس کر لیا تھا۔ فیصل نے سر جھٹکا۔ وہ دونوں ان لڑکیوں سے قدرے ہٹ کر کھڑے تھے۔

فیصل اس رخ پر کھڑا تھا کہ اس کے سامنے پروا کا پورا سرا لٹکیا تھا۔ اس نے اپنے آپ میں بے چینی سی محسوس کی کچھ دیر بعد در شہوار سمیت ان تینوں نے بھی پروا سے اجازت چاہی۔

سلوی بہت چمک رہی تھی۔

"یہ جو تمہارے ڈیڑھ ٹیڑھ کی مشاعرو ہے نا ایکسٹن اس کا بہت نام ہو گا۔" روٹی نے گاڑی میں بیٹھتے ہی چوٹی کوئی کی۔

"ہم تو اس کا ابھی بھی نام مشاعرو ہے۔ آج کے مشاعرے میں دیکھا میں کتنے بڑے بڑے مشاعروں کے ساتھ ساتھ پروا جیسی اولی میدان میں نووارد مشاعرو کو بھی دعوت دی تھی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اولی طبقوں میں اس کا تعارف ہونے لگا ہے۔" فیصل خاموشی سے ان کے تبصرے مستجاب۔

راجیہ اور سلوی اب پروا کے گروپ میں شامل ہو چکی تھیں۔ وہ اسے معمولات ملوانے لاتی تھی۔

لالہ زار میں انجم بخاری کا ڈبل پونٹ چھوٹا سا گھر خوب صورتی اور سادگی سے سجا ہوا تھا۔ اس میں راجیہ اور سلوی جیسے شاہدار اور ویل ڈیکور شدہ گھروالی بات نہیں تھی۔ مگر پروا کی کسی بھی حرکت یا بات سے اس کا اظہار نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے مقابلے میں وہ خود کو کمتر تصور کرتی ہے۔ راجیہ اور سلوی نے وہیں بیٹھے بیٹھے اقراء اور پروا کو بڑے خلوص سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ خاص طور پر راجیہ چاہتی تھی کہ پروا بلدا ز جلد ان کے گھر آئے۔

ڈاکٹر انجم خود اسے راجیہ کے گھر ڈراپ کر کے آئے۔

وہ پہلی بار آئی تھی اس لیے اس نے مشورہ گیری سے بطور خاص ایک لیا تھا ساتھ خوب صورت گل ستر

ادارہ خواہمیں ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	قیمت
زندگی اکہ شوقی	500/-
خوشہ کا کوئی گھر نہیں	200/-
شہول کے دروازے	400/-
جس سے ہم کی شہرت	200/-
دل ایک شہر ہے	450/-
آنکھوں کا شہر	500/-

ہماری شاعری کے لیے آئی۔ ڈاکٹر انجم 2011ء

شعرا کے لیے

شعبہ ادبیات و شاعری

2216361

تھلا موسم کی مناسبت سے پروانے لان کا تہا سیت
 دیدہ زیب سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ راجیہ نے خاطر
 تواضع کے باپ پرست کچھ تیار کر دیا تھا تاکہ پروانے اس
 کا پہلا تاثر بہت اچھا پڑے۔ پروانے کو اس نے مبارکباد
 دکھایا۔ اس نے دل کھول کر تعریف کی مگر اس تعریف
 میں مرغوبیت کا شائبہ نہ تھا۔ راجیہ کا دل بھگہ سا
 گیا۔ اس نے پروانے کو بلایا یا اس لیے تھا کہ وہ اس کا گھر
 اور رہن سہن دیکھ کر متاثر ہونے جائے کیوں اسے پروانے
 کی پذیرائی سے عجیب سا حسد ہونے لگا تھا۔ اس نے
 دوستی میں پہل بھی اپنی دھاک بٹھانے کے لیے کی
 تھی۔ ہر چند کہ لڑکیاں اس کی حیثیت سے متاثر تھیں
 مگر پروانے کے گروپ میں ممتاز تھی۔ ساتھ راجیہ کو
 اپنی کم صورتی کا اچھی طرح احساس تھا وہ نامعلوم سے
 احساس کمتری کا شکار ہو رہی تھی جب سے پروانے کے
 گروپ میں شامل ہوئی تھی تب سے اپنی شکل و
 صورت کے بارے میں پروانے کی سوچنے لگی تھی۔

راجپوت کے ہاں دو گھنٹے گزار کر وہ واپسی کی تیاری کر رہی تھی جب راجپوت اسے سلوئی کی طرف لے آئی۔
یہ گھمبیرا رہی تو گھر تھا ایک سی سکیز میں۔ پروانے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔

راجپوت نے پروا کی آمد کا تپا نہیں تھا۔ اس کی اچانک آمد سے سلوٹی بہت خوش ہوئی۔ درشوار بھی وہیں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ دنیا جہن کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شام گویا پر بھی آفس سے لوٹ آیا۔ پروا سے اس کا حضور بہت تعارف مشاعرے میں ہو چکا تھا۔ وہ اسے بہت اپنائیت سے ملا۔ جو بالآخر پروا نے بھی بڑے سلیقے سے حال احوال پر پوچھا۔

سارا انیکم جو سکونی اور پیر کی والدہ تھیں۔ وہ بھی پروا سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ سکونی کی تقریباً ساری مسہلہاں ان کے گھر آئی جاتی تھیں اور ساری دوستوں میں انہیں پروا بہت مہذب، باشعور اور سلجھی ہوئی لگی تھی۔ بروا چلی ملاقات میں ہی انہوں نے اس کا اظہار کر دیا اور آتے چلتے رہنے کی تاکید بھی کی۔ کافی تاخیر ہو گیا تھا۔ نجم صاحب ابھی تک اسے لینے

کیوں پوچھ رہے ہو؟" پاپرنے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ایسے ہی۔“
 ”ایسے ہی تو پہلے تم نے بھی اس کی فریڈ کو کے
 بارے میں نہیں پوچھا تھا کہ بارے میں بھی نہیں
 جس نے تمہیں خود فریڈ کی آفر کی تھی۔“ بار
 نے اسے راجہ اور سلوی کی مشترکہ دوست کا نام لیا جو
 اس میں انٹریڈ ہوئی تھی۔

”میں اس لیے کہ رہا تھا کہ کہیں کوئی اور چکر تو نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں تم دوستی تو نہیں کرنا چاہتے۔“ بابر نے ڈرتے ڈرتے کہا اور ساتھ ہی اس کے نثرات جانچے۔ دونوں بچپن سے اکٹھے لیے بڑھے تھے۔ بابر اس کی ایک ایک بات سے واقف تھا۔ فیصل نے غصے سے اسے دیکھا تو بابر کو اس کے غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

”یاد رہے اور سلوی اس کی بہت تعریفیں کرتی ہیں اور دونوں متاثر ہیں اور تو اور آج ممانے بھی کہا کہ آئندہ آتی جاتی رہے سلوی کی ساری غرض و وس سے پروا واحد لگی ہے جو بیخ کنیں پسند آتی ہے۔ میں نے کھر بھی دیکھ لیا ہے چھوٹا اور خوب صورت سا کھر ہے۔ پروا کی طرح باوقار اور ایک بات جو میں نے محسوس کی ہے کہ پروا اپنی انا اور خودداری کا خیال رکھنے والی ہے نہ فیصل چپ سا ہو کیلے خودی دیر اور دوسری باتوں کے بعد وہ کھر لوٹ آئے۔“

پروا اپنی بیخود شہی کی نمائندگی کرنے مشاعرے کے لیے لاہور تشریف ہوئی تھی اس بار بھی اپنی بیخود شہی کے لیے پہلا انعام اسی نے جیتا تو گروپ میں شامل سب فریڈ ز نے ٹریٹ کا مطالبہ کیا پروا نے سب کو کھرپہ ٹو اٹھ کر لیا۔ کھانے کے بعد انہوں نے پروا سے تازہ کام سننے کی فرمائش کی تو لطف دہلا دیا۔

بردا کو لے آئی۔ سب رشتہ دار جو دوسرے شہروں میں مقیم تھے وہ بھی پہنچ چکے تھے۔ کچھ مہمانوں کو تراب لغاری کی طرف مقرر کیا تھا۔

منہدی والے دن سب لڑکیاں انہی کی طرف تیار ہو رہی تھیں۔ بالکل سی پچی ہوئی تھی ہر کوئی جلدی میں تھا۔ بردا کا وہ بی بی عین مل رہا تھا اس نے آتے ساتھ ہی لڑکیوں کا ایک ڈر شوار بھائی کے حوالے کیا تھا۔ وہ بھی تیار ہونے اپنے گھر گئی ہوئی تھیں بردا وہاں سی سی ہوئی کیونکہ سب لڑکیوں کی تیاری فاضل مراحل میں تھی ایک وہی تھی جو نما کر بال کھولے ایسے ہی محوم رہی تھی۔ ایک بار پھر اس نے سلوی کا سارا کمراد کھٹا پھر راتھ روم تک چیک کیا وہ بی بی ہوتا تو لبتا۔ بڑی دیر بعد اسے سلوی سے پوچھنے کا خیال آیا تو اس نے کہا کہ تمہارے کپڑوں کا ایک بھائی نے لایا اب لو کی طرف رکھوایا ہے، بلکہ اور کرنزی بھی سب چیزیں اوھر رہی ہیں۔ اسے خود یہ غصہ آیا۔ اگر خود ڈھونڈنے کے بجائے وہ سلوی سے پوچھ لیتی تو اتنا تاہم تو صرف ہوتا وہ اب تک تیار ہو چکی ہوئی۔

”بردا بھائی بھی اوھر رہی ہیں تم بھی جا کر اوھر ہی تیار ہو جاؤ اوھر تو بہتر بھری ہوئی ہے۔“ وہ اسے ہنوز اپنی جگہ کھڑا دیکھ کر بولی۔

”میں کس کے ساتھ جاؤں تمہارے تلیا کے گھر میں پہلے بھی نہیں گئی۔“ اس کی بے چارگی دیدنی تھی۔

”یہ ساتھ ہی تو گھر ہے، بھابھی بھی اوھر ہیں میری کرنزی بھی۔ سب جانتے ہیں جنہیں ملنی ڈیرا“ وہ پیار سے اس کی ٹھوڑی پھونک رہی۔

”چلو میں جاتی ہوں۔“ اس نے سر پہ انکارف اچھی طرح اوٹھ کر وہ پیشہ شانوں پہ چلیا۔

پس جاؤ گفت پھنڈاتی سب بھی تیار ہو رہی ہیں۔ میں ابھی نہیں خود ہوانے والی تھی۔“ وہ تیز تیز کوئی بہت مصروف نظر آ رہی تھیں۔

ڈر شوار کمرے کی طرف اشارہ کر کے خود جانے کہاں غائب ہوئی۔ اوھر بھی اچھی خاصی پچھل چکی ہوئی تھی۔ راجیہ کس نظر میں آ رہی تھی اسے کچھ سوچتے ہوئے اس نے ڈر شوار بھائی کے بتائے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اوھر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اندر آ کر بیٹھنے پر غور کیا۔ مگر کپڑے تو درکنار اسے کپڑوں کی جھلک تک نظر نہیں آئی وہ باہر نکلتے ہی گئی تھی کہ کوئی تیزی سے اندر آیا۔

فیصل بھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ اس طرح اس کے بند روم میں ہوگی۔

”اصل میں ڈر شوار بھائی نے کہا تھا کہ میرے کپڑے اس کمرے میں ہیں میں ان ہی کے لیے آئی تھی کیونکہ میرا ایک بھائی نے اوھر رکھوایا تھا مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ آپ کا کمرہ ہے اور میرے کپڑے کس اور ہیں۔“ زندگی میں پہلی بار اس کا لہجہ لڑکھا لیا تھا اور اندھ بھی پہلی بار کہہ رہا تھا وہ دوسری سی تھی۔

”اسلام کیسے کہیں ہیں آپ؟“ فیصل نے پوچھا کچھ سنا ہی نہیں۔ اس کی نگاہوں میں دلچسپی کی اتنی گہری چمک تھی کہ بردا کو صاف محسوس ہو رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ بھابھی سے پوچھوں اپنے کپڑوں کے۔“ وہ سائیڈ سے ہو کر باہر نکلی۔ وہ بیڑھیاں اتر رہی تھی جب راجیہ پہ نظر پڑتے ہی اسے کچھ اطمینان کا احساس ہوا۔

وہ تیزی سے گریڈ ورس غائب ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

بردا نے سکون سے کپڑے پہنے۔ لمبے بالوں کی چوٹی بالی اور آخر میں موٹے کے کچھ سے دونوں کھائیوں میں پہنے۔ منہدی کے گفتگو کی مناسبت سے اس نے بہت خوب صورت کاڈر سوٹ پہنا تھا اور بالکا کا میک اپ بھی کیا تھا۔ اس کے نقش پل اٹھے تھے کہ ہاں تم سراپے جانے کے قاتل ہو۔ آئینے کی کوئی پہ وہ مسرور سی تھی۔

بالوں کی موٹی چوٹی آگے سائیڈ سے ڈالے وہ پیشہ انسان سے سر پہ جمائے وہ تیار ہو کر سلوی کی پاس آ گئی۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ سلوی نے اسے پاس بٹھایا۔

”تم رسم کے دوران میرے ساتھ ہی رہنا تاکہ سب کو یہ تو پتہ کہ پرواؤز کل میری دوست ہے۔“ سلوی کی حد درجہ محبت وہ مکراری۔

”میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی اس کی نگرانی میں“ وہ اس اور لڑکیاں مجھے نہیں آتیں تم کو پتہ ہی ہے میں اس طرح کے کاموں سے دور رہی رہی ہوں۔“ وہ محنت سے ناک چھاتے ہوئے بولی۔

”ہاں تم سب سے منفرد ہو انا لگ تھلک۔“ سلوی کی تعریف اس کا سر کچھ اور بھی اونچا ہو گیا۔ سلوی کی سرسرا سے منہدی آئی تو پہلے گالوں کا مقابلہ ہوا۔ اس کے بعد منہدی کی رسم کا آغاز ہوا۔ پچھلوں سے آگے آتے ہوئے سلوی پرواؤز دیکھ دو ستوں کے جمعیت میں آئی۔ پرواؤز سلوی کے دائیں طرف تھی۔ اسی طرف کچھ سی فاسلے پر فیصل لغاری باہر کے ساتھ کھڑا تھا۔ ساری روشتیاں جیسے آج پہ مرتکز تھیں ان سب کے حصار میں وہ اسے سب سے قاتل توجہ لگتی۔

ان سب لڑکیوں اور عورتوں کے درمیان وہ واحد لڑکی تھی جس نے وہ پیشہ سر پہ اوٹھا ہوا تھا اور اس

انسان سے اوٹھا تھا کہ وہ بے کاسن کی گنا بڑھا دیا تھا۔ فیصل کی نگاہ ایک بار پھر ہلک چکی تھی۔

بردا کو بھی کسی کی نگاہوں کے ارکٹاز کا احساس ہو چکا تھا مگر اس نے جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کون ہے۔ لیکن باہر سے اس کی یہ بے تابی آج پوشیدہ نہیں رہی تھی۔

”فیصل کیا بات ہے ڈر شرب ہو؟“ باہر نے انجان سے کام لیا وہ روتا رہتا تھا کیونکہ ایک بار پہلے وہ اس کا جارجانہ رو بہ دیکھ چکا تھا۔

”ہاں نہیں تو۔“ آج پہلی بار اس کا لہجہ اچھو سے خالی تھا۔

”ہوا کیا ہے آخر؟“ اس شور میں خاصی اونچی آواز میں وہ اس کے کان کیسے منہ لا کر بولا۔

”کچھ کھو گیا ہے یا۔“ بے اعتباری میں اس کے لبوں سے یہ جملہ پھسلا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

”کل نے فیصل لغاری آفسر آن ایسٹل ڈویژن کا بھی کچھ کم ہو سکتا ہے۔“ باہر کا لہجہ اتنا جتنی تیر تھا کہ اس نے کانچیں نہ لیں۔

”یہ جو شاعر لوگ ہوتے ہیں نامت حساس ہوتے ہیں اور یہ جو پرواؤز کل سے اس میں اٹلا جاتی جاتی ہے تم پولیس آفسر اور وہ شاعر تم آئین وہ جینم ترم وٹاک احساسات سے گدھی لڑکی۔ دیکھنا نہیں آئینوں کو جیس نہ لگ جائے۔ دھیان رکھنا۔ تم نے اب تک جتنی لڑکیوں سے دوستی کی ہے پرواؤں سے مختلف سی ہے۔ کچھ دن پہلے ہمارے ہاں کئی تو سلوی اور وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ پرواؤں سے سلوی سے کہا کہ ”میں مضبوط رشتوں پہ یقین رکھتی ہوں۔ ان کے علاوہ میں عورت مرد کی دوستی پہ یقین نہیں رکھتی۔“

شائد لڑکے لڑکیوں کی فریڈ شپ باتیں ہو رہی تھیں۔ میری مودوں ان دونوں کو ہی محسوس نہیں ہوئی۔ میں چپکے سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس دن سے پروا میرے لیے قاتل احرام ہو گئی ہے بالکل سلوی کی طرح۔ میں دل سے اس کی عزت کرنا ہوں کہ کتنی مضبوط

سوچ ہے اس کی اور تمہاری فریضہ شب جن کے ساتھ
ہے میں ان کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔
مجھے پتا ہے تم مشکل پسند ہو۔ تم نے وہ کبھی بھی
ری اوپن کیے ہیں جن کے حل ہونے کی امید نہیں
تھی۔ تم نے مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالا ہے اور
کامیاب رہے۔ تمہارے پیار ٹنٹ کو اگر تم یہ غریب
تو ٹھیک ہے مگر فیصل! یہاں بات یہ نہیں ہے۔ تم
سمجھ گئے ہو گے۔

بارے سے سوچنا چھوڑ کر سلوی کے پاس اسٹیج پہ چلا
آیا۔

چند ہی لمحوں میں فیصل بھی اس کے پیچھے تھا۔
"تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اپنی نظر اترو لیتا۔
اوجھر کچھ لوگوں کی نظر ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے
بڑے بے ضرر انداز میں پروا کی تعریف کی اور ساتھ ہی
فیصل پر جوت بھی کر گیا۔ وہ اس کی تعریف پر چند ٹانگیں
کے لیے سرخی ہوئی۔

فیصل آگے بڑھے آیا۔ مندی کی ٹھٹھری سے مندی
اٹھارہ سلوی کی ہتھیلی پر رکھی پھر اسے مثالی کھلائی۔
اس کے دائیں جانب بیٹھ گیا۔ اس نے سائین پیکلے ہی
پروا نہیں تھی۔ فوٹویشن ہو رہا تھا ساتھ مولیٰ بن
رہی تھی۔

بابر کی ساری باتوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اس
نے پروا کا خوب اچھی طرح بل بھر میں جاننے لے ڈالا۔
"آرام سے جنت!" بابر نے بھی اس کی اس جگہ
سنبھل لی اور اس کی کھلے عام نظموں کی چوری پکڑ لی۔
"یہ تمہاری کسٹڈی میں آیا ہوا کوئی مجرم نہیں
ہے جو اسے گھور رہے ہو۔"

"تو کیا کروں تمہاری بتاؤ؟" فیصل نے بل بھر میں
اپنے سب ہتھیار پھینک دیے۔
"تم جس طرح اسے دیکھ رہے ہو وہ بہت سے
لوگوں کو باتیں بنانے کا راستہ ہے۔ کچھ اپنی عزت کا
ہی خیال کر لو۔ میں تمہیں اتنے بے اختیار نہیں سمجھتا تم
نے پہلے تو کبھی ایسا نہ کیا۔" بابر کی آواز اتنی آہستہ تھی
کہ صرف فیصل ہی سن رہا تھا۔

"میلے کبھی ایسا ہوا بھی تو نہیں۔" اس کا لہجہ اور
انداز کچھ اور چٹکی کھا رہا تھا۔ اس کے بعد فیصل وہاں
رکنا نہیں۔ بابر ایک جھلے سے بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔

رات قتلہ قتلہ بھگ رہی تھی۔ مندی کی رسم ختم
ہو چکی تھی۔ لڑکیاں بالیاں جاگ رہی تھیں۔ جتن
بابر، فیصل کے ساتھ ان کے کچھ اور کزنز بھی کھلے
آسمان تلے چٹکی چٹکیوں پر بیٹھے تھے۔ اوجھر بہت
روشن سی تھی۔ سلوی نے اچانک پروا سے اپنا کام
سنانے کی فرمائش کر دی۔ اس کی کمزوری بل بل کے
آگے ان سب کا امر ریت گیا۔

"میں اپنے مجموعہ کام سے ایک غزل سنارہی
ہوں۔" فیصل کا روم روم پروا کی طرف متوجہ ہوا۔
راجہ کی نگاہ اچانک فیصل پر پڑی تھی۔ وہ ایک تک
والہ انداز میں پروا کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی دلکش آواز
رات کے سنانے میں ادنیٰ سا تاثر چھوڑ رہی تھی۔
حسد کی ایک تیز لہر نے اسے بل بھر میں شرابور کر
ڈالا تھا۔

تیری شدت مندی سے مجھے خوف آتا ہے
مت ٹوٹ کر چلاؤ مجھے میرے پاگل
بابر نے اس کی وارفتہ کیفیت پر پروا کا شعر سن کر گویا
کوئی نصیحت کرنے کی کوشش کی۔
"دامن بہت کھینچا کچھ مہیاؤں نے میرا
دل مگر آج تک ہوا نہیں کسی پہ ناکل
جو اب!" فیصل نے بھی پروا کا شعر سن کر ایک خوب
صورت سی حقیقت سے روشناس کر لیا۔

"تمہاری شاعر صاحبہ کے دل کا ورق خالی ہے۔ کیا
مجھے کچھ دریافت کرنے کا سرا میرے سر پہ ہو گا۔"
"اگر تم سنجیدہ ہو تو میری نیک تمنا میں تمہارے
ساتھ ہیں۔"
"میں سوئی صد سنجیدہ ہوں۔ لائف سٹار مجھے پروا
جیسا ہی چاہیے۔"
"بس پھر فکر نہ کرو۔" بابر نے شرارت سے اس

کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

پروا سلوی کے کمرے میں سونے کے ارادے سے
جا رہی تھی۔
"ایک منٹ رکیں۔" جانے کہاں سے اچانک
فیصل لغاری اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس اچانک
تسلیم پر پروا ڈر گئی۔
"میں بھی آپ کا فین ہوں۔" آؤگراف تو دے
دیں۔" وہ اپنی شرارتوں کو محسوسیت میں چھپا چکا تھا۔
بابر بھائی، سلوی اور دیگر شوار بھائی سے وہ فیصل
لغاری کی بہت تعریفیں سن چکی تھی۔ مگر اس وقت
ایک بار ع سے پوچھیں آئیں سر سے زیادہ وہ عام سا
نوجوان لگ رہا تھا۔

"مگر اس وقت میرے پاس چپن نہیں ہے اور آپ
کہاں لیں گے آؤگراف؟" پروا کی نظموں سے لگ رہا
تھا وہ بے حد حیران ہے جو رات کے اس پراس سے
آؤگراف کی فرمائش کر رہا ہے۔

"چپن ہے میرے پاس یہ لیں!" اس نے کیا کٹ سے
نکل کر وہ اپنی پانچوں طرف بھاڑا۔
"کہاں یہ ہوں۔ آپ کے اس کچھ سے ہی نہیں۔"
وہ جھٹکا ہٹ کا شکار ہو رہی تھی اور فیصل کو اس وقت
بہت اظہار آیا۔

"میں نے سنا ہے آپ منفوی ہیں کچھ تو میں بھی
کچھ مختلف کرنے کا عادی ہوں یوں کریں یہاں شرٹ
کے کارے۔" آؤگراف دے دیں میں پھر اسے سنبھل کر
دیکھ لوں گا۔" اس نے اوپری دو جین کھول کر کندھے
پروا کی طرف جھکا دیا۔ یہ دیکھ کر پروا سے دراز نہ تھا اور
وہ جھٹکا اس کے کندھے سے نیچے تک چٹکی پاری
تھی۔
فیصل کی اس اطلاع پر جی بی بی کی پروا کے ساتھ
بے حد کے قطرے جھگڑنے لگے۔ راجہ کی اوجھری آ رہی
تھی۔
"کیا ہو رہا ہے پروا؟" راجہ کا لہجہ ہرگز مولیٰ سا

نہیں تھا۔ وہ مسلسل فیصل کو راج کر رہی تھی۔
اسب بھی فیصل کو اس کے پاس کھڑے دیکھ کر راجہ
کو اندر آگ سی سلنے لگی۔ اپنی یہ کیفیت اسے خود بھی
سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
"کچھ خاص نہیں فیصل صاحب آؤگراف مانگ
رہے ہیں۔" پروا کا لہجہ واپس لوٹ گیا۔
"اگر اچھا۔" اس نے اچھا کو جیسے کچل کر ادا کیا۔
فیصل کو اس کی یہ اعلیٰ ذرا بھی اچھی نہیں لگی تھی۔
"لوگ تم کو آؤگراف میں سونے جا رہی ہوں۔
رات ویسے بھی کافی زیادہ ہو گئی ہے۔" راجہ نے اپنے
ظہیر لے کر الفاظ میں چھپانے کی ناکام کوشش کی۔
"اس وقت کوئی بھی آؤگراف نہیں فیصل صاحب!
کل لوگ۔" وہ ان دونوں کو دیکھ رہا تھا پروا کو لگی۔ اس نے
غصے سے اسے بے شکل قابو لیا تھا۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ فیصل لغاری کی نگاہوں کی
چش سے بے خبر رہتی۔ سلوی اور دیگر شوار بھائی سے
وہ اس کی دوستوں کے قصے سن چکی تھی۔ اس کی جانب
فیصل اور پرستاشی سب کچھ ہی تو اس کے سامنے تھا۔
بابر اس کی نگاہیں پروا کو کوئی پراس دیتی محسوس ہو
تھیں۔ لہجہ لہجے دل میں کسی غلط فہمی کو جگہ دیتا نہیں چاہتی
تھی۔ وہ فیصل لغاری کے لیے "صرف ناگہمیں لڑکی"
نہیں بننا چاہتی تھی۔

خاندان اور خاندان سے باہر بہت سے اچھے
گھرانے اسے اپنے گھر کا پائندہ ٹھکانہ چاہ رہے تھے۔ خود
اقراء بھی چاہ رہی تھیں کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر کی ہو
جائے مگر اس نے صاف کہا تھا جب تک میری تعلیم
مکمل نہیں ہوتی میں شادی کا کام بھی نہیں سنا چاہتی۔
اقراء مجبور تھیں کہ نگہ انجربھی اس معاملے میں بیٹی
کے ہم لوگ تھے۔ ورنہ کتنے اچھے اچھے لڑکوں کے رشتے
تھے جن کو صاف انکار کرتے ہوئے انہیں بچ دیکھ ہوا
تھا۔

سلوی تو تیار ہو کر پار سے سیدھی میری ہال چلی

لغلاظ وہ بطور خاص ان کے گھر آیا۔ ہونے والے دلال کی حیثیت سے یہ اس کی پہلی آمد تھی سو اقرار اور انجم کی خوشی دینی تھی۔ انجم اپنے ٹیکٹ میں تھے اقراء نے فن کر کے انہیں بھی گھر بلا لیا۔ وہ اب بچن میں تھیں اس کی خاطر قاصع کا اہتمام کر رہی تھیں۔ جس کے لیے فیصل یہاں آیا تھا وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک گھنٹہ تو اسے بھی یہاں آئے ہو گیا تھا۔

بلآخر اس سے رہائش گیارہویں بیٹھ۔
 ”انکل! پروا انکل! یہ گھر میں آ رہی ہے۔“
 ”بیٹا! وہ ریڈیو اسٹیشن لگی ہوئی ہے رطابہ کے ساتھ۔ مشاعرے کی ریکارڈنگ کے لیے۔“ انہوں نے مختصراً بتایا تو اس کی خوشی یکدم مہلک سی ہو گئی۔ انجم اور اقراء نے کھانا کھائے بغیر اسے اٹھتے نہیں دیا۔ حالانکہ اسے بالکل بھی محوک نہیں تھی۔ مجبوراً ان کی خوشی کے لیے کھانے میں شریک ہوا۔ کھانے کے بعد وہ ان سے اجازت لے کر نکلا تو تب بھی پروا نہیں لیتی تھی۔ اس کے اراکوں پہ اس کی پڑ گئی تھی۔

اسے نئے ہوئے مشکل سے پانچ منٹ سے اوپر ہوئے تھے جب پروا گھر واپس آئی۔ رطابہ اس کے ساتھ تھی۔ پروا کے چپاکی بیٹی بھی دونوں میں خوب ہنسی مچا رہی تھی۔
 ”مما کون آیا تھا؟“ پروا بچن میں پانی پینے کے لیے آئی تو سنک میں گندے برتنوں کا انبار دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔
 ”فیصل آیا تھا ابھی دس منٹ ہوئے واپس گیا ہے۔“

”اوہ اچھا!“ اس نے پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا اور کھونٹ کھونٹ مینے لگی۔ ”تمہارے انتظار میں کافی دیر بیٹھا رہا۔“ مماتے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔
 ”ریکارڈنگ میں ہی کافی دیر لگ گئی، ممانورنہ میں جلدی آجاتی۔“

اس کا سیل بڑی زوردار آواز میں ”تنگنیا۔ وہ ہاتھ دم میں منہ ہاتھ دھو رہی تھی تیزی سے نکلی اور سیل

اٹھایا۔ تب تک فون بند ہو چکا تھا۔ اس نے نمبر دیکھا۔ یکسر اجنبی اور انجمن نمبر تھا۔ اس نے دیکھ کر واپس رکھ دیا۔
 فیصل نے غصے سے سیل فون گاڑی کے ڈیش بورڈ پر پھینکا اور یکدم ہی اسٹیڈ ریسیلویں۔ درشوار سے اس نے پروا کا نمبر لیا تھا۔ لیکن کل آج اس نے پہلی بار کی تھی کہ اسے بتائے گا اپنی آمد اور انتظار کا۔
 گھر آیا تو بار اور درشوار آئے بیٹھے تھے۔

”کہاں گئے تھے آج شام سے نظری نہیں آئے۔“
 باہر نے استفسار کیا۔
 ”میں انجم انکل کی طرف گیا تھا۔“ وہ مختصراً بتا کر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔
 ”اوہ یعنی کوچہ جاہل کا طواف کرے۔“ باہر نے بڑی آہستہ آوازیں کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی فیصل کے لبوں پہ مسکراہٹ آگئی۔
 ”کیسی تھی ہماری بھابھی؟“ درشوار بھی قریب کھسک آئی۔

”وہ تو مشاعرے کی ریکارڈنگ کے لیے ریڈیو اسٹیشن لگی ہوئی تھی۔“ درشوار کے طرزِ خطاب پہ اس کا سارا افسردہ دل بھر میں ہوا ہو گیا۔
 ”دیری میڈیار!“ باہر نے مصنوعی دکھ کا اظہار کیا تو فیصل ہنس پڑا۔

”فکر نہ کرو اب افسوس کی نوبت نہیں آئے گی۔“
 ”یونہی کہہ دیا اور ماحول کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ حنان کی شادی کے ساتھ میری بھی ہو جانی چاہیے۔“ پیلا سے کہوں گا انجم انکل سے بات کر رہا ہے۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ اب تم زیادہ انتظار کرو گے۔“ باہر نے آخری جملہ اس کے کان میں کہا۔
 ”انتظار بڑی بڑی چیز ہے کبھی محبت کی ہوتی ہے۔“
 ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے جملہ ایک پولیس آفیسر کے منہ سے نکلا ہے۔“

”حسن لطیف مجھ میں بھی پائی جاتی ہے۔ بس یہی

میرا اور یہ محترمہ و حزنلے سے یہاں براہِ جان ہو گئی۔“
 ”تو سوار کی موجودگی کے خیال سے وہ آہستہ آہستہ لڑائی لڑا تو بار اسے دیکھ کر رو گیا۔
 ”لوٹ جاؤ اس کے بچے کیا ہے۔“

”لوٹ کر لوٹ کے مجھے لوٹنا کر رکھ دیا۔ سنا تھا کہ لوٹ نہیں ہوں جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔ اپنی اپنی اہمیت کے معاملے میں میں کبھی بھی گولی کھو دوں گا۔ میں کروں گا سمجھ آئی کہ نہیں۔“ فیصل کا لہجہ کد م سنجیدہ ہوا۔ یہاں چپ ہو گیا۔

راجہ کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تو وہ بھی سلوی کی طرح پوچھ کر ہی سے غائب تھی۔ پروا سلوی کو بہت پس کر لیتی تھی۔ ایک ملاپیلے ہی وہ عدین کے پاس کینڈا لگی تھی۔ اب راجہ کی بھی شادی ہو رہی تھی وہ بھی نہیں آ رہا تھا۔ راجہ کا رویہ اگرچہ پہلے کی طرح برسرِ کرم ہو چکی تھی لیکن وہ نہیں تھا کہ اس کے بل بوتہ پر اس کے غلوں میں کی نہیں آتی تھی۔ مماتے اسے دیکھا تھا کہ فیصل کے گھر والے شادی پہ زور دے رہے ہیں۔ وہ منہ پھیر رہی تھی۔

”مماتین بہت بڑی ہوں۔ اسٹڈی“ مشاعروں کی ریکارڈنگ“ مشاعروں میں شرکت اور پھر پڑھائی ختم ہونے تک میں اس موضوع کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی تھی۔ اوپر فیصل تک پروا کا جواب پہنچا تو اسے بہت غصہ آیا۔ مگر مماتے کا کہنا کہ جو سات ملا میں وہ پونہ روشنی سے فری ہو جائے گی تب تب تم خوب دھوم دھام سے اپنے اراکوں کا پس کے ان کی وضاحت سے فیصل کی جھلکی ختم نہیں ہوئی۔ گھر میں حنان کی شادی کی تیاریوں کی وجہ سے چمپل پہل سی گئی۔ اسے وہ یاد آئی تو اس کا تکی چاہتا خود پروا کے پاس جائے اور اس کی بودی سی دلیل کے برتنے اڑا دے۔

گھر دوسرے ہی ماینے کچھ سوچ کر وہ کمزور رہ جاتا۔ یہ نہیں کہیں وہ دل بھانگتی تھی۔ اس وقت کو گستا

جب مشاعرے میں گیا تھا اور وہ محبت کی انجمنی ”ان“ دیکھی اور میں جکڑا گیا تھا۔

حنان کی مندی کے دن اقراء اور پروا شام کو ہی ”رجب منٹل“ آگئی تھیں۔ مندی کی تقریب مشترکہ تھی اس لیے مہمان بہت زیادہ تھے۔ فیصل اور حنان کی کزنز کابول میں لگی ہوئی تھیں۔ کیونکہ قریب کا اہتمام گھر کے وسیع عریض لان میں کیا گیا تھا۔ لٹنگ اور فوڈل ڈیکوریشن مکمل تھی۔ اسٹیج مندی کی رسم کے لحاظ سے سجایا گیا تھا۔ پروا نے مدد کے لیے اپنی خدمات پیش کیں مگر درشوار نے اسے جس کر ایک سائیڈ پر بٹھادیا۔ ویسے بھی انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ فیصل، حنان اور دیگر مردوں کے ساتھ انتظامات کا جائزہ لے رہا تھا۔ قاصع ہونے کے بعد فیصل نے حنان کو تیار ہونے کو کہہ مندی کے لیے لوگوں نے سفید کلف لگے کرتے شلوار بنوائے تھے۔ اب حنان وہ بتوں کے ساتھ تھا۔ فیصل بھی بیچ کر چکا تھا۔ ٹی وی لائن سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ اقراء آئی۔ پڑی تھی اس نے پاس آ کر خیریت پوچھ کر دیا۔ انہوں نے اسے دعا میں دیں۔

اب فیصل کی نگاہ پروا کو تلاش کر رہی تھی۔ بالآخر اس کا گھر مقصود نظر آئی گیا۔ وہ درشوار کے ساتھ پھولوں کے گجرے بیٹھ کر رہی تھی۔ ساتھ اور لڑکیں بھی تھیں۔ کافی عرصے کے بعد فیصل نے اسے دیکھا تھا مگر بات کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اور کدوب موجود تھے۔

”ارے فیصل بھائی! آپ تو عید کا چاند بن گئے ہیں کتنے عرصے کے بعد آپ کو دیکھ رہی ہوں۔“ اس کی خالہ کی بڑی بیوی نے اسے کھڑے دیکھ کر رشک کر ڈالا۔

تب اس نے آگے بڑھ کر حال احوال پوچھا۔
 ”میری جالب ہی ایسی ہے کہ اپنے لیے بھی فرصت نہیں ملتی۔“ اس نے وضاحت سے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔ پروا ایک ٹائیس کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

ان کی بات سچ ثابت کر دی تھی۔ پروا کی شاعری نے
نوجوانوں کے ساتھ ساتھ ادب کے نقادوں کو بھی ہلکا
دیا تھا۔ انہی کے مشورے سے پروا نے دوسرے مجموعہ
کلام کو کتابی شکل میں لانے کا حکم شروع کر رکھا تھا۔

ان دنوں وہ بہت مصروف تھی۔ یونیورسٹی سے
فارغ ہونے کے بعد عرفان بادل نیازی کی طرف چلی
جاتی۔ وہ ”نیا سویرا“ کے آفس میں ہی عام طور پر پائے
جاتے۔ ان کی حسن پرستی کی داستانیں عام تھیں لیکن
پروا نے اس سلسلے میں بڑا سخت اصول رکھا ہوا تھا۔ اس
کے ارد گرد دفاعی حصار بڑا مضبوط تھا۔ عرفان بادل
نیازی کو حال بدل کرنے کی جرات ہی نہیں ہوئی۔

عمر عزیز کی پینتالیس بھاریں دیکھ لینے کے باوجود
تاحال کنوارے تھے۔ ادبی میدان میں نووارد لکھاریوں
کی سرپرستی کرنے میں انہوں نے کبھی جھک سے شکم
نہیں لیا تھا۔ ان کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی وجہ
سے ہی آج بہت سے کم نام شاعر اور ادیب ادبی میدان
کے روشن ستارہ بن کر چمک رہے تھے۔

ایک طرف سے عرفان بادل نیازی اس کے گلاؤں
پر ہی تھے کہ دوسری طرف انہوں نے انہوں نے
ہی گروا لیا تھا۔ پروا کا تھیں بھی انہوں نے ہی ”اوزگل“
تجویز کیا تھا جواب اس کے پیدا ہونے کا حصہ بن چکا
تھا۔ ”اوزگل“ کا مطلب تھا نہایت خوب صورت اور
حسین۔

ادبی حلقوں میں عرفان بادل نیازی کی شہرت کچھ بھی
راہی ہو مگر پروا کے لیے وہ بہت قابل احترام تھے۔ اس
کی خوب صورتی اور رکھ رکھاؤ نے عرفان بادل نیازی کو
شروع میں چونکا لیا۔ ضرور تھا مگر بعد ازاں پروا کا رویہ دیکھ
کر وہ اپنے خل میں سمٹ گئے تھے۔ وہ گرتے بیٹھتے وہ
ایک نئے لڑکی زندہ رہتے تھے۔

پروا یہ وہ خالص مہمان تھے اور دل سے اس کی
عزت بھی کرتے تھے۔ سو وہ ابھی تک کسی بھی
ناخوشگوار صورت حال سے بچی ہوئی تھی۔
مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن سے پروا کی پزیرائی
بہشم نہیں ہو رہی تھی۔ ان ہی کی زبانوں کا گلا پروا پر

دب کی مسلسل ناشکری پہ تلی ہوئی تھی اور اسے اس
کا احساس تک نہ تھا۔

”کناہیں سمیٹ کر پروا ابھی ابھی سوئے کے لیے
ورال ہوئی تھی کہ اچانک اس کا سیل فون گنگناٹے لگا۔
فصل لاکنگ کے الفاظ جھگڑا رہے تھے۔

بڑی بیاری مسکن نے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔
”اسلام علیکم۔“ اس کی دیکھ کر وہ حیران و حیرت کی
انتہوں کی کیفیت اور بیخبری ختم کر گئی تھی جو پروا کی
مصروفیت اور سیل آف ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی
تھی۔

”وعلیکم السلام کہاں تم ہو پروا صاحبہ! لگتا ہے کہ
مجھے آپ کو لاک ٹپ میں بند کرنا پڑے گا۔“ فیصل کی
سہ قراری الفاظ اور سنیے سے عیاں تھی۔
”میں تو کہیں بھی کم نہیں ہوتی اور میں نے کون سا
ایسا جرم کر دیا ہے جو آپ مجھے لاک ٹپ کی دھمکی دے
سکتے ہیں۔“

”سارے جرم کن کن کر بیوی کا“ صرف آپ
کے اکتانیت سے فارغ ہونے کا نظارہ تھی اہل توبہ
نالیہ کہ لبریکل آف تھا آپ کا؟“
”میں پچھلے دنوں بہت مصروف تھی۔ اس
مصروفیت میں سیل فون کو چارج کرنا یاد ہی نہیں رہا اس
لیے فون آف تھا میرا۔“

”بہر حال آئندہ خیال رکھنا ہے۔ مجھ سے دور ہیں
آپ تو رابطے تو نہ توڑے۔ کچھ باتیں خود سے سمجھتی
ہوئی ہیں۔“ فیصل کے کلمے میں بہت نرمی تھی۔
”اوسے آئندہ خیال رکھوں گی۔“ کمد کر پروا نے
فون بند کر دیا۔

نہ تو ابھی فیصل کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔
اگلی ہفتہ کی کہاں آنے والی تھی۔ کمرے کی تہنائیں
لاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھیں اور دل تھا کہ پروا کو طلب
کرے جا رہا تھا۔ جذبات کی آغوش شاید اس تک نہیں پہنچی
کی تہی ہو تو انجیل بنی ہوئی تھی۔

لیکن اتنا ضرور ہوا تھا پہلے کی طرح اس کے انداز
میں بے گانگی نہیں تھی وہ اس کی چاہت سے آگاہ
تھی۔

فیصل کے پکوں پر بہت سے خوب صورت خواب
سجھتے تھے۔

آخری پیر دے کر گھر آئی تو تراب لگاری اور نیلم
آہنی آئے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے بڑے ٹیبل پہ
مٹھائی کے ٹوکے رکھے تھے۔ پروا کپڑے بدل کر ان
کی طرف چلی آئی۔ نیلم نے صوفے پر اسے پاس ہی
بٹھالیا۔

”کیسے ہوئے پیچڑ تمہارے؟“ سلام دعا اور خیر
خیریت پوچھنے کے بعد انہوں نے پیچڑ کی بابت پوچھا۔
”بہت اچھے ہوئے ہیں عیشہ کی طرح مجھے امید ہے
اوجھار کس لوں گی۔“

ان شاء اللہ اور رزلٹ تو تمہاں سسرال میں آکر ہی
سنو کی۔“ نیلم نے اسے چھیڑا اور ان کے چہرے کے
بعد ہانپے اسے بتایا کہ وہ کس مقدمے میں تھی۔
پروا کی شادی، ڈاکٹر انجم کے بڑے بھائی ریاض احمد
بھی اپنی پوری فیملی سمیت انگلینڈ سے آرہے تھے۔
اب اتنے عرصے بعد وہ آرہے تھے تو سب بہت خوش
تھے۔

پروا کی شادی سے ہفتہ پہلے ریاض احمد اپنے بھائی
ڈاکٹر انجم کے پاس تھے۔ اقراء اور پروا نے پہلے ہی لوہر کا
پوشن ان کے لیے سیٹ کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کا
بیٹا بیو اور دو پوتے بھتیجے بھی تھے۔ بیوی ان کی سات
سال پہلے فوت ہو چکی تھی۔ اب پوتے اور پوتی سے
دل بہلاتے تھے۔ ان کے آنے کے بعد گھر کی رونق
بڑھ گئی تھی۔

پرسوں پروا کی رخصتی تھی۔ اس رات کے بعد اس
گھر میں ایک اور رات باقی تھی۔ پھر اسے یہاں سے
چلے جانا تھا۔ اس کی ماما کچھ دیر پہلے اس کے پاس سے

انہ کر رہی تھیں۔

انہ صاحب نے انہیں زبردستی یہاں سے اٹھا کر سوئے لیجا تھا کیونکہ اقراء کی طبیعت رونے سے خراب ہو رہی تھی۔

ان کے جانے کے بعد فیصل کی کال آئی۔ پرواکا دل ابھی بھی بھرا ہوا تھا۔ اس کی آواز سن کر اور بھی رونا آ گیا۔

اس کی ہیکل ہیکل آواز فیصل نے فوراً محسوس کرنی تھی۔ مگر جانتے ہوئے نظر انداز کر گیا۔

”کل آپ نے پوری کالیں اور باتوں کے ساتھ ساتھ ٹائمیں یہ بھی مندی لگوانی ہے جنہوں سے اوپر تک۔ مجھے اٹھانے کا اگر آپ نے میری یہ چھٹی سی خواہش پوری کی تو...؟ پروانے آہستہ سے جی کہہ کر فون بند کر دیا۔

پروانے شادی پر اپنی فرینڈز، منیجرز کے ساتھ خاتون اور موٹا عیال کو بھی مدعو کیا تھا۔ ان میں عرفان ہائل نیازی بھی تھے۔ جنہوں نے پروا کو شادی کے وقت کی صورت میں اس کا دسرا جمعہ کا مہوایا۔ جس کا عنوان ”تم سے“ تھا۔ اور یہ بین پروا کی شادی کے روز منظر عام پر آیا تھا۔ اسے اس کی خوشی بھی بہت تھی مگر بپ سے بچھڑنے کا وہ اسی خوشی پر غلب تھا۔

رخصتی کے وقت وہ اتنا پھوٹ پھوٹ کر رہی کہ نیلم اور تراب لغاری کے ساتھ ساتھ اور لوگ بھی پریشان ہو گئے۔

رخصت ہو کر پروا تراب منزل پہنچ گئی۔

رسول کے لیے عورتوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ فیصل نے تو جین چھڑائی تھی اسے رسوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مشکل سے پروا کے ساتھ پانچ منٹ بیٹھا تھا اور دو گن کو مٹانی کھانے کے بعد معذرت کر کے دوستوں کی طرف چلا گیا تھا۔ راہیہ اس دوران ان کے قریب ہی موجود رہی تھی۔ پروا کے یوں رونے سے کچھ دنوں میں جو سوالات پیدا ہوئے تھے۔ ان سوالوں نے

راہیہ کو قدرے شانت کر دیا تھا۔ ابھی فیصل تھوڑی دیر بعد ہی پروا کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا تو اس کی اس حرکت نے راہیہ کے پورے وجود میں سکون کی لہریں دوڑا دی تھیں۔

حنان اور یار نے دن دن لگا کر فیصل کا بیڈ روم ڈیکورٹ کر دیا تھا اور کل سے لاک کر کے چابی اپنے پاس رکھی تھی۔ حنان نوکسن کی آمد کے بعد ہی بیڈ روم کھولنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں ایسی کون سی خاص بات تھی جو وہ بھاریا تھا۔

فیصل کی کزنز پروا کو لے کر کمرے تک لائیں۔ تب یار اور حنان نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ پانی سب پیچھے ہٹ گئے کہ سلام دو۔ وہ سن ہی اندر رکھے۔

اور پروا جیسے ہی دروازے سے اندر ہوئی بھت کی طرف سے اس پر پھولوں کی برسات شروع ہو گئی ساتھ ہی دیکھ دیکھ کر ہر آواز بھی کوٹھنے لگی۔

بیڈ روم اتنی خوب صورتی سے سجایا تھا کہ سب نے ہی تعریف کی۔ راہیہ اور حنان سے لڑنے لگی۔

”اینا بیڈ روم تو تم نے اتنی خوب صورتی سے ڈیکورٹ نہیں کر دیا تھا۔“ یہ لڑنے کا موقع نہیں تھا سو حنان خاموش ہو گیا۔ ویسے ہی راہیہ کے رویے میں کچھ عرصے سے تبدیلی سی آئی تھی یوں لگتا تھا وہ لڑنے کے بجائے ڈھونڈتی ہے۔ مگر حنان صلیع جو قسم کا بندہ تھا۔ چپ ہو جاتا۔

بیڈ کراؤن کے ساتھ رکھا دو سرا گچہ بکریہ اٹھا کر فیصل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ بیڈ روم میں آتے ساتھ ہی اس نے بڑی جاندار آواز میں سلام کیا تھا۔ اس گواڑ میں خوشی کی ایک محسوس کی جا سکتی تھی۔

”دیکھنے کی اجازت ہے مجھے؟“ وہ پروا کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے بولا اور پھر دوسری طرف سے کوئی جواب ملنے سے پہلے ہی آچل اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ پروا کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ فیصل نے بڑے غور سے اس کی پلکوں کا لرزنا رقص دیکھا۔ اس

کی تمام درجنوں ستواں تاک، جھکی آنکھیں اور اصرار لب، ایک ایک نقش اس نے غور سے دیکھا پروا کے دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے۔ فیصل کا منہ دھاتہ اس کی نازک کلائی کی طرف بڑھا تو دل میں جھپ سی پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ دھڑکنوں کی رفتار خود ہی بڑھ گئی پروا کا ہاتھ باقاعدہ کانپ رہا تھا۔

”مندی کی بہت خوب صورت لگائی ہے کہاں تک ہے؟“ وہ اس کی بوٹیوں سے جھکی کلائی کو قریب کر کے غور سے دیکھنے لگا۔ جہاں تک چوٹی کے بازو تھے وہاں تک تو مندی لگی نظر آ رہی تھی۔

”کنج کے دن کی آس میں بہت انتظار کروایا ہے۔“ پروا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔

”کچھ تو کہو۔ آج کل دن ہماری زندگی کا سب سے اہم دن ہے میں تمہارے لبوں سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔“ فیصل کی انگلیاں پروا کے شیم وایوں کو ایک ٹانفے کے لیے چھوئی تھیں۔

”بولو نا کچھ تو پلیز۔“ شامروہ الفاظ سے کھینچی ہوئی آواز اتنی جھنجھکیاں بھری تھی۔

پروا کے لب کچھ کہنے کی کوشش میں جیسے پھڑ فیصل کی پُرجوش وارفتہ نگاہیں آج دہائی محسوس ہو رہی تھیں۔ پروا سے بولا ہی نہیں گیا۔ مشاعروں میں شرکت کرنے والی سیکڑوں مداحوں کے سامنے اپنا کلام پیش کرنے والی براہ کھو سی پروا اس وقت اس کے سامنے نروس ہو رہی تھی۔

فیصل کو ایک دم ہی اس پر رحم سا آیا۔ اس نے سہیل ٹیلر کی دراز سے رونمائی کا ٹیٹ نکالا۔ جو سونے کی نازک اور خوب صورت پانکوں پر مشتمل تھا۔ ”یہ ان خوب صورت پانکوں کے لیے ہے۔“ جھکے جھکے ہی اس نے لٹاؤی پن سے پروا کو انکس پر سنا میں۔ ”کئی لوگو سوئیٹ ہارٹ“ پروا کا ہاتھ اس کے لبوں پر دھرا تھا اور وہ بہت لمبہ سرکش ہوتا جا رہا تھا۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے سو جاؤں لیکن پہلے یہ کہنے

چنچ کر رہی گی۔“ بھاری ہنسنے ہوئے بیڈ سے اٹھتی گئی تھی کہ فیصل کے مغبوط بازوؤں نے اسے جکڑ لیا۔

”کون سی نیند کہاں کی نیند۔ کب سے میری نیندوں کی دشمن بنی ہوئی تھی میں سوئے دوں گا بھلا۔“ فیصل گستاخوں پہ آگاہ تھا۔ پروا کی تو سانس ہی گویا سینے میں ایک گئی تھی۔ اچانک اسے اپنی گردن کے پاس انگارہ سا دھککا محسوس ہوا۔

یہ پچھرا سرکش سمندر اسے بھی اپنے ساتھ بٹاتا چلا گیا۔

ولبر کے بعد فیصل اور پروا دونوں ڈاکٹر انجم کی طرف آئے ہوئے تھے۔

اقراء کتنی دیر پروا کو لپٹائے اس کے ہونے کا یقین کرتی رہیں۔ یہ پروا اس لڑکی سے بیکرا جیسی لگ رہی تھی جو اپنی رخصتی کے دن دھواں دھار رو رہی تھی۔ فیصل کی بھرپور محبت کے شمار سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

رات ان دونوں کو وہیں رکنا تھا۔ فیصل کافی دیر ڈاکٹر انجم اور اقراء سے باتیں کرتا رہا راض احمد بھی نہیں تھے البتہ بولور بٹاوا واپس انگینڈ جا چکے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ شریک تھک گئے تھے۔

فیصل کے سونے کا انتظام پروا کے بیڈ روم میں تھا۔ اس نے بڑی دلچسپی سے اسے ایک ایک چیز دکھائی۔ اسکول کالج کے زمانے کی تصویریں، بچپن کے سنبھل کر رکھے گئے کھلونے اسکول کالج کی طرف سے ملے گئے۔ لینڈ اسکیپ سب چیزیں بہت شوق سے دکھائیں۔ بچوں جیسی مصوویت تھی اس سے اس کے چہرے پر فیصل وقتاً فوقتاً اس کے ہاتھ کو پھیرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ہر بار وہ پیچھے ہوجاتی۔

”پرری! واقعی تم مشرقی لڑکی ہو۔ میرے پیار کی نشانیوں کو کہاں تک چھپاؤ گی بولو جواب دو۔ تم کیوں

گھبرا جاتی ہو میرے پیار کی شدت سے۔ میں تم سے ایسے ہی ٹوٹ کر رہا کروں گے۔ دونوں میں ہی تم نے مجھے اپنا اسیر کر لیا ہے۔ بہت بے بس ہو گیا ہوں۔ اب تو زندگی تمہارے بغیر بے معنی بننے لگی ہے۔ میں نے گھومنے پھرنے کے لیے پورے شیش کی سیٹ بک کر والی ہے۔ اسی بھٹے ہم جاؤں گے۔ میں چند دن سب سے دور اور تم سے قریب ہو کر گزارنا چاہتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور ہمارے درمیان ہو۔ صرف میں اور تم ہوں۔ اور کوئی نہیں۔

”تو کیا یہ کرتے ہیں آپ مجھ سے؟“

”تمہاری سوچ سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں اتنا کہ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔“ فیصل کا لفظ لفظ سچائی میں ڈوبا ہوا تھا۔

پروا اپنے دوائے کو دیکھتی رہ گئی۔

مورٹیسس میں ایک ملا گزار کر لوٹنے کے بعد وہ اپنی بیوی جو ان کے چکا تھا۔ پروا بھی گھر اور کینوں میں مکن تھی۔ تراب اگل، نیلم آگنی، حنا بھائی، ڈور، سوار سب کا وہ بہت اچھا تھا۔ بس راجہ کی طرف سے وہ اکثر اٹھ جاتی۔ اکثر شیش و طنز کرتی جاتی۔ جیتے ہوئے پہلے پوتی۔ جن کی توجہ پروا کے پاس نہیں تھی۔

ایک ماہ پاکستان سے باہر رہنے کے دوران واپسی پر پروا کے پاس مشاعروں کے بہت سے دعوت نامے جمع ہو چکے تھے۔ وہ ممبایا سے ملنے کی توجہ چلا کر کہ ایک ٹی وی پروڈیوسر نے بھی اس کی غیر موجودگی میں رابطہ کیا تھا۔ نئی نسل کے نمائندہ خواتین شعراء کے بارے میں وہ ایک پروگرام کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ پروا کو بھی اپنے پروگرام میں مدعو کرنا چاہ رہے تھے۔ اس کے علاوہ راولپنڈی آرٹس کونسل میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اس میں خاص طور پر پروا کو گل کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ نئی نسل میں اس کی مقبولیت کا گراف ”تم سے“ کی اشاعت کے بعد تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ عرفان ہلال نیازی نے اس سے کہا تھا کہ اپنی دنیا بہت بڑے سمندر کی مانند ہے اگر تم نے اپنی منفرد شناخت پر قیام رکھی ہے اور زیادہ عرصے تک۔ اپنی

دنیا میں زندہ رہتا ہے تو روایات کی پیروی مت کرو۔ باغیانہ روش اپناؤ۔ لوگوں کے دلوں میں گھر کرو۔ پروا نے ان کی نصیحت کو دل و جان سے مان لیا تھا۔ یہی وجہ تھی اس کا دوسرا مجموعہ کلام نئی روایات اور نئے رجحانات کا عکاس تھا۔

اقوام یکدم کو لگ رہا تھا جیسے پروا ان سے صبر پل بعد ملی ہے حالانکہ صرف ایک ماہ کی ہی تو دوری تھی لیکن ان کی پیاسی ممتا کو اسے دیکھ کر سیراب ہو رہی تھی۔ پروا کی شادی کے بعد انہیں اپنی تمناؤں کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔

رات کھانے کے بعد وہ بڑے سکون سے ماما کے پاس لیٹی باتیں کر رہی تھی جب فیصل نے اس کے موبائل پر کل کر کے بتایا کہ وہ اسے لینے آیا ہے۔ پروا نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ماما کچھ دیر قبل چمکتا چوہا تاریک سا ہو گیا ہے۔ اگرچہ بہت جلدی انہوں نے خود کو سنبھال لیا مگر پروا نے جیسے ان کا دکھ بھارت پ لیا تھا۔

وہ دوبارہ اسے فون کر کے منع کرنا چاہتی تھی کہ اسے نہ لینے آئے۔ میکے میں رسک کی گھر اقوام نے نری سے منع کر دیا۔

”اب تم اس گھر کی ہو تمہاری عزت، مہارت، نام سب تمہارے شوہر کے دم سے ہے۔ اس کے گھر سے ہے۔ تم قدر کرو اس کی اور رات رات کے کاراؤ ہو تو پھر آجائے۔“

پروا انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا کہ کچھ دن ممبایا کے پاس رہے اور جی بھر کر نیندیں پوری کرے کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہ ہو۔ جی کہ فیصل بھی نہیں۔ وہ تو شادی کے بعد بے فکری والی نیند کو ترس گئی تھی۔

پروا واپسی پر چپ چاپ سی تھی۔

”میرا بہت دل تھا ماما کے پاس رکنے کو مگر آپ لینے آئے تو مجھے اتنا پرانا شادی کے بعد میں صرف ایک

رات اپنے ممبایا کے پاس رہی ہوں۔“ پروا کے لہجے میں غم کی سی تھی۔

”تم رات ممبایا کے پاس رات جاتی تو میں ساری رات نہ سو سکتا۔ تم میری زندگی کا حصہ بن گئی ہو میں نہیں رہ سکتا اور تم سے ایک رات بھی اور آئندہ ضد نہ کرنا۔“ اس کے انداز میں قطعیت تھی پروا اسے دلچسپ کر رہی تھی۔

گھر واپسی پر پروا انہیں آگنی کے پاس بیٹھ گئی وہ ماما کی طبیعت کا پوچھ رہی تھیں۔ جن کی طبیعت ان دنوں مسلسل خراب چل رہی تھی۔

”اکٹوئی اولاد ہونا تو تمہارا فرض بنتا ہے ان کی دیکھ بہل کرنا۔“ ان کی بات پر پروا نے سر جھکا لیا۔

ٹی وی لائونج سے گزرتے فیصل پر اس نے خفا خفا نظر ڈالی تھی۔

وہ فٹیش ہو کر چہنچ کر چکا تھا۔ بلیک کمر کی فی شرٹ اور ٹراؤز میں اس کا دراز قد کتنی سراپا بڑا نمایاں تھا۔ وہ اس کے پروا کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ نا محسوس انداز میں تھوڑا پرے ہو گئی۔ اقراء کے بارے میں کافی دیر بات ہوئی رہی۔ پھر نیم سونے چلی گئیں۔ فیصل بھی اٹھ گیا۔ پروا بے مقصد باہر لان کے چکر کاٹی رہی اور کافی دیر بعد بیڈ روم میں آئی۔ وہ میکے کے سارے نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ پروا نے اس کے پاس پڑا دوسرا کتیا اٹھایا اور قدرے سلیڈ پر رکھ کر لٹ گئی۔

”پری! کیا بات ہے؟“ خفا ہو واپس آنے کے بعد ایک بار بھی مجھ سے بات نہیں کی ہے۔“ وہ اس پر جبک آیا۔

”مجھے نیند آ رہی ہے۔“ وہ اس کے بازو ہٹا کر دوبارہ پہلے والی پوزیشن پر لیٹ گئی۔

”کل مجھے ایک بچے کے بعد آفس جانا ہے۔“

”تو میں کیا کروں ایک بچے کے بعد جانا ہے تو۔“

”چہ تو نہیں اچھی طرح ہے پری!“

”پلیز مجھے سونے دیں اور پلیز لائٹ آف کرویں۔“

اس نے بے رخی سے کہتے ہوئے گروت ہڈی۔

”اوکے سو جاؤ ڈونٹ وری۔“ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گا۔“ فیصل آج لائٹ آف کر کے ٹی وی بھی بند کر دیا۔

نیند پروا کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی طرف سے رخ موڑے موڑے کتنے ہی آنسو بہے تو اس طریقے سے ٹپکوں کا بند توڑ کر ٹپکے میں جذب ہوئے تھے۔ کافی دیر گزر چکی تھی۔ اس نے اندر صبرے میں ہی ہاتھ بڑھا کر ٹیکل پر برا مینا مل اٹھا کر ٹیکم دیکھا۔ ٹین بجتے والے تھے۔ فیصل کی اس کی طرف پیٹھ تھی اور وہ سو رہا تھا۔ وہ بیڈ سے اتری اور چیمز کھینچ کر ٹیکل کی طرف چلی گئی۔ ٹیکل لیپ کی روشنی پڑی۔ جیسی اور رومان پوری تھی۔

اس نے سائیڈ ٹیکل سے اپنی ڈائری اور بین اٹھایا۔ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر لکھنا شروع کر دیا۔ اس عمل کے بعد وہ شانت تھی۔ لکھنے کے بعد اس نے لائٹ بند کر دی اور پہلے کی طرح اپنی جگہ پر آکر لیٹ گئی۔ نیند نے جلد ہی اپنی آغوش میں پروا کو کر کے سینے سے لگا لیا۔

پروا اٹھ رہی تھی کہ وہ سو رہا ہے۔

پروا تو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو رہا تھا۔ اس کے سونے کے بعد فیصل نے اس کی ڈائری اٹھائی درمیان میں جین پڑا تھا۔ اس نے کھولی۔ بہت ہی خوب صورت پیڈر رائٹنگ میں وہ لکھتے لکھتے چھوڑ گئی تھی۔

سب سے اوپر عنوان لکھا تھا سوالیہ نشان۔ وہ عنوان کے نیچے کبھی مٹی قلم پر جھٹکا چار سو رات کا سناٹا چلایا ہوا ہے کچھ موسم سرد ہے اور فریال بھی گرم گرم سی ٹپکے رہ کاٹی تن من کو جھلساتی تیری آنکھیں تیری باتیں رہ رہ کر میرے من سے ابھرتی ہیں میری سوچوں سے لڑتی ہیں تیرے پیار کی باتوں میں

تیرے پیار کی باتوں میں
پھر بھی جانے کیوں
کیوں مجھے قرار نہیں

اس نے اُسکی سے ڈائری بند کر دی۔ مڑ کر نحو
خواب پروا کی طرف دیکھا اور بجائے سونے کے بیڈروم
کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہ باہر سے اپنی ہر بات
شیر کر آتا تھا اس وقت اس کے دل پہ بے تحاشا بوجھ تھا
مگر یہ بات وہ اس سے بھی چھپانا چاہتا تھا۔ رات کے
آخری پر وہ سویا مگر اپنے بیڈروم میں نہیں بلکہ لی وی
لاؤن میں۔

پروا کیلے لیل سلجھاری تھی۔ فیصل آج گھر پہ ہی تھا۔

دوسرے کے بعد ہی اسے ڈیوٹی پہ جانا تھا۔ اب وہ
کپڑوں کی ہم رنگ چوڑیاں پہن رہی تھی جبکہ اندر
آیا۔

”پروا! اپنے کپڑے اور ضروری چیزیں رکھ لو میں
جالتے ہوئے تمہیں انفل کی طرف ڈراپ کر جاؤں گا۔
کچھ دن رہ آؤ۔ ویسے بھی آئی تمہیں رست میں کرتی
ہیں۔“ وہ دروازہ دھب سے کپڑے نکال کر ہاتھ دھو کر
بند ہو گیا۔

مارے خوشی کے وہ اسی وقت اپنے کپڑے رکھتے
گئی۔ اس کے لیے یہ تصویریں چل فرما تھا کہ وہ مہما کی
طرف رہنے جا رہی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے
طویل قید کے بعد رہائی کا پروانہ بتایا گیا ہے۔

پروا سب سے پہلے ماما کو فون کر کے اپنے آنے کے
بارے میں بتانے لگی۔

”ماما جانی میں تو ترس گئی ہوں اپنے کمرے کے لیے۔
اب تو یاد بھی نہیں ہے کہ میں آخری بار کب وہاں
سوئی تھی۔ خوب ڈیجر ساری باتیں کروں گی اور پھر
رات کو لکھوں گی۔“ وہ بولتی چلی گئی۔ فیصل نما کر باہر آ
گیا تھا اور اس کی تمام باتیں بھی سن چکا تھا۔ اسے کچھ
دن پہلے کی بات یاد آئی۔

وہ اور پروا اکٹھے لیٹے ہوئے تھے۔ روزانہ کی طرح
پروا کا سر اس کے بائیں بازو کے اوپر تھا۔ وہ باتیں کر رہا
تھا مگر پروا کا دھیان نہیں اور تھا وہ گستاخیوں پہ اترا تو پروا
نے اسے جھجھکا ہوا۔

”فیصل! تمہیں نہیں مجھے کھانا ہے اگر نہ لکھا تو
بھول جائے گا۔“ وہ اس کی پر جوش قربت کا حصار توڑ کر
اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

اس وقت فیصل نے اس بات کو اہمیت ہی نہیں دی
تھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا تھا۔

”پری! میرے پاس بیٹھ کر لکھو ٹائیچی میں ڈسٹرب
نہیں کروں گا۔“ اس وقت وہ شرافت کے جاے میں
تھا لہذا وہ ان کی تھی۔

ڈائری اور پین اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے
فیصل کے کندھے سے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ فیصل کا
ایک بازو اس کے گرد جمنا ل تھا۔ دنیا جہاں سے بے خبر
یہ تو کوئی اور ہی پروا تھی۔ اس کی فیسول خیر قربت سے
بے نیاز، لکھنے میں مگن چچ میں لپٹی بارہ شرارتوں پہ اترا
مگر اس پہ اثر نہیں ہوا۔ تنک آکر وہ اس سے دور ہٹ
گیا۔ جبکہ لکھ کر فارغ ہوئی تب تنک دھب سے نکلا۔
فیصل نے بھی اس پر غماز نہیں دے لیا۔ وہ لگا لگا اس
کی ساری باتیں سن چکا ہے۔

”میں گاڑی نکالتا ہوں“ کہا۔ ”ہاں میں برش
پھیر کر وہاں آئی۔“

پروا ہنسم آئی اور راجیل سے مل کر گاڑی میں بیٹھ
گئی۔

اس کی غیر معمولی خوشی ان دونوں نے بھی محسوس
کی تھی۔

پروا کو گیٹ پہ اتار کر وہ گاڑی والیں موڑ رہا تھا۔
جبکہ خیر خیر قدموں سے چلتی اس کے پاس آئی۔
”آپ اندر نہیں آئیں گے؟“ وہ ٹپٹے جیسے بازو
رکھ کر اس کی طرف جھک کر بولی پروا نے میوٹن کھر کا
بست خوب صورت سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے گلے پہ

سوٹ کے ہم رنگ بڑے پیارے بن بن لگے تھے۔ اس
نے ایک دم نگاہ جالی۔
”تمہیں نہیں لپٹ ہو رہا ہوں پھر کبھی سی۔“
”سب رات کو آئیں گے تو نہیں نا؟“ وہ تصدیق
یاد رہی تھی۔

”نہیں۔ میں نہیں آؤں گا۔ تم آرام سے آئی کے
پاس رہو۔ جب آنے کا موڑ ہوا مجھے فون کرونا۔“ وہ
اندرونی کش کش پہ قابو کر رکھا مگر نارل انداز میں بولا۔
”وہ تھک چکا ہو گا۔ پو آ کر نہ۔“ وہ خوشی کے
مارے بے قابو ہو رہی تھی۔ اس نے نکلتا تے ہوئے
دور تک بجاتی تھی۔

”یہ شاعر نے اوسب“ یہ لکھاری کتنے دوغلے ہوتے
ہیں۔ اور سے کچھ ہمدرد سے کچھ مہمان کو پیار
و محبت! امن کا درس دینے والے اور خود اندر سے
ٹازک جذبات کی قدر نہ کرنے والے۔ پروا اپنی نسل کی
نما سادہ شاعر ہے جس کے بارے میں سب کہتے ہیں
کہ جو لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے وہ قلم سے بیان
کر دیتی ہے۔ خود کو محبت کا شیر کشتی سے اور اندر سے
اسے اپنے سب سے قریبی رشتے کے جذبات کا
احساس تنگ نہیں ہے۔ لوگ اسے حساسیت کی بولی
کہتے ہیں اور یہ حساس لوگ خود سے وابستہ لوگوں کے
بارے میں اتنے بے رحم کیوں ہو جاتے ہیں۔ کاش ایہ
لوگ جو کچھ لکھتے ہیں خود بھی اس کا پاس اور خیال کر لیا
کر سیں۔“

آج کل خچنے تھکے ان ہی خیالات میں گھرا رہا۔

رات سونے سے پہلے تنک بھی پروا کو تھیں نہیں تھا
کہ وہ اسے لینے نہیں آئے گا۔ رات قلم و قلمو گزرتی
چلی گئی۔ اور یہ شادی کے بعد پہلی رات تھی جو اس
نے فیصل سے دور ہو کر گزار دی تھی۔ صبح دیر تک وہ
سوئی رہی۔ اترانے بھی نہیں اٹھایا۔ دس بجے کے
قریب وہ خود ہی اٹھی تو اس نے اپنے ہاتھوں سے پروا
کے لیے ناشتا بنایا۔ سرویوں میں وہ انڈا پڑا تھا بڑی

رغبت سے کھا رہی تھی۔ سو سو سم کی مناسبت سے اس
کی پسند کا ناشتا تھا۔ اس نے بڑے شوق سے پورا پورا
ختم کیا۔ دوسرے کھانے میں کاجر کا حلوہ بطور خاص
اقرانے اس کے لیے بنایا۔ آج ڈاکٹر انجم بھی جلدی
لوٹ آئے۔

پروا کے لیے تو یہ دن بڑی خوشی کا تھا۔ فیصل آج
بھی نہیں آیا تھا۔ سو وہ بہت زیادہ خوش تھی۔ شادی
سے پہلے والی زندگی جیسے المظ آ رہا تھا۔ وہی روز و شب
لوٹ آئے تھے۔ اس دوران اس نے ایک نئی
مشاعرے میں بھی شرکت کی تھی۔ مشاعرے کی یہ
محمل پروا کے ایک پرستار نے سنبھالی تھی اس
مشاعرے میں اس جیسے فن کے اور قدروان بھی موجود
تھے۔ انہی میں جمل صدیقی بھی تھا۔ اکثر مشاعروں میں
وہ پروا کو دیکھ اور سن چکا تھا۔ پروا الونگل کی شاعری اور
خوب صورتی کا وہ دل سے معترف تھا۔ مشاعرے کے
بعد کھانے پینے کا بھی انتظام تھا۔ اس دوران موقع پا کر
جمل صدیقی پروا کے قریب چلا آیا۔ وہ پروا سے اس کی
شاعری کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ موضوعات
ایسے تھے کہ لا محالہ وہ بھی سننے پہ مجبور تھی۔

”اگر آپ کو پروا نہ ملے تو کبھی کبھی آپ سے بات
کر لیا کروں؟“ وہ بڑی دھججی سے اسے دیکھ رہا تھا جو
ملتا ہے۔ آئے ہاں کو کچھ کر رہی تھی۔
”کیوں نہیں ضرور سمجھیے۔“

”تو پھر اپنا کوئی کھٹکٹ نمبر بتائیے۔“ وہ اچانک بولا

تو پروا خاموش سی ہو گئی۔

”او کے ہے میرا نمبر۔“ اس نے کچھ سوچ کر اپنا
نمبر جمل صدیقی کو بتایا۔

چار دن گزر گئے تھے۔ فیصل نے ایک بار بھی رابطہ
نہیں کیا تھا۔ پروا نے خود ہی اسے فون کیا تو نمبر بڑی
تھا۔ اس کے بعد اس نے سسرال کا نمبر ملایا۔ فون
ملازمہ نے ریسو کیا۔ تراب انکل اور نیلم آئی گاؤں
گئے ہوئے تھے۔ راجیہ اپنے بیڈروم میں تھی۔ سو کھر

کے کسی فرد سے اس کی بات نہیں ہو سکتی۔
وہ فون بند کر کے بیٹھی تھی کہ فیصل نے اسے
کل پیک کی۔

”نتیجہ یہ ہے آپ ٹھیک تو ہیں؟“ سلام کے
فورا بعد پروانے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، تم سنو، خوب انجوائے
کر رہی ہوں؟“

”ہاں۔۔۔ بس۔۔۔ لیکن آپ اتنے دن سے کہاں
ہیں؟“

”اس وقت تو آفس میں ہوں۔ آج آئی تھی اور دیگر
افسران کے ساتھ میٹنگ ہے۔“ وہ نارمل انداز میں
کہہ رہا تھا۔

”آپ نے تو کوئی کل اور میسج تک نہیں کیا چار
دن میں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے شکوہ کر ڈالا۔

تھوڑی دیر وہ خاموش رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔
”ہاں میں بہت بڑی تھا۔ دوسرے میں نے سوچا کہ
جیسے ڈسٹرب نہ کروں۔ آرام سے رہوں۔“ پروانے
تاثرات عجیب سے ہو گئے۔

”آپ کب اپنے آفس کے؟“

”جواب کوئی۔ لیکن میرا دل ہے کہ کچھ دن بڑک
جلاؤ۔ ہفتہ دس دن اور میں بھی آج کل بہت بڑی
ہوں۔ آئے جانے کا کوئی نام نہیں۔ ان چار دنوں میں
کسی دن بھی پر اپر ریسٹ نہیں کیا ہے۔ میرا اسٹنٹ
بھی نہیں آ رہا ہے۔“ وہ جلدی میں تھا اس لیے فون
بند کر دیا تھا۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے ہاتھ میں تھا سے سیل فون کو
دیکھنے لگی۔

رات اسے غینہ بھی ٹھیک طرح سے نہیں آ سکی۔
نہ ہی وہ کچھ لکھ سکی نہ ذہن کچھ براگندہ سا تھا۔

تھی دیر کرو میں بدلتے گئے بعد غینہ مہو بن ہوئی
تھی۔

☆ ☆ ☆

پروانہ کو کراہی تو آسمان پہ کالے بادل ایک دوسرے

کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ موسم بہت
روہشک ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت میں دھن سے جو
عجیب سی سبے زاری رہی ہوئی تھی۔ ایک دم بھاگ
گئی۔ رطابہ بھی صبح سے اوجھ رہی تھی۔ ان کے اپنے
گھر میں کل سے اس کے ہونے والے سانس مسر
آئے ہوئے تھے۔ سو وہ صبح ہی اس کی طرف آگئی۔

کتنی باتیں تھیں اس کے پاس پروانہ کے لیے۔
موسم میں ایک دم دو آنے والی خوب صورتی نے
اسے پرجوش کر دیا تھا۔ لیکن کی طرف تھی تو رطابہ
یکوڑے مل رہی تھی اور مہماں کے پاس بیٹھی باتیں
کر رہی تھیں۔

یکوڑے بن گئے تو پروانے چٹنی بھی پھیل۔ رطابہ
نے چاہے کچھ دیر پہلے ہی پہاڑی تھی۔ بارش کی ہلکی ہلکی
پھوار پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ پروانے کچھ اٹھا کر ان
میں گئے آئی۔ لیکن کی کر سکیں۔ پینہ کر سکیں تھے
انہوں نے چاہے کے ساتھ یکوڑے کھائے۔ بارش تیز
ہو گئی تھی۔ رطابہ بھی تھوڑی دیر بعد اپنے گھر چلی گئی۔

پروانہ کی رہ گئی۔ مہماں پہلے ہی رطابہ کی طرف صبر سنا
خوب صورت بیٹھا۔ کچھ موسم تھا اس کے حالات کی
رو فیصل کی طرف بننے لگی۔ پروانہ کی شادی کے بعد یہ
پہلی بارش تھی اور وہ اس ایر آؤد موسم کی شروع سے
دوبولی تھی۔

”پتا نہیں وہ کیا کر رہے ہوں گے؟“ وہ مسلسل اس
کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ سات دن ہو چکے
تھے اسے میکے آئے ہوئے اور تیسری رات سے اسے
غینہ ہی نہیں آ رہی تھی۔ کسی کی کا احساس ہو تا تھا۔

ابھی اس نے اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس
کی کا احساس یقین میں بدل گیا۔

فیصل کی یاد اس موسم میں بڑی طرح حملہ آور ہوئی
تھی۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھا کہ فیصل نے
اس دم صبح برستے موسم کے حوالے سے اسے کوئی
پیغام بھیجا ہو گا۔ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی اور غصہ بھی
گیا۔ مہماں رطابہ کے گھر سے واپس آئیں تو اس نے
جانے کی تیاری مکمل کر لی تھی اور پلپا کو فون بھی کر دیا تھا

کہ اسے گھر ڈراپ کر دیں۔ اپنی گاڑی وہ شادی سے
پہلے ہی بیچ چکی تھی اور شادی کے بعد جب بھی نہیں
بانا ہوا تاؤ رات پھر چھوڑا آیا اگر فیصل فری ہو تا تو وہ اس
کے ساتھ ہی آتی جاتی۔

پلپا آئے تو اس نے مہماں کو غلت میں خدا حافظ کہا اور
تقریباً چھاتی ہوئی گیٹ سے باہر کھڑی گاڑی میں جا
بیٹھی۔

☆ ☆ ☆

اس کے اصرار کرنے کے باوجود پلپا نہیں رکے اور
اسے ڈراپ کر کے واپس ہو گئے۔ گیٹ سے پر کدے
تک پہنچنے میں پروانے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ بارش
کی بو جھاڑ خاصی تیز تھی۔ میٹنگ روم میں سب بیٹھے
نہیں بول رہے تھے۔ پروانے مسکراتے ہوئے سلام
کیا۔ نیلم نے اسے گلے لگا کر آقا اور انجم کی خیریت
دریافت کی۔ تراب بھی یاس بیٹھے تھے انہوں نے اس
کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”بیٹا! تمہاری گئی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ نیلم
فیصل سے کہنے لگی تھی کہ جا کر پروانے کو لے آؤ۔ لیکن
میں نے منع کر دیا کہ اتنے عرصے بعد گئی ہے اپنے
والدین کی طرف۔ تو سکون سے کچھ دن گزارنے دو
اسے۔“

تراب انکل کے انداز میں بالکل پلپا جیسی اپنا حسی
تھی۔ وہ نمل ہی ہو گئی۔

”راجہ اور ستان نظر نہیں آ رہے ہیں۔“ اس نے
اوجھر اوجھر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”راجہ اپنے بیڈ روم میں ہے اور ستان اپنے بزنس
کے سلسلے میں گرجا چکے ہیں۔“ پھر انہوں نے اس
کی نگاہوں کی بے قراری دیکھ لی۔

”فیصل آج کل لیٹ آ رہا ہے۔ دو دن پہلے وہ رات
کو گھر ہی نہیں آیا تھا۔ کتنا اٹھا تھا کہ صبح کی طرح تم
بھی بزنس سنبھالو گھر اس نے ایک نہیں سنی۔ ہر وقت
دل کو دھڑکا کا رہتا ہے۔“ نیلم مہماں کے ہاتھوں مجبور
ایک عام سی عورت لگ رہی تھیں۔ پروانہ بھی پریشان

ہو گئی۔ لیکن خود کو سنبھال کر انہیں تسلی دی۔
”آئی! اللہ اپنے حفظ و لہان میں رکھے انہیں۔
آپ دعا کیا کریں۔“

”مجھے پتہ تو فیصل کی طرف سے کوئی پریشانی
نہیں ہے۔ کیونکہ تم جیسی ہاشور اور محبت کرنے والی
حساس شریک حیات اس کے پاس ہے۔ لیکن راجہ کی
طرف سے میں بہت پریشان ہوں۔“

”کیوں کیا ہوا ہے آئی؟“ ان کے انداز کے
غیر معمولی پن سے وہ کلک گئی۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ راجہ کو کیا ہوا ہے۔
شادی کے شروع دنوں سے وہ بہت خوش رہی۔ لیکن
فیصل اور تمہاری شادی ہوتے ہی بالکل بدل گئی۔
یہ بنیاد باتوں کو جو انہیں کدو لڑائی کے بدلے دے دیتی ہے۔
اب تو صبح بھی تنگ آ گیا ہے۔ ہر وقت بیڈ روم میں
ٹھس رہتی ہے۔ نہ کسی سے زیادہ بولتی ہے نہ کچھ۔“

آج پہلی بار نیلم نے راجہ کے بارے میں لب
کشتا کی تھی۔ محسوس تو پروانہ بھی کر رہی تھی۔ لیکن
کسی سے پوچھا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”اگر آپ کی اجازت ہو تو میں راجہ سے بات
کر دوں۔“ اس نے ہنسی کرتے ہوئے پوچھا تو نیلم نے
فورا ”منع کر دیا۔“

”میں یہ مناسب نہیں ہے۔ اہل جان مٹی ہوئی
ہیں سمیرا کی طرف۔“ آئیں کی تو سوچا جائے گا۔ کیونکہ
میں نہیں چاہتی راجہ تمہارے ساتھ کوئی بد تمیزی
کرے۔ میں بدواشت نہیں کروں گی۔“

”اوسے نہیں آئی! ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ آپ
خود اٹھ کر پریشان ہو رہی ہیں۔ میں اور راجہ دوست بھی
تو ہیں۔“

”تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں
نے بہار سے اس کے بالوں کو سلایا۔

”آئی! میں کپڑے بدل کر دروازہ بھیجی کی طرف
سے ہو آؤں۔ کافی دن سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔“
وہ ابھی تنگدوشوار کو بھانجی ہی بولتی تھی۔ سلوی سے
شروع میں دوستی ہوئی تھی وہ بھانجی بھانجی کہتی تھی۔

پروا کی لپٹ میں ہی چڑھا ہوا تھا۔
 نیکی خوش ہو گئیں۔ وہ اس گھر کے کنبھوں کو اپنا ہی
 سمجھتی تھی، جبکہ راجہ تراب کی کن کی بیٹی ہونے کے
 باوجود یہ وہی والا سلوک کرتی تھی۔
 ”ہاں ضرور جانتا“ وہ بھی کل ہی تو پوچھ رہی تھی
 تمہارا اس کے پاس خوش خبری ہے تمہارے لیے۔“
 ”کون سی خوش خبری؟“ وہ بے پالی سے بولی تو نیلم
 نے محبت پاش لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے خوش
 خبری بھی سناؤ لی۔ شادی کے ڈھائی سال بعد در شوار
 پہلی بار امید سے ہوئی تھی۔

پروا کھڑے بدل کر اسی وقت در شوار کی طرف
 آئی۔ وہ بہت محبت سے ملی، پروا نے مبارک باد دی تو
 در شوار کو سلوی کا شکریہ ادا کیا۔
 ”سلوی کا فون آیا تھا رسول۔ بہت پوچھ رہی تھی
 تمہیں اور کہہ رہی تھی کہ تم اتنی ست یوں ہو گئی
 ہو۔“

”میں آج ہی اس سے بات کروں گی میں ان دونوں
 بہت بڑی ہوں، رزلٹ بھی آنے والا ہے اور دینی وی
 پروگرامز کی ریکارڈنگ کے لیے بھی جانا ہے۔“ اس
 نے مصروفیات کی تفصیل بتائی تو در شوار نے اسے
 رشک سے کہا۔

”میں بہت خوش قسمت ہوں جو تم جیسی بھابی ملی
 ہے۔ جہاں بھی جاتی ہوں لوگ تمہارا حوالہ دیتے
 ہیں۔ کتنے لوگ تمہیں اپنے آنگن کا چاندنا چاہتے
 ہوں گے، لیکن یہ فیصل بھائی کی گڈ لک ہے کہ پروا
 اور ز کل نا ہی یہ چاند ان کے آنگن میں اترے۔“
 در شوار کے کچھ میں روایتی ننوں والا کوئی جھلپا نہیں
 بلکہ صرف اس کی محبت بول رہی تھی۔ وہ اندر تک
 سرشار ہو گئی تھی۔

فیصل ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پروا چاہتی تو فن
 کر کے اسے اپنی آید کا تا سکتی تھی۔ لیکن وہ اسے
 سربراہ نہ چاہتی تھی کہ اچانک اسے سامنے پا کر وہ

بہت خوش ہو گئے اس کی سبے لہجوں اور شدتوں کا تصور
 کر کے وہ خوش سے بھی شرابی۔
 اس نے وار وار سوپ سے میٹھوں کھر کا خوب صورت
 سا سوٹ نکالا۔ یہ کمر اسے بہت پسند تھا اس نے
 لائٹ سامیک اپ کیا اور در زابل کھلے چھوڑ دیے۔
 رات کے وقت فیصل بھی اسے بل پانڈھنے نہیں
 دیتا تھا۔ اگر بندھے ہوتے تو وہ خود اس کا کچھو اٹھارتا
 تھا۔

”آپ کو تو پولیس فائر منٹ کے بجائے کہیں اور
 ہونا چاہیے تھا۔“ اس کی حد درجہ چاہت سے وہ بھی
 کبھی خائف ہو جاتی تھی۔
 ”ہری امیری جان لیہ نری یہ محبت تمہارے
 ساتھ مخصوص ہے، ورنہ اپنے فائر منٹ میں“ میں
 بہت سخت مشہور ہوں۔ تم شکر کیا کرو اس بات پر کہ
 میں گھر میں پولیس آفسروں والا سلوک نہیں کرتا۔“ وہ
 شرارت سے کہتا۔ یاد آنے پر پروا کے یوں پہ
 مسکراہٹ آئی۔ مندی اس نے کل ہی رطابہ سے
 لگوائی تھی۔ ابھی اپنے لوپر ڈھیر سارا پیٹھم ابرے
 کرنے کے بعد اس نے کمرے کو بھی آئیر فرسٹر سے
 مکارا دیا۔

اب اسے شدت سے فیصل کا انتظار تھا۔ پورے
 ایک ہفتے بعد اسے دیکھنے اور ملنے کا تصور ہی کتنا جان
 فزا تھا۔ اس چند دن کی دوری نے سب محسوسات کو کتنا
 بڑھا دیا تھا۔ اس کا انتظار کرتے کرتے جلتے کب پروا
 کی آنکھ گئی اسے خبر نہیں ہوئی۔

فیصل کی آمد پر چونکدارنے کیٹ کھولا۔ دو بج گئے
 تھے چونکدار خود بھی لوگھ رہا تھا۔ ہلکی بارش اب بھی
 جاری تھی۔ اس نے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو اندر زیرو
 پاور کا بلب جل رہا تھا اور پروا کو خواب تھی۔ اسے
 خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ بیڈ کے قریب کھڑا اسے دیکھ رہا
 تھا۔ پروا کے کھلے در زابل اس کے دونوں سائیڈ پر
 بکھرے ہوئے تھے اور آؤھا چو چھا ہوا تھا۔ ایک
 ٹائیس کے لیے اس کا پی جاہا کہ اس کے بکھرے بالوں کو
 اس کے چہرے سے ہٹا دے، مگر دل کو اس نے سمجھا

لیا۔
 وہ چیخ کر کے اس کے قریب لپٹا تو پروا نے اس کی
 طرف کرکٹ مار دی۔ وہ تھوڑا پرے ہو گیا۔ پروا کی حیات
 اس کے معاملے میں بہت تیز تھیں۔ اس کی آنکھ
 خود بخود کھل گئی تھی۔

”آپ کب آئے ہیں؟“ اس کاغیند میں ڈھپا زہن
 کچھ ہی دیر میں بیدار ہو گیا۔

”چند منٹ پہلے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا
 تھا۔ ”اور پھر سوچا۔“ اس نے کرکٹ بدل لی۔

”آپ سلا دیں نا!“
 ”مجھے خود غینہ آ رہی ہے، سوچاؤ۔“ پروا اس کے

قریب آئی۔
 ”میں نے اپنی جگہ سونا ہے۔“ اس وقت وہ بہت

مندی ہو رہی تھی۔
 پروا نے اس کے سینے میں منہ چھپایا تھا اور دوسرا

ہاتھ اس کے اوپر رکھ دیا تھا۔
 ”فیصل! میں نے آپ کو بہت مس کیا، رات کو بہت

دیر سے سوئی تھی۔“
 ”کون؟“

”آپ جو میرے پاس نہیں تھے اس لیے۔“ پروا
 کے لیے سانس نہ اٹھانے لاسے سرشار کر ڈالا۔ ناراضی
 کا جو خول اس نے چڑھایا ہوا تھا آہستہ آہستہ ٹوٹنے
 کے قریب تھا۔
 ”نیند تو تمہیں اب بھی نہیں آئے گی۔“
 ”کیوں؟ اب کیوں نہیں آئے گی؟“

”اب میں جو پاس ہوں سوئے ہوں گا اتنی آسانی
 سے۔“ پروا نے مسکراتے ہوئے نظریں چرائیں۔

پروا کا رزلٹ آؤٹ ہو چکا تھا۔ بیٹھ کی طرح اس بار
 بھی اس نے اپنی سابقہ پوزیشن برقرار رکھی تھی۔ اپنے
 فائر منٹ میں اس نے سیکنڈ پوزیشن لی تھی۔ راجہ
 بھٹکل پاس ہوئی تھی۔
 نیلم اور تراب لغاری کے سب جانے والے پروا

کے حوالے سے انہیں مبارک باد دے رہے تھے۔
 اوہ اس کے میکے سے بھی اقرار اور انجم آئے ہوئے
 تھے۔ سلوی نے فن کر کے اس کی کامیابی کی خوشی کو
 دوپلا کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت اسے تمل صدیقی
 کے فن کرنے سے ہوئی۔ اس نے بوئے طلوس سے
 اسے مبارک باد دی تھی اور آنکھ کے لیے ٹیک
 تملوں کا اظہار کیا تھا۔ اس نے بندر لینی سی ایس سے
 پروا کو پھول اور مشعلی بھی بجاوائی۔ پروا کے دل میں چور
 نہیں تھا۔ اس کے پرستاروں میں ہر طرح کے لوگ
 شامل تھے۔ جس میں عورت، موڈ کی شخصیں نہیں
 تھیں۔

ساتھی شعراء نے اور عرفان بادل نیازی نے امتحان
 میں پروا کی کامیابی کو اپنے انداز سے سلیبٹ کیا۔
 عرفان بادل نیازی نے پروا کو دیگر شعراء سمیت اپنے گھر
 مدعو کیا تھا۔ یہ سلاموں کا تھا جو انہوں نے اسے اپنے گھر
 بلایا تھا۔ ان کا ایک چھلکا سا شاعرے کا بھی پروگرام تھا۔
 پروا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس نے فیصل کو بھی پلنے
 کا کہا۔ وہ بہت بڑی تھا۔

اس کی حاجتی میں پروا گیا تھا۔ ان میں سے
 ایک لائبر رجمن بھی تھی۔ بطور اسے ایس آئی وہ
 اپنا ٹھہرتی تھی اور خطرناک حد تک کوڑھ مغز تھی۔
 ایس بی انظر شلہ نے بطور خاص اس سے سفارش کی
 تھی کہ لائبر پہ توجہ دتا۔ اس کی نئی نئی جالب ہے، کچھ
 زیادہ پتا نہیں ہے اسے اور نہ ہی اس فیلڈ کے اندر
 چڑھاؤ سے یہ واقف ہے۔

لائبر رجمن انظر شلہ کے دوست کی بیٹی تھی اس
 لیے وہ بھی اس کی سفارش پر مجبور تھے۔ کچھ ہی دنوں
 میں فیصل کو اندازہ ہو گیا کہ لائبر رجمن کو شروع سے
 ایک ایک بات سمجھانی ہوگی۔

وہ بس شوق میں اس فیلڈ میں آئی تھی۔ فیصل نے
 پہلے دن جب اس سے پوچھا کہ یہ پرویشن منتخب کرنے
 کی کوئی خاص وجہ تو اس نے بڑی بے نیازی سے بتایا کہ
 ”میں نے کچھ موبز دیکھیں، جن کا میں کرکٹر
 پولیس دو من تھی۔ میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ مجھے

رہ کر پولیس ڈپارٹمنٹ میں جاتا ہے حالانکہ ہماری فیملی میں اکثر لوگ ڈاکٹر یا وکیل ہیں، لیکن مجھے نہیں پسند، سو میں اس طرف آئی۔" فیصل کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

شریعہ میں لائبرین سیریس تھی، کیونکہ اسے جانتا تھا کہ یہ جاب اس کی ضرورت یا مجبوری نہیں ہے، لیکن فیصل کی حاجتی میں کام کرتے کرتے اسے دیکھی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کی غیر سنجیدگی دم توڑ رہی تھی۔ اور فیصل اس کا پلٹ بہت خوش تھا۔ اسے اب یقین ہو چلا تھا کہ لائبرین رحمان بہت بڑی کرے گی، کیونکہ اس میں سیکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔

پروا فیصل سے خفا سی تھی، کیونکہ اس نے عرفان بادل نیازی کے گھر جانے سے معذرت کر لی تھی۔ اس کے حلقہ احباب میں سے بہت سے لوگوں نے فیصل کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان سب سے اسے ملوانا چاہتی تھی۔ ورنہ اس کے پیچھے خورناز کا جذبہ کار فرما تھا کہ اس جیسا شان دار مرد اس کا شوہر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اکیلے ہی جانا پڑے گا، لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب راجیہ نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔

پروا کو اور کیا چاہیے تھا۔ راجیہ نے خود آکر کی ظاہر کی تھی۔ بڑے عرصے بعد وہ خوش گوار موڈ میں نظر آتی تھی۔ ورنہ پروا کے ساتھ اکثر اوقات وہ نامحسوس انداز میں طنز لہجہ لپٹا کرتی۔

عرفان بادل نیازی کا گھر کافی کشادہ اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ یہ سارا سلیقہ ملازمین کامروں منت تھا۔ ورنہ اس پر ہوتا تو گھر کسی کباڑ خانے کا نقشہ پیش کر دیا ہوتا۔

جمال صدیقی بھی عرفان بادل نیازی کے مہمانوں میں شامل تھا۔ راجیہ پروا کی پذیرائی پر ایک بار پھر اندر ہی اندر جل رہی تھی اور اس وقت تو کوئی دہی بھی جب اس کے ساتھ یہاں آئے کی باہی بھری تھی۔

جمال صدیقی موقع پا کر پروا کے پاس آیا۔ "میں نے کورس سرسوس سے آپ کی کامیابی پر پھول اور مٹھائی بھجوائی تھی۔"

"کی ہاں! مجھے مل گئی تھی۔ دو دنوں چیزیں۔ لیکن مٹھائی تو مجھے کھانی چاہیے تھی۔"

"ایک سی بات ہے، ہاں اگر مٹھائی کھلانے پر بعد میں تو پھر آپ کو میری ایک بات ماننا ہوگی۔" جمال صدیقی کچھ دیر کے لیے قصداً خاموش ہو گیا اور پروا کے چہرے پر اپنی مرضی کے تاثرات تلاش کرنے لگا تو وہ جلدی سے بول پڑی۔

"کون سی بات؟"

"میں اگر آپ کو پی سی میں بچے، انوائٹ کر دوں تو میری دعوت قبول کریں گی آپ؟" پروا کا پلو کار سر ہوا مسلسل اس کی نظروں کی گرفت میں تھا۔

"یہ بہت مشکل ہے، میں اپنے بڑے بڑے کوچ کر بتاؤں گی۔" پروا نے صاف انکار کر دیا تو وہ پھر بھی ہار نہیں مانتا۔

"ایک تو یہ بڑی خرابی ہے، محراب کے ساتھ کوئی نہ کوئی کٹنا لگائی ہوئی ہے۔" اس کے گہرے طنز کو پروا اچھی طرح سمجھ گئی تھی اور اسے برا بھی لگا تھا۔

"یہ کٹنا ہی تو کتاب کا منظر ہوتا ہے، یہ کٹنا نہ ہو تو پھول کی قدر و قیمت کون جانتے؟" پروا نے بڑے فحشہ سے ٹھہرے لیے میں اس کا وار اس کو گولیاں گھراس نے ذرا بھی برا نہیں مانتا۔

"صرف حسین ہی نہیں ذہین بھی ہو اور حسن و ذہانت جہاں اکٹھے ہو جائیں وہاں ہم جیسے کمزور دل لوگ خود کو کیسے سنبھالیں۔" جمال صدیقی لب کمال کر سامنے آ رہا تھا۔

"جمال صاحب! یہ حسن و ذہانت اب کسی لور کی ملکیت ہے، ہر کوئی اس پر حق نہیں جتا سکتا۔" وہ غصے سے کھول اٹھی تھی۔

"معلوم ہے۔ سب معلوم ہے، لیکن اگر۔"

جمال صدیقی کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا اور پروا آگے چلی گئی تھی۔ یہ دیکھ کر بغیر کہ اس کی پچھلی کرسی پر بیٹھی

جمال صدیقی کے لور جمال صدیقی کے بائیں ہونے والی کرسی پر تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے ساتھ آنا بیکل ہی فضا میں گھس گیا تھا۔

"ہاں! لوگ جنہیں لپٹا پسند کرتے ہیں، مجھے کج پتا۔" راجیہ رنگ حسد سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے نہیں راجیہ! میری شاعری کو۔" اس نے اپنی گھر راجیہ نہیں مانی۔

"شاعری کے ساتھ ساتھ تم خود بھی تو خوب صورت ہو اور اس بات کا تمہیں ایذا پہنچتا ہے۔"

"لیکن راجیہ! مجھ میں تخلیقی بہتر نہ ہوتا تو میری ادب صورت کی کوئی نے نہیں پوچھتا تھا۔"

"یہ تو نہ کہو نا اب آج بہت سے لوگوں کو میں نے تمہارے ارد گرد منڈلاتے دیکھا تھا، ان میں وہ کرے

گھری تھیں سوٹ میں براؤن بالوں والا ڈیفنسنگ سامو بھی تھا۔" پروا کو دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ راجیہ کی نگاہ بہت گہری ہے۔

"ہاں۔ جمال صدیقی ہے، ششم آفسر ہے، اکثر مقاموں میں آتا رہتا ہے۔" اسے کچھ نہ کچھ بتانا ہی تھا۔

"ہاں وہ عرفان بادل نیازی ہمارے تھے کہ تمہارا بہت بڑا رستار ہے۔" راجیہ نے اندھیرے میں تیر پھوڑا تھا، بونٹیلنے پر بیٹھا۔ پہلی بار پروا گھبرائی، کیونکہ راجیہ سے کبھی کبھی اسے بہت خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس نے اکثر ٹوٹ کیا تھا کہ جب وہ اور فیصل اکٹھے بیٹھے ہائیں کر رہے ہوتے ہیں یا ہنس پل رہے ہوتے ہیں تو اس سے راجیہ کی نگاہ بڑے تر سے ہوتے حسرت آمیز انداز میں ان کا طواف کر رہی ہوتی ہے۔ فیصل سے اس نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن دل میں وہی ضرور تھی۔

"ہاں! جمال صدیقی میری شاعری کو بہت پسند کرتا ہے۔" اس نے کہہ کر اپنی جان چھڑائی اور راجیہ کے

پاس سے اٹھ گئی۔

پروا کے پی وی پروگرام کی ریکارڈنگ چل رہی تھی۔ اس سلسلے میں اسے دو ٹی وی اسٹیشن جانا پڑا۔ اس پروگرام میں اس کی شاعری کے حوالے سے اس سے گفتگو کی گئی تھی اور ساتھ اس کا کام وہ معروف گلوکاروں کی توازن میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ آج ریکارڈنگ کا آخری دن تھا۔ فنی آلات میں خرابی کی وجہ سے ریکارڈنگ میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ اسٹوڈیو میں تو وقت کا اندازہ نہیں ہوا۔ لیکن جب وہ ٹی وی اسٹیشن سے باہر نکلی تو کئی رات ہر سو جھل جھل گئی۔ موسم بھی سرد اور ابراؤں کا تھا۔

اس نے حناں بھائی کو کال کی کہ اسے ٹی وی اسٹیشن سے پک کر لیں۔ کیونکہ فیصل تین دن سے لیٹ آ رہا تھا۔

پروا حناں کے ساتھ گھر پہنچی تو سب سے پہلے ہی فیصل سے ہی سامنا ہوا۔ اس نے سام کیلک گھراس نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے سنا ہی نہ ہو، اس نے دوبارہ سلام کیا تو اس بار اس نے اسے غصے سے دیکھا۔

"یہ وقت سے تمہارے آئے کا؟"

"سوری۔ ریکارڈنگ میں دیر ہو گئی تھی۔"

"تمہیں گھر کا اور میرا ہوش بھی ہے کہ نہیں؟" صرف اپنی شہرت اور شاعری کی ہی بڑی ہوتی ہے۔ میری فیملی کی کوئی عورت اس طرح گھر سے نہیں نکلتی۔ میں نے تم پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ صرف اس وجہ سے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، لیکن اس محبت کا تم کو اتنا ترقا نہ اٹھانے نہیں دوں گا۔ یاد رکھنا، عورت کے لیے اس کا شوہر اور گھر پہلے نمبر ہے ہوتا ہے جو عورتیں اس کا خیال نہیں رکھتیں، ان کے گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔"

آج پہلی بار پروا نے اسے یوں غصے میں دیکھا تھا۔ فیصل کی کوازیلند ہو گئی تھی۔ راجیہ بھی دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

میں آگئی۔ اسوں نے اسے وہ دہائی ہوئی اپنے گھرے
 صد شکر کہ تراب اور نلیم گھر پہ نہیں تھے ورنہ
 فیصل کو اس قدر غصے میں دیکھ کر جانے کیا مطلب
 لیتے۔
 فیصل کھانا کھا کر کافی دیر بعد بیڈ روم میں آیا۔ ملازمہ
 وہاں پروا کو کھانے کے لیے بلانے آئی، مگر پروا نے
 بھونک نہ ہوئے کا ہنسا کر کہ اسے ٹال دیا۔
 پروا کو پورا یقین تھا، ابھی کچھ ہی دیر میں فیصل کو
 اپنے غصے کی بد صورتی کا احساس ہو گا اور وہ اسے سوری
 کرنے آئے گا۔
 لیکن اس کے وہ لٹ گیلہ پروا اب بھی رو رہی تھی۔
 اس نے ایک بار بھی اسے چپ کروانے کی کوشش
 نہیں کی اور نہ کھانے پر اصرار کیا۔
 بچکیوں سے پروا کا سارا وجود دھل رہا تھا۔ مگر آج
 فیصل بے حس بنا ہوا تھا۔ دل کے سارے درد کو اس
 نے ظلم کے سر دے کر دیا۔
 زہریلے لفظوں سے
 نوکیلے لفظوں سے
 اپنے تئیں لفظوں سے
 تو نے مجھ کو آج
 چھٹی چھٹی کروایا ہے
 تو نے مجھے ریزہ ریزہ کر دیا ہے
 مجھے اپنے ہی آسوں کی قبر میں
 تو نے زندہ دفن کر دیا ہے
 تو نے زندہ دفن کر دیا ہے
 وہ کہنے سے آئی تو لکھتی چلی گئی۔ اس لقمہ کا عنوان
 اس نے "بارہ و سبیری رات" رکھا تھا۔ یہ رات اسے
 کبھی بھولنے والی نہیں تھی۔ محبت کے بدلے فیصل
 کا یہ نیا روپ اس جیسی حساس دل لڑکی کے لیے کتنا
 اجنبی اور ناقابل برداشت تھا۔ آج اس نے پروا کے
 لیے اپنے دل کے درد آڑے اور بازو وہ دونوں نہیں
 کھولے تھے۔ پروا کی سائیڈ پہ وہ خود پھیل کر لیٹا ہوا
 تھا۔ وہ بھی اپنا تکیہ اٹھا کر صوفے پہ چلی آئی۔

رات کے کسی ہر فیصل کی آنکھ کھلی تو فیصل میں اس
 کے بازوؤں نے پروا کو ڈھونڈا۔ وہ بند ہوئی تو فیصل
 تب فیصل کے حواس پوری طرح جاگ اٹھے۔ صوفے
 پہ اسے سوچا کہ کب فیصل کو سب یاد آگیا۔
 "میرا سلیبہ لیے تمہاری بھول ہے کہ میں تمہیں
 مٹاؤں گا۔" مگر وہ بدل کر وہ صوفے کی کوشش کرنے
 لگا۔
 * * *
 تراب لغاری کے پرانے ملازمہ رحمت کے بیٹے کی
 گھوڑوں میں شادی تھی۔ اس نے مالکوں سے بھی اپنی
 خوشنودی میں شریک ہونے کی درخواست کی تھی۔
 رحمت برسرِ پا ملازمہ تھا۔ گھوڑوں میں تراب لغاری
 کی زمینیں سنبھالنے اور مزارعوں سے کھم لینے کی
 ذمہ داری رحمت کے بیٹے کی ہی تھی۔ حضور انجم کے ہاتھ
 کی وجہ سے تراب لغاری نے اپنا تانا بان گھوڑوں اور آہالی
 زمینوں سے بالکل ہی توڑا نہیں تھا۔ مینے میں ایک دو
 بار وہ خود بھی گھوڑوں کا چکر لگاتے تھے۔ اس بار تو رحمت
 نے خصوصی دعوت دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے
 پورے گھر کو تیار کیا تھا۔ دربار اور بار بھی مبارک
 تھے۔ فیصل لغاری کو تین چھٹیاں بہت سے بعد ملی
 تھیں۔ سو وہ بھی جا رہا تھا۔ وہی پروا تو وہ وہی بار گھوڑوں
 جارہی تھی۔ وہ شرم میں پیدا ہوئی اور ملی بیڑی تھی۔
 کسی گھوڑوں میں جانے کا پسلا موقع تھا اور وہ سب کچھ
 بھول کر تیار کر رہی تھی۔
 راجہ بنانا تو نہیں چاہتی تھی، مگر ماسوں کا حکم تھا کہ
 رحمت کے بیٹے کی شادی میں سب چلیں گے۔ وہ
 مجبوری کے تحت جارہی تھی۔
 جمعہ کی شام کو سب اکٹھے ہو کر اپنی اپنی گاڑیوں میں
 نکلے تھے۔ پروا فیصل کے ساتھ آگے بیٹھنے کے بجائے
 پیچھے بیٹھی تھی۔
 پورا رات وہ باہر کے مناظر میں مگم رہی۔ دونوں نے
 ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔
 سیب اور انار کے بل کے بالکل ساتھ جو عمارت بنی

میں اس میں سب کے گھبرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔
 رحمت کے بیٹے ان کے آنے سے پہلے ہی گھر
 کی صفائی کروادی تھی۔ گھر کھلی پرانا تھا۔ لیکن اب
 ہاتھ لگانے کے لحاظ سے اس میں چند ضروری
 تبدیلیاں تراب لغاری نے کچھ عرصہ پہلے ہی کروائی
 تھیں۔
 رات کا کھانا رحمت کے گھر تھا۔ وہی گھر میں پکا
 مرغ اور تندور کی موٹی روٹیاں اور مٹروالے چاول ان
 سب سے ہی پیشہ پھر کر کھائے۔
 کل رحمت کے بیٹے کی بارات، پرسوں ولیمہ اور
 برسرِ پا ان کی واپسی تھی۔ آج رحمت کے گھر رحمت
 کا تھا۔ موسم بہت سرد اور ٹھنڈا تھا۔ سردی سے گھٹنے
 کے نیچے کوٹنے کی انگوٹھیاں پہنا کالی گئی تھیں۔ جس
 جگہ در شومار، پروا راجہ اور نلیم بیٹھی تھیں وہیں
 رحمت کی بیٹی رسوئے بلور خاص ان کے لیے انگوٹھیاں
 لگا کر رکھی تھی۔ پروا کو یہ سب بہت رو بہ شک لگ
 رہا تھا۔ تراب لغاری تو جلدی سونے چلے گئے البتہ
 باہر حنا اور فیصل لڑکیوں کے ساتھ ہی رہے۔ وہ سب
 ایک سائیڈ پر تھے۔
 اور مہمان بھی جمع تھے۔
 ولیمہ کی بیٹی راشو کی آواز بہت اچھی تھی۔
 عورتوں کی قرباش پہ اس نے بہت سے لمبے
 سنائے۔
 بہت سے پنجابی گانے اسے اڑے تھے۔ عورتیں
 دلچسپی سے اسے سن رہی تھیں۔ سب سے ریچوش
 پروا بھی۔ ساری عمر بیڑی جیسے ٹھکانا آباد شرم گزار
 کر آج رحمت کی خاتون اور ملکی فضا میں اگر اس نے
 جیسے ایک نئی دنیا دریافت کی تھی۔ رات کے قطرہ قطرہ
 چھلکتے سنائے میں راشو کی آواز سنتی پر سحر لگ رہی
 تھی۔
 میں تے میرا دلبر جانی
 بلیاں نے پیار کسائی
 سالوں آج آیا اسے طوفان
 موسم ہوا اسے بے ایمان

میں تے میرا دلبر جانی
 (میں اور میرا محبوب ہیں۔ ہمارے ہونٹوں پہ پیار کی
 کسائی ہے۔ سالوں میں طوفان کی کیفیت ہے اور
 موسم بھی بے ایمان ہو رہا ہے۔)
 راشو نے نیا لقمہ چھینا تھا۔ اس کے بول پروا کو حوچہ
 کر گئے تھے۔
 تیرے ہاتھ وچ چھنے میرے
 ہر پاسے آگ تل دی جاوے
 میں سڑی کہ عمر گزاراں
 پیاروں کوئی آج نہ آوے
 تبھی نے سرو ہواواں
 تینوں میں کی سمجھاواں
 بن داں اس کاواں انجان
 (تمہارے ہاتھ میں میرے ہاتھ ہیں اور ہر طرف
 آگ جل رہی ہے۔ میں جل جھن کر عمر گزاراں اور
 پیار پہ آج نہ آنے والے۔ سرو ہوا میں گرم ہیں۔ میں
 تمہیں کیسے سمجھاؤں تم کیوں انجان بن رہے ہو۔)
 پروا کے اندر دھیمی دھیمی سی آگ سلگنے لگی تھی۔
 فیصل سامنے پار کے ساتھ ہی تو بیٹھا تھا۔
 راشو کے گانے غصے کے بولوں نے اس کے من
 اندر سلگتی آگ کو کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔
 تاروں بھری سرد رات کھلے آسمان سے نئے
 شامیانے، جہنم کو حرارت دینی کوٹنے کی انگوٹھیاں،
 دیہات کی مخصوص فضا اور راشو کی گری بھاری، دلکش
 آواز ان سب نے مل کر پروا کو کچھ اور اس سا کر دیا تھا۔
 فیصل کو ان ساری خوب صورتیوں کا کیوں احساس
 نہیں ہو رہا تھا؟ کیوں وہ اس سے علاحدہ رہتا ہوا تھا؟ ایک
 پھولی سی بات پہ کوئی اس طرح بھی روکتا ہے؟
 تنگ رات جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی اور بھی
 سرد ہو رہی تھی۔ در شومار گرم کپڑوں اور سوئٹرز میں
 لپیٹے ہونے کے باوجود کپڑے ہی تھے۔ کوٹوں کی
 حدت کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اشارے سے
 باپ اور فیصل بھائی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ رات بھی کافی
 دھیمی تھی اور راشو بھی تھک گئی تھی۔

باز پروا کی دہشت اور استیلاؤں کے ساتھ خفاوش بیٹھا تھا ورنہ سرور سے دانت اس کے بھی بجھنے لگے تھے۔
 راجہ کی آنکھیں غنیمت سے بوجھل ہو رہی تھیں اس نے شکر کیا کہ سب یہاں سے اٹھے واپسی پر بلنگ کے پاس سے گزرتے ہوئے پروا چند خانے کے لیے روک گئی تھی۔ سیڑیوں اور کماروں کی ملی جلی خوشبو فضا کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ چاندنی میں لپٹی ہوئی رات اسے بے ساختہ اپنی طرف بلاری تھی۔ فیصل کی خفگی کا ڈر نہ ہوا تو وہ ٹھوڑی دیر کے لیے یہاں ضرور رکتی۔ مگر باتوں کو جو غنیمت آ رہی تھی بچا چار اسے بھی قدم بڑھانے پڑے۔

فیصل ہائٹ گاؤن پہن کر ہاتھ روم سے باہر آیا تو وہ بالوں میں پرش پھیر رہی تھی۔ اس نے خوشی پرش رکھا تو فیصل جو اس کے پیچھے کھڑا تھا اس نے پرش اٹھایا وہ اس کے ہٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پروا نے اپنی انا کے سر پر پاؤں رکھ دیا۔

”بہت ناراض ہیں کیا؟ ابھی تک غصہ نہیں اڑا ہے؟“ اس نے اپنی نازک بانہیں فیصل کے گلے میں جھانک کر پوچھیں۔

”پہلے بولے نا میں اس ناراضی سے تنگ آ گئی ہوں۔“ فیصل نے اس کے بالوں میں اسیلے۔

”سو جاؤ“ غنیمت آ رہی ہے۔“ اس کی طرح اس کا لہجہ بھی سرو تھا۔ پروا نے جھپٹی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے کوئی غنیمت نہیں آ رہی ہے“ آج بہت سی باتیں کریں گے جو میں اب تک کہہ نہیں پائی ہوں۔“ پروا کا لہجہ بہت جیسا اور آنکھیں جھپکی ہوئی تھیں۔

”میں سوچا تھا ہوں پائییز۔“

”میں نے نہیں سوئے رات۔“ پروا پہلی بار خند پر اتری تھی۔ اب وہ کھٹے اور کڑے تیوروں سے اسے گھور رہی تھی۔ فیصل کے لبوں پر مسکین آگئی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ اس کی ناراضی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اسے مسکراتے دیکھ کر پروا کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے تھے۔ فیصل نے بڑی نرمی سے اس کا سر سینے سے لگا دیا۔

”سری باتم سے خفاہ کر میں خود بھی بہت کداس تھا لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں شہرت کی چمک دمک نہیں مجھ سے جھجھ نہ سکے میں ڈر تا ہوں اس بات سے مجھے پتا ہے تم صرف میری ہی ہو۔ لیکن تمہارے بہت سے پرستار ہیں بہت چاہتے ہیں تمہیں۔ اور میں بھی اس بات کو پسند نہیں کروں گا کہ کوئی تمہیں میری طرح چاہے۔“

وہ اس حد تک حساس تھا اسے آج پتا چلا تھا وہ تڑپ سی تو گئی تھی۔
 ”نہیں فیصل! پرستاروں کی محبت اپنی جگہ“ میں آپ پیدا ہونے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ آپ کی محبت کے ہوتے مجھے اور مجھوں کی ضرورت نہیں ہے اور کوئی بھی مجھے آپ سے نہیں چھین سکتا۔ مجھے آپ بہت عزیز ہیں۔“

”پری! جس اپنے گھر کا اور میرا خیال رکھنا۔“
 ”میری! لیکن ترجیح میرا گھر ہی ہے۔“ وہ فیصل کے بانہیں بازو پر سر رکھ کر گھٹ گئی تھی۔

”آپ نے رات کو سنا“ کتنی باری آواز تھی۔“ یاد آنے پر وہ ایک دم اچھٹکی۔

”میں تو صرف نہیں دیکھ رہا تھا کہ میری بیوی آج کتنی خوش ہے اور انجوائے کر رہی ہے۔ ویسے کیا گا رہی تھی وہ؟“ فیصل دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

میں سے میرا دلبر جالی سناؤں رات آیا اسے طوفان موسم ہوا اسے بے ایمان

”سری! موسم تو واقعی بے ایمان ہے۔“ وہ اس کے بالوں کو پھراتے ہوئے شرر ہوا جا رہا تھا۔ لیکن وہ پرے سرک گئی۔

”جی نہیں۔ اتنے دنوں تک مجھ سے ناراض رہے“ مجھے پریشان کیا۔“

”میں خود بھی تو پریشان رہا نا!“ وہ بڑا معصوم ہوتا ہوا تھا۔ پروا کو فسی آئی تو وہ بھی شیر ہو گیا۔

پلائے اسے یہ دور فرما خبر سنا لی تھی کہ ماما میرین

نیو مرے دور وہ آخری ایجنٹ ہے جس طرح وہ تڑپ تڑپ کر رہی سب کو پریشان کر دیا۔ غلیم نے فیصل سے کہا کہ پروا کو ہم روز کے لیے مکیے چھوڑ دوں گا۔ تاکہ اپنی بات سنا سکیں۔ اس نے فوراً ایسا ہی کیا۔

الوارہ نے بھی باپسی ایڈمٹ تھیں۔ ریاض احمد نے کہا تھا کہ ہماری کو میر سپاس انگنڈ لے آؤ یہاں طالب کی بہترین سولیت ہیں۔ مگر اب اس کا فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ ان کی بھاری جد سے بڑھ گئی تھی۔ پروا دن رات ماما کے پاس تھی انہیں اپنی بیماری کا علم ہوا تھا اور وہ بڑی ہمدردی سے اس کا مقابلہ بھی کر رہی تھیں۔ لیکن قدرت کی دی ہوئی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ ایک صبح وہ بڑی خاموشی سے لہدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔

پروا کو ظاہر ہے ماں کی دائمی جدائی سے بہت بڑا شاک لگا تھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر انجم اور پروا کو تراب اللہاری غلیم فیصل اور اس کی باقی فیملی سے ہی سنبھالا۔ خاص طور پر غنیمت تو شروع میں پروا کے ساتھ اس کے مکیے میں ہی رہیں۔ فیصل دن رات اس کی دیکھ بھال کرتا۔ آخر کے چار سو گھنٹوں کے بعد وہ اسے گھر لے گئے۔ اس کی ہمدردی اور محبت نے اسے اس کڑی حقیقت کو قبول کرنے میں مدد دی۔ اور وہ معمول کی زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔

اور بیزا کستان کی ایک انجمن نے بڑے پیمانے پر مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ اس سلسلے میں پاکستان سے پروا اور گل سمیت کچھ اور شعراء کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مشاعرہ دینی میں پروا تھا۔ اسے جانے کے ٹکٹ اور رہائش کا انتظام اس انجمن کے ذمے تھا۔ پروا کا دعوت نامہ اور ٹکٹ بھی اس تک پہنچ چکا تھا۔ فیصل کا دل نہیں چاہ رہا تھا اسے خود سے اتنی دور بھیجے۔ پروا کی مقبولیت اور شہرت بڑھتی جا رہی تھی اب تو وہ ایک مستند شاعرہ تسلیم کی جانے لگی تھی۔ یہ مقبولیت اور شہرت اس نے بہت کم عمری میں حاصل کر لی تھی۔

جوں جوں وہ مقبولیت کے ذریعے ملے کر رہی تھی تو اس فیصل کے خدشات بڑھتے جا رہے تھے۔ تراب اللہاری اور غلیم غلیم نے پروا کو کئی بار ہندیاں عائد نہیں کی تھیں۔ ان کے لیے یہ بات خیر کا باعث تھی کہ ان کی بہو مقبول شاعرہ ہے۔ فیصل بھی تنگ ذہن کا مالک نہیں تھا۔ لیکن اب کچھ عرصے سے پروا کے معاملے میں وہ بہت حساس ہو ناچار تھا۔

اور وہ پہلی بار ملک سے باہر کسی مشاعرے میں جا رہی تھی تو لازمی بات ہے بہت خوش تھی۔ لیکن فیصل بچھا بچھا سا تھا۔ صرف پروا کی خوشی کی خاطر وہ خاموش تھا۔

جب وہ پروا کو چھوڑنے ایر پورٹ جا رہا تھا تو بہت چپ چاپ تھا۔ پروا اپنی خوشی میں اس کی یاسیت کو محسوس ہی نہیں کر پاتی تھی۔

”پروا! میں پھر لکھتا ہوں کہ اپنے گھر کو اور مجھے یاد رکھنا۔“ جب وہ اسے ڈراپ کر کے واپس آئے لگا تو کہہ۔

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ پہلے نمبر پر آپ اور میرا گھر ہی ہے۔“ پروا کو کچھ ٹھنڈا لگتا تھا۔ ”جس دن دن آؤں گا تو میں اس دن اپنا گھر آؤں گا۔“ اس کے گلے میں وارنگ سی تھی۔

”اوکے اوکے۔ اب اچھی سی باتیں کریں اور مجھے خدا حافظ کہیں۔“

”اللہ کی لمان میں دیا، جنہیں جلدی دلہن آتا۔“ فیصل اسے چھوڑ کر آگس میں آ گیا۔

لائیبر رحمان بہت ذہین کارکن ثابت ہو رہی تھی۔ فیصل ہر کس میں اسے ساتھ ساتھ رکھتا تھا۔ اسے لائیبر کی صلاحیتوں پر اعتماد ہوا جا رہا تھا۔ مٹھان چودری والے کس میں اس نے کافی اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔ اس کے کما حقہ میں وہ اچھا اضافہ تھی۔ اپنی خوب صورتی اور دلکشی کی بدولت آگس میں وہ جلدی مقبول ہو گئی تھی۔

دور جب وہ نئی نئی تھی تو فیصل کا دل کرتا تھا کہ اس سے کہے لیکن آپ ریسیڈنٹ واک کریں، ٹرانک کریں، لیکن خدا اڑا ہمارے فٹ پاتھ کا چھپا چھوڑ دیں اب وہی لائبریرین رحمان مثالی پولیس آفسر بن چاہتی تھی۔ فیصل کے مشاہدات اور تجربات اس کے بہت کلام آ رہے تھے۔

فیصل کی توجہ سے لائبریری غلط فہمی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فیصل لغاری دھیرے دھیرے اس میں انٹرنس لینے لگا ہے۔ وہ بھی بھی ایسی کہ کوئی بھی مرد اس میں دلچسپی لے سکتا تھا۔

جب سے پروا گئی تھی فیصل دن میں تین چار بار کل کرتا۔ ایک دن پروا مشاعرے میں بھی سیل اس نے سائنلٹ یہ چھوڑا تھا۔ وہ کل کرتا رہا اور ریسیو نہیں کر سکی۔ فارغ ہو کر ہوش آتی تو خود اسے کل بیک کی ٹیکہ داتے فیسے میں تھا کہ اس کی کل ریسیو نہیں کی۔ تین چار بار اس نے فون کیا مگر باؤس ہو کر فون رکھ دیا۔

رات سوئے سے پہلے اس نے فیصل کو آئی ایم سوڈی کا خوب صورت سائیں ایم ایس کیا۔ اسے یقین تھا ایس ایم ایس ریسیو کرنے کے بعد اس کا فہم ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

پروا دینی سے کوئی لیا کہ مصوفیات کا پتھر سا چل پڑا۔ اس کا سارا وقت اپنی تخلیقات کو بوائے سنوارنے اور برستاروں کے سامنے پیش کرنے میں صرف ہو رہا تھا۔ اس دوران جمال صدیقی مسلسل رابطے کی کوشش میں رہا۔ پروا مشاعرے انیڈا کر رہی تھی۔ دو دن پہلے وہ کراچی سے لوٹی تھی تو آج لاہور جانا تھا۔ لاہور سے واپسی پر سرگودھا کا پروگرام تھا۔ اور ان سب کے درمیان فیصل کی ذات بری طرح نظر انداز ہو رہی تھی۔

رات کو تنہائی کے جو چند خوش قسمت لمحے میر

آتے اس میں بھی پروا کے پاس اپنی ہی باتیں ہوتیں، وہ ہنس ہنس کر مشاعروں کے دوران پیش آنے والے واقعات اسے بتاتی۔

پروا لاہور سے لوٹی تو گھر کی فضا میں غیر معمولی پن کا احساس اسے گیت سے قدم اندر رکھتی ہی ہو گیا۔ بے حد خاموشی طاری تھی۔ کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ شام کا وقت تھا اور اس وقت سب جمع ہوتے تھے۔

”سب لوگ کہاں ہیں؟“ فی وی لاؤنج میں بیٹھی ڈرائے میں گمن گھریلو ملازمہ سے اس نے پوچھا تو وہ ریسیوٹ چھوڑ کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”سب اپنے اپنے کمروں میں ہیں،“ اسے بتاتے ہوئے وہ کچھ پریشان سی نظر آ رہی تھی۔

وہ سیدھی راجیہ کے روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازے پر دو تین دھتک دی تھیں تب راجیہ نے دروازہ کھولا۔ وحشت زدہ چہرہ، سرخ آنکھیں، ٹھہرے بال، وہ اتنی دیر ان اور اجڑی اجڑی لکڑی کی پروا پریشان ہو گئی۔

”راجیہ! کیا ہوا ہے؟“ اس کے پوچھنے کی دیر تھی راجیہ کی آنکھیں اڑسروں پر پڑیں۔

”اندرا کو!“ اس نے پروا کو اندر کر کے دروازہ ہلاک کر لیا۔

”مجھے بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟“ سب لوگ کہاں ہیں؟“

”اوہ جی ہاں اور کہاں جاتا ہے؟“

”لیکن تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہوئی ہے؟“

اس نے روٹی ہوئی راجیہ کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ ابھی ہفتہ بھر سے ہی ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد راجیہ اور حنا کو خوش خبری سنائی تھی کہ آپ والدین بننے والے ہیں۔ ظاہری بات ہے مگر بھر میں خوشی کی لہر دو گئی تھی۔

پروا ان دنوں اپنی مصوفیت میں ابھی ہوئی تھی۔

ایک فی ایف ایم ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے اسے خبر دی گئی تھی۔ لیکن یہ پروگرام رات بارہ بجے گنایا ہوا تھا۔ پروگرام کا فارمیٹ ہلکا چلکا اور ادبی قسم کا تھا۔ اس کے مزاج کے عین مطابق۔ لیکن ایک غلطی تھی کہ اس کا نام رات بارہ بجے کا تھا اور فیصل نے یہ پروگرام کرنے کی اجازت اسے کبھی نہیں دی تھی۔ اس نے برائی طور پر یہی پروگرام کر شل تاہم میں کیا تو بہت پسند کیا گیا۔ وہ روزی ریڈیو اسٹیشن چلی جاتی۔ بات کسی نیچے نہیں پہنچ پاتی تھی، یہ نہ کہ پروگرام کا نام اس کے لیے سوٹ اینبل نہیں تھا۔ پھر بھی اسے امید تھی کہ وہ ہر ریڈیو سر کو قائل کر لے گی۔

”میں کیا بتاؤں؟“ ماموں، ”ملنی، حنا،“ در شہوار آئی سب کتنا بیل گئے ہیں۔ پہلے ہی لوگ مجھ سے رات بارہ جاتے تھے۔ لیکن اب انہیں مجھ سے بہت سی شکایتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا بھی تھا کہ ابھی میں مل بیٹے کے قاتل نہیں ہوں۔ میری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی“ میں نے اس سلسلے میں حنا سے بات کی کہ میں اپارشن کرنا چاہتی ہوں، کیونکہ ڈاکٹر نے صاف بتایا ہے کہ ماں بیٹائی اطفال میرے لیے ریسک ہے۔ اس بات پر اس نے وہ شور مچایا کہ نہ پوچھو، پورے گھر کو جمع کر لیا۔ سب نے اپنی لعن طعن کی جگہ کہ نہ پوچھو۔ جیسے سارا قصور میرا ہے۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ ان سب کو میری زندگی یا صحت سے لگاؤ ہے۔ تم بھی تو ہونا فیصل نے کبھی تمہیں فورس کیا یا تنگ کیا؟ تم مزے سے شہرت کے مزے لوٹ رہی ہو“

آج ریل کل وہاں ایک میں ہوں کہ جسے جاہل عورتوں کی طرح جتنے پیدا کرتے نہ لگا رہا ہے۔“ پروا نے جانتے کیوں اس سے نظر اٹھائی تھی۔ فیصل کو بھی بچے بہت پسند تھے اور وہ جب موڈ میں ہوتا تو اکثر کہتا ہی کہ صرف مجھے دو بچے دے دو، اس کے بعد اور تنہا نہیں کروں گا۔ جواباً وہ ہنسنے لگی۔ تو اس کی ضد کے باوجود مجبور ہو کر خاموش ہو گیا تھا۔

لیکن راجیہ کو چیک اپ کے بعد جب ڈاکٹر نے

خوش خبری سنائی تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ ”مجھے یہ بتانا میرا کیا قصور ہے؟“ راجیہ کی آنکھیں پھٹکی پھٹکی تھیں۔ اس سوال کا جواب تو اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اسے کسی دلت سے کہہ دے، گروہ عظیم آئی کی طرف آئی۔ ”السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟“ اور آج گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ جواب میں انہوں نے سر کو دھڑکے سے ہلایا۔ ان کے لب ساکت اور آنکھیں اجنبیت کا تاثر دے رہی تھیں۔

”تم گھر میں کون تو تمہیں بتا چلے! لیکن تمہیں تو شہرت زیادہ عزیز ہے۔“

آج پہلی بار انہوں نے ایسی باتیں کی تھیں، سو پروا کو حیران اور پریشان ہونا ہی تھا۔

”آئی! کیا ہوا ہے؟“ کچھ باتیں تو سہی؟“ پروا نے ان کے قریب بیٹھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

”پروا! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے،“ ماہ نے میرے رُکون گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔“ فیصل عظیم کی آنکھوں میں نمی چمکتی تھی۔ پروا کا دل خوب سا اٹھا۔

”آئی! گھر میں کوئی بات ہو گئی ہے؟“ میں اپنی غلطی مانتی ہوں کہ مجھے پورے پختے سے شہرت مصروف رہی۔ اس لیے گھر کے معاملات پر اس طرح توجہ نہیں دے پائی۔ مگر مجھے کچھ تاخیر تو سہی ہو گیا ہے؟“

”راجیہ کتنی ہے؟“ مجھے حنا کے بچے کی ماں بننے سے نفرت ہے۔ پورے پختے سے اس نے ہمیں وہی پہنکایا ہوا ہے۔ جب سے اس کی رپورٹ پانچو آئی ہے تب سے وہ ضد پہ اڑی ہوئی ہے کہ اس نے اپارشن کروانا ہے، وہ کسی صورت بھی حنا کی اولاد پیدا نہیں کرے گی۔ پہلے تو یہ جھڑا صرف ان کے بیڑ روم تک تھا۔ آج بیڑ روم سے باہر نکل کر پورے گھر اور سارا بھابھی تک بھی پہنچ گیا ہے اور آج تو راجیہ نے حد کر دی۔ خوب زور زور سے چیختی اور پٹپٹاتی۔ فیصل

خوش خبری سنائی تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ ”مجھے یہ بتانا میرا کیا قصور ہے؟“ راجیہ کی آنکھیں پھٹکی پھٹکی تھیں۔ اس سوال کا جواب تو اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اسے کسی دلت سے کہہ دے، گروہ عظیم آئی کی طرف آئی۔

”السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟“ اور آج گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ جواب میں انہوں نے سر کو دھڑکے سے ہلایا۔ ان کے لب ساکت اور آنکھیں اجنبیت کا تاثر دے رہی تھیں۔

”تم گھر میں کون تو تمہیں بتا چلے! لیکن تمہیں تو شہرت زیادہ عزیز ہے۔“

آج پہلی بار انہوں نے ایسی باتیں کی تھیں، سو پروا کو حیران اور پریشان ہونا ہی تھا۔

”آئی! کیا ہوا ہے؟“ کچھ باتیں تو سہی؟“ پروا نے ان کے قریب بیٹھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

”پروا! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے،“ ماہ نے میرے رُکون گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔“ فیصل عظیم کی آنکھوں میں نمی چمکتی تھی۔ پروا کا دل خوب سا اٹھا۔

”آئی! گھر میں کوئی بات ہو گئی ہے؟“ میں اپنی غلطی مانتی ہوں کہ مجھے پورے پختے سے شہرت مصروف رہی۔ اس لیے گھر کے معاملات پر اس طرح توجہ نہیں دے پائی۔ مگر مجھے کچھ تاخیر تو سہی ہو گیا ہے؟“

”راجیہ کتنی ہے؟“ مجھے حنا کے بچے کی ماں بننے سے نفرت ہے۔ پورے پختے سے اس نے ہمیں وہی پہنکایا ہوا ہے۔ جب سے اس کی رپورٹ پانچو آئی ہے تب سے وہ ضد پہ اڑی ہوئی ہے کہ اس نے اپارشن کروانا ہے، وہ کسی صورت بھی حنا کی اولاد پیدا نہیں کرے گی۔ پہلے تو یہ جھڑا صرف ان کے بیڑ روم تک تھا۔ آج بیڑ روم سے باہر نکل کر پورے گھر اور سارا بھابھی تک بھی پہنچ گیا ہے اور آج تو راجیہ نے حد کر دی۔ خوب زور زور سے چیختی اور پٹپٹاتی۔ فیصل

خوش خبری سنائی تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ ”مجھے یہ بتانا میرا کیا قصور ہے؟“ راجیہ کی آنکھیں پھٹکی پھٹکی تھیں۔ اس سوال کا جواب تو اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اسے کسی دلت سے کہہ دے، گروہ عظیم آئی کی طرف آئی۔

”السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟“ اور آج گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ جواب میں انہوں نے سر کو دھڑکے سے ہلایا۔ ان کے لب ساکت اور آنکھیں اجنبیت کا تاثر دے رہی تھیں۔

”تم گھر میں کون تو تمہیں بتا چلے! لیکن تمہیں تو شہرت زیادہ عزیز ہے۔“

اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ رات کو کافی لٹ آیا تھا۔ اس جگہ سے اس کی آنکھ بھی کھل گئی وہ صورت حال جاننے کے لیے بچے آیا۔ راجیہ اس وقت زور زور سے چلا رہی تھی۔ اس پر وحشت سوار تھی۔ اس نے راجیہ کو منع کیا جو بیا۔ راجیہ نے اس کے ساتھ بد تمیزی کی انتہا کر دی۔ وہ وہ باتیں کہیں جو میں بیان نہیں کر سکتی۔ تراب خاموشی سے سارا تماشا دیکھتے رہے اور حنا وہ تو سدا کا بڑا ہے راجیہ کے سامنے وہ آج تک اونچی آواز میں بول نہیں سکا ہے۔ رجب بھائی اور سارا اسے اپنے ساتھ لے گئے اور فیصل وہ اسی وقت جس حال میں تھا گاڑی لے کر نکل گیا۔ شام ہو گئی ہے۔ اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔ سب فون پر بار بار مل کی ہے مگر اس نے جان کر فیر آف کر رکھا ہے۔ تراب وہ تین بار گاڑی لے کر نکلے جس میں اس کا پتا کرنے مگر ابھی تک کچھ خبر نہیں ہے۔ میرا بچہ کس حال میں ہے۔ پروا تمہاری گرہنی خطرے میں ہے۔ راجیہ نے اس کی غیرت کو لگا رکھا ہے مجھے اپنے بچے کا پتا ہے میں نے اسے جہم دیا ہے مجھے پتا ہے وہ اس وقت کیا ہے۔ جہاں ہوا ہو گا۔

نیلیم کی کوئی بات بھی پروا کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ ان کا دل عام صدمے سے ماؤف ہو گیا ہے۔

”آئی تائیں نا، کیا ہوا ہے میں اور پروا اشت نہیں کر سکتی۔ میرا دل بچت جائے گا۔ پلیز آئی۔“ پروا پریشانی کی انتہا پر تھی۔ جب فیصل نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا وہ غصے میں بھرا اس کی طرف آیا۔

”تمہیں جو جو کچھ لیتا ہے اٹھاؤ اور نکل جاؤ میرے گھر سے۔ فوراً۔“ ابھی اسی وقت۔ ”اس نے پروا کا بازو پکڑ کر زبردستی اٹھایا۔ ”جواباً وہ اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔

”نکل جاؤ میرے گھر سے۔“ اب کی بار اس نے پروا کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی دروازے کی طرف دھکا دیا تو نیلیم نے فیصل کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”نہ کرو یوں میرے بچے امت کرو۔ اپنا گھر مت تباہ

کر دو۔“ پروا پہلے ہی پریشان تھی اس الفاظ سے اور بھی گھبرا گئی۔ حنا اور شوہار تراب لغاری سارا سب ہی آگئے تھے اور فیصل کو باز رکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ لیکن وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔

”میں اسے ابھی اور اسی وقت طلاق دوں گا۔“

تراب نے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”پروا! اب اس وقت یہاں سے چلی جاؤ۔“ وہ غصے میں ہے میں نہیں جانتی کچھ غلط ہو جائے۔ اس وقت یہاں سے چلی جاؤ۔ نیلیم نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اس سے زیادہ دھکتا پروا کے بس کی بات نہیں تھی اور آموؤں کی وجہ میں اسے کچھ نظر بھی تو نہیں آ رہا تھا۔

اور اسے تو ابھی تک یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ اسے سزا کس بات کی ملی ہے۔

پروا لڑکھڑاتے ہوئے بے جا قدموں سے وہاں سے نکلی تھی اس نے وہاں سے کچھ بھی نہیں لیا۔ اپنا سب فون بھی وہیں چھوڑ آئی۔ گیت سے باہر نکلے گئے کو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

ڈاکٹر انجم گھر پر تھے اس نے ڈور بل پر ہاتھ رکھ دیا اور گویا مٹانا ہی بھول گئی۔ اوپر کے کلاسوں کے لیے ڈاکٹر انجم نے اقرا کی وفات کے بعد نیا لڑکا رکھا تھا اسی نے گیت کھولا۔

ڈاکٹر انجم اسٹڈی روم میں تھے۔ پروا بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ پھر گویا اس کی آنکھوں سے سمندر اٹل پر نہ۔ جس طرح وہ تراب تراب کر سبک کر دیتی اگر اقرا زندہ ہو جس تو بابت ان کا کیا خیال ہو نا۔ اکلوتی لالائی اولاد کو فریاد کنوں۔ دیکھ کر ڈاکٹر انجم کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔

”میں پوچھوں گا ایک بار فیصل سے کہ میری بیٹی کا قصور تو بتاؤ۔“ نہیں بہتری کی ایک ہی صورت نظر آ رہی تھی۔

”نہیں بیلا! آپ نہیں پوچھیں گے میں آپ کو لڑت

اؤں ہوتا نہیں دیکھ سکتی کبھی بھی۔ اور نہ میں جانتی ہوں کہ آپ ان کے سامنے روسیوں اور ڈاکٹر انجم میں اس شخص کی محبت اپنے دل سے نکل سکتی ہوں مگر جو آپ کہہ رہے ہیں وہ میں بھی نہیں مانوں گی۔ ابھی نہیں۔ آپ کو میرا اچھی طرح پتا ہے۔“

پروا نے اپنے ہاتھ سے بڑی بے دردی سے آنکھیں دھو کر انجم کو کبھی بھی اس کی ضد سے خوف آنا تھا۔

”اور ہاں اگر مجھے یہ پتا چل گیا کہ میری خاطر آپ تراب منٹل“ گئے یا ان سے کوئی بات کی تو بیا اس کے بعد آپ اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے خود دیں گے پوٹ کے لیے۔“ اس وقت وہ وہی پرانی پروا لگ رہی تھی۔

”لو کہ یہ دودھ پی کر تم آرام کرو۔ تم جیسا چاہو گی وہی ہو گا۔“ انہوں نے اسے بچوں کی طرح بھلا پھسلا کر دودھ پلایا۔ دودھ میں خواب اور دو اشاں کی تھی انہوں نے تاکہ وہ سو کر تازہ دم ہو جائے اور کچھ بہتر سوچنے کے قابل ہو سکے۔

اس کے سوچنے کے بعد بھی وہ کافی دیر اس کے پاس بیٹھی رہے۔ خیر ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اقرا کی وفات کے بعد حقیقی معنوں میں آج انہیں زندگی کی خیریاں اور مشکلات کا اندازہ ہوا تھا۔

پروا نے پاکستانی سفارت خانے میں جا ب کے لیے ایلانی کر دیا تھا۔ یہاں ذہانت کے ساتھ اس کی شہرت بھی کام آئی اور اسے جا ب مل گئی۔ انجم انتظار میں تھے کہ فیصل کے گھر سے کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا لیکن وہ ہتھ گزنے کے باوجود اوپر سے کوئی نہیں آیا تب انہوں نے سارے خطرات پس پشت ڈالتے ہوئے ”تراب منٹل“ کا من چیا تھا۔

نیلیم اور تراب شرمندہ تھے۔ انجم انہیں مطعون کر کے مزید شرمندہ نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا بڑی خاموشی سے جس طرح گئے تھے ویسے ہی واپس آگئے۔

تھے۔ اس بات کی ہوا بھی انہوں نے پروا کو نہیں لگنے دی تھی۔

پروا کو آفیسریلک ریلیشنز کی حیثیت سے اٹلی بھیجا جا رہا تھا۔ انجم نے اسے روکنے کی سب کوشش کی لیکن انہیں پتا تھا کہ وہ نہیں مانے گی اور ایسا ہی ہوا تھا وہ پہلی گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر انجم بھی بڑے بھائی کے پاس انگلینڈ چلے گئے۔ پہلے وہ وزٹ ویزے پہ صرف چھ ماہ کے لیے گئے تھے پھر واپسی پہ مزید پانچ سال کا ویزا لگوا کر دوبارہ چلے گئے پاکستان میں ان کی جو برابری تھی سوائے مکان کے انہوں نے سب فروخت کر دی۔ مکان انہوں نے جذباتی وابستگی کی وجہ سے فروخت نہیں کیا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ پروا سال بعد ایک ہفتے کے لیے ان کے پاس آئی تو وہ پھر سے ہشاش بشاش ہو گئے۔ ریاض احمد کے گھر دیے بھی ان کا دل لگ گیا تھا اور انہوں نے بڑھ چڑھ کر خدمت خلقی کے کاموں میں حصہ لیتا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی اتالیقی میرا کرنے پر پروا کا کھانہ انہیں کھانے جانا نہ پروا نے طلاق مانگی اور نہ فیصل نے طلاق دی تھی۔ دونوں وہی دور جب اس کی شادی کر دیے اس موضوع پر وہ پروا سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے کیونکہ انہیں اس کی علالت کا پتا تھا۔ وہ پہلے والی پروا ہی نہیں تھی۔ اس کے لب کو گویا ہنسنا بھول گئے تھے۔ وقت سے پہلے ہی اس نے خود سنجیدگی طاری کر لی تھی۔ مک آپ کی اشیاء تو وہ پہلے بھی اتنا استعمال نہیں کرتی تھی لیکن اب تو اس نے آنکھوں میں کاہل لگانا تک چھوڑ دیا تھا۔

اس کی شہرت اب پوری ملک میں بھی پہنچ چکی تھی۔ اسے پاکستان چھوڑے تین سال گزر چکے تھے۔ یہاں اٹلی میں بھی اردو ادب طبقہ موجود تھا۔ آئے روز مشاعرے ہوتے۔ سال چھ ماہ میں جب چھٹیاں ہوتیں تب وہ اٹلی سے باہر مشاعروں میں شرکت کرتی۔ سفارت خانے والوں نے اب اسے وہی بھیج دیا تھا۔ اٹلی کے مقابلے میں وہی زیادہ اہمیت بھرا تھا۔

اس کا تیسرا مجموعہ کلام ”چھوڑنے سے ذرا پہلے“ افغانی عرصے کے بعد منظر عام پر آیا تھا اور اس کا سلاٹ ریڈیو ہاؤس ہاتھ لیا گیا تھا۔ اب اس کا فن اور بھی ٹھیک تھا۔ اس مجموعہ کلام میں جتنی بھی شاعری تھی اکثر میں چھوڑنے کا کرب نمایاں تھا اور اس کرب نے شاید اس کے فن کو مزید پختگی عطا کر دی تھی۔

وہ اپنے آئس سے گھر کے لیے کافی لیٹ روانہ ہوا۔ صوبائی پولیس افسران کے ساتھ میٹنگ تھی۔ وہ آج کل پشاور میں اپنی خدمات سر انجام دے رہا تھا اور سرکاری رہائش گاہ میں رہ رہا تھا۔ کھانے کو ذرا بھی دل نہیں تھا اس نے ملازم کو کھانا لانے سے منع کر دیا اور چائے بنانے کو کہل۔ یونیفارم تبدیل کر کے اس نے ٹی وی آن کر لیا۔ یونٹی چیل سرنجنگ کرتے ہوئے ایک چیلنل پہ اس کی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔

میں بھی تنہا وہ بھی تنہا کیسے کئے گا یہ جیون تھا یادیں زانو راہ کرو کیونکر رہو گے تنہا تنہا سو فی صد وہ پرواہی تھی۔ اس کی آنکھیں لاکھوں انسانوں کے سچ تھی اس کی پہچان کر سکتی تھیں۔ اپنے مخصوص دلکش لمبے میں وہ اپنا کلام سنارہی تھی۔ فیصل کی نگاہ ٹی وی اسکرین سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔ ملازم نے چائے اس کے سامنے رکھ دی تھی وہ یونٹی رہی رہی۔

پرواہی کلام بڑھ کر ٹی وی اسکرین سے عتاب ہو چکی تھی مگر وہ خلی اللہ بن سائب بھی اسے گھورے جارہا تھا۔ اسے پتا تھا آج کی رات اس پر بہت بھاری گزروے گی۔ نیند کہاں آئی تھی اب سکون کی نیندیں تو روشہ چکی تھیں۔ لیکن تین سالوں میں وہ سکون کی بھرپور نیند کر ترس گیا تھا۔ نیند آتی بھی تو ٹوٹ ٹوٹ کر عذاب میں

لجی۔ درد کو چھوٹی سائب تو اس کے تحت بھی کہنے لگے تھے کہ ”سر آپ کی آنکھیں نیند کی کمی سے سرخ رہتی ہیں۔ آپ کچھ دن رست کریں۔“ مگر وہ ایسے مشوروں کو ٹال دیتا۔ وہ ملازم اسلام آباد جاتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ رات وہیں ہی نہ رستے۔ لیکن مل کی ممتا اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی۔ وہ گیسٹ روم میں سو جاتا لیکن اپنے بیل روم میں نہ جاتا۔ غلام کڑھ کر دروازے میں لیکن اب انہوں نے فیصل سے کچھ بھی کہنا چھوڑ دیا تھا۔

بیک شاپ کے سامنے اس نے بے اختیار اپنی گاڑی روکی تھی۔ وہ صدر میں ایک کلمہ سے آیا تھا۔ غلام شتم کرنے کے بعد کسی انتہائی سی قوت کے زیر اثر وہ کتابوں کی اس دکان کی طرف گیا تھا۔ پرواز پر کل کا تازہ مجموعہ کلام لے کر وہ رست حیر رفتاری سے وہیں سے نکلا تھا۔

واپس پہنچ کر اس نے بڑی بے تلی سے شاپر سے کتاب لکھی۔ ”چھوڑنے سے ذرا پہلے“ اس نے عنوان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جانے کسی یاد کو آواز دی تھی۔ کتاب کا ٹائٹل بہت دلچسپ اور اسی کے رنگوں میں لپٹا ہوا عنوان کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا اس نے کتاب کھولی۔ حروف اس کی نگاہیں پھسل رہی تھیں۔

کل رات میری آنکھوں کو کسی درد دلس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی تو میرا کچھ ہی میرے آنسو پونچھ رہا تھا اس سے مزید پردھان نہیں کیا اس نے کتاب بند کر کے بیٹھے رکھ لی تھی۔ اس کیفیت میں کتنی دیر معلق رہنے کے بعد اس

نے وہ بار کتاب کھولنے کی ہمت کی تھی۔ ہاتھ اٹھائے خود دھو کے لیے ایسے لگا کہ جیسے سارا دروازہ آنسو میری ہڈیوں میں سمٹ آئے ہیں اس سے اس نے بے اختیار اپنی آنکھوں کو پیرا محسوس کر لیا تھا۔

اس نے تو کھراستہ قدموں سے اٹھ کر کتاب بک شاپ میں رکھی اور باہر بیٹھ رہا۔ ان گزرتے بارہ سال میں اس نے پروا کی یاد سے دامن بچانے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن وہ آج بھی باکلام تھا۔ کہیں نہ کہیں ٹی وی ریڈیو یا اخبار سے اسے خبر مل ہی جاتی تھی۔ شروع میں سب نے کتنا سمجھایا تھا۔ غلام نے واسطے دیے محبتیں کیں مگر اس کی انا کا بہت نہ ٹوٹا اور آج قوت کتنا آگے سرک گیا تھا۔

لائبہ رحمان نے اسے پکھلانے کی مہم جاری رکھی تھی۔ اس نے بڑی جرأت سے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا تھا۔ مہمانے بھی کہا کہ شادی تو تمہارے گھر کی ہی ہے تو لائبہ سے ہی کرو۔ تم دونوں ایک ہی شعبہ زندگی سے تعلق رکھتے ہو، اچھی گزر جائے گی۔ لائبہ کے گھر میں سب کو پتا تھا کہ وہ فیصل کو پسند کرتی ہے۔ اپنی زندگی کے بارے میں اس نے فیصل کر لیا مگر آج تک نا اُسورہ تھوہل میں پرانے درد گاہے بگاہے جاگ اٹھتے تھے۔

”لیا آگے لیا آگے“ ایمان شور مچاتی اس کی ٹانگوں سے لپٹی تھی۔ اس نے ایمان کو اٹھالیا۔ ”لیا کی جان کیسی ہو؟“ فیصل نے فرط محبت سے اس کا گل چوما۔ پھر اسے اٹھائے اٹھائے وہ اندر داخل ہوا۔ سبیل دی لاؤنچ میں بیٹھے تھے۔ ”ایمان تمہیں بہت یاد کرتی ہے کم سے کم یہی کا تو خیال کر لیا کرو۔“ مہمانے شکایتی نگاہوں سے اسے

دیکھا۔ ”مہما! آؤ کیا ہوں اب میرے پوسٹنگ آرڈر آگے ہیں۔ میں آپ کے پاس ہی ہوں۔“ خوش خبری سنا کر اس نے انہیں حیران اور پھر خوش کر دیا۔ راجیہ اس کی آمد پر وہاں سے اٹھ کر کھلی گئی تھی۔ فیصل نے وہ شرمندہ تھی۔ نوسال کے دوران اس نے خود کو اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ فیصل کا سامنا اٹھے سر کے ساتھ کر سکے حالانکہ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی راجیہ کو معاف کر دیا تھا۔ لیکن وہ خود کو معاف نہیں کر پاتی تھی۔

ایمان اس کی گود میں بیٹھی شکایتیں کر رہی تھی اور وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ ایمان کی باتیں دل موہ لینے والی اور معصوم تھیں بالکل اس کی طرح اس کی ساری جھکن اداسی پر شرمیلی اڑ چھو ہو گئی تھی۔ رات وہ کھلی سنتے سنتے اس کے پاس ہی سوئی تھی۔

فیصل ایمان کے سوتے ہوئے معصوم چہرے کو دیکھ رہا تھا اس کے ساتھ ہی وہ سری ساری پہ لائبہ چڑھا رہی تھی۔ ایمان نے کھائی سننے کی ضد کی تھی۔ اس کی معصوم باتیں فیصل کے دل میں اثر کر چکیں تھیں آج بھی کھائی سننے کے دوران اس نے فیصل سے سوال کر دیا تھا کہ لیا شزاوے نے پھر شزاوے سے صلح کی کہ نہیں۔ فیصل نے اسے بھلانے کے لیے کہہ دیا کہ وہ ڈھونڈنا رہا افغانی عرصے شزاوے کی ہی نہیں۔

”لیا! آپ بھی شزاوے کو ڈھونڈ رہے ہیں نا؟“ اس نے بڑی بے ساختگی سے سوال کر دیا تھا۔ فیصل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اب وہ سوچتی تھی لیکن اس کا معصوم سوال فیصل لغاری کو امانی میں لے گیا تھا۔

فیصل مہری نیند میں تھا جب شور سے اس کی آنکھ کھلی۔ نیچے سے چپخنے چلانے کی آوازیں کے ساتھ حنا اور مہما کی ملی جلی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ وہ

مصور حال جاننے کے لیے ہانٹ گاؤں میں ہی جلدی سے نیچے آیا۔
 راجیہ مسلسل چی رہی تھی اور مچاچپ کروا رہی تھیں۔
 ”راجیہ! کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ میں اس طرح شور کر رہی ہوں، فیصل اس کے سامنے جا کر ہوا ہوجے بہت نرم تھا۔
 ”میری مرضی میں جو بھی کروں۔“ وہ بدلتی ہوئی نگاہ اس کا گڑوا ہوجہ تیزی برداشت کر گیا۔
 ”پھر کیوں جاہلوں کی طرح شور کر رہی ہو۔“ چھپس جو بھی شکایت سے آرام سے بتاؤ۔“ وہ اب بھی نرمی اور برداشت سے نکل رہا تھا۔
 ”ہاں ہاں میں جاہلوں کی طرح شور کرتی ہوں، سب کو مجھ سے شکایتیں ہیں اور سب کی چیتیں جو ہے وہ جو بھی کرے کوئی نہیں بولتا۔ مشاعروں کے نام پر سارا سارا دن گھر سے باہر رہتی ہے۔ کوئی نہیں بولتا۔ کبھی ریڈیو کبھی ٹی وی آج کراچی کل لاہور سہہ جو کرتی پھر رہی ہے نا! آپ کو نہیں بتا، دھول جھونکتی ہے وہ سب کی نگاہوں میں۔“ فیصل صدیقی سمیت جانے لگے۔
 لوگوں کو بے وقوف بنا رہی ہے اور آپ اپنی بیوی کو نہیں سنبھال سکتے۔“ راجیہ کے لفظ تھے کہ ”آگ“ فیصل اب نیچے سنا رہا۔
 ”آج صرف حقیقت میری زبان تک آئی ہے نا! کل آپ کی شہرت یافتہ بیوی کے کارٹسے اخباروں، رسالوں میں بھی آئیں گے۔ آپ کس کس کو منع کریں گے؟“ پتہ نہ چل رہی تھی میری نگاہیں کریں۔“
 سب کا ہکا بکا راجیہ کو بولنا سن رہے تھے، کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ آگے بڑھ کر اسے خاموش کروانا وہ تھک ہار کر خود ہی چپ ہو گئی۔
 فیصل جس طرح اٹھ کر بیٹھے کیا تھا اسی طرح گاڑی کی چابی لے کر گاڑی اشارت کر کے جانے لگاں چلا گیا۔ اس نے راجیہ کی کسی بھی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہنا۔
 پورا اسے شادی کے پہلے دن ہی اس نے ایک بات

بہت زور دے کر کہی تھی کہ پری میں دو چیزوں کے بارے میں کچھ دیکھنا نہیں کر سکتا، ایک انجی بیوی کے کرکٹر اور دوسری اپنی عزت نفس اور آئینہ۔ تم نے ان دو چیزوں کا خیال رکھنا ہے، اور مجھے تم پر یقین ہے کہ تم تمام عمر میرے ساتھ رہیں اور میں نہیں توڑ دوں گی۔ اس نے ایک جلی سی مسکراہٹ سے اسے گویا یقین دلایا تھا۔
 راجیہ کی باتوں نے اسے آگ لگتے آتش فشاں کے دھانے لاکھڑا کیا تھا۔ وہ ذہن سے کچھ بھی سوچنے مجھے گئے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ وہ کہ راجیہ کے الفاظ ذہن و دل پہ کوڑے پر سالتے۔ اس کے منہ سے طلاق کے لفظ نکلنے والے تھے۔ اس وقت تراب بخاری اسے وہاں سے لے گئے اور پورا بھی منظر سے ہٹ گئی۔
 ڈاکٹر انجم کو بیوی کا پاپ ہونے کے ناتے مجبور ہو کر ان کے پاس آئے۔
 تراب اور نیلم دونوں ان سے شرمندہ تھے۔ وہ فیصل کو سنبھالنے کے ٹھک گئے تھے۔ نیلم سارا اور تراب دوبارہ پروا کو واپس لانے کے لیے تیار ہوئے تو اس نے کہا کہ اگر وہ اس گھر میں آئی تو میں گھر سے چلا جاؤں گا۔ اور اس کا قصہ اترنے کے انتظار میں چار ماہ گزر گئے۔ نیلم سے اور وہاں نہیں جا رہا تھا۔ تراب سے مشورہ کر کے دربار کے ساتھ پروا سے ملنے آئیں تو گھٹ پے لگا لگا ان کا منہ جزا رہا تھا۔
 وہ طلبہ کے گھر غلی گلیں۔ طلبہ کے گھر سے ملنے والے جواب نے ان کی ساری امیدوں کو خاک میں ملا ڈالا تھا۔
 پروا نے سفارت خانے میں جا بکلی تھی اور اس وقت اٹلی میں تھی، جبکہ ڈاکٹر انجم اپنے بڑے بھائی کے پاس انگلینڈ شفٹ ہو گئے تھے۔
 پروا انہیں کچھ بتا کر نہیں سکی تھی، سوان کے دل میں ایک پھانس سی کر بیٹھی تھی۔ کاش وہ بتا کر یا مل کے جاتی تو وہ اسے روک لیتیں، کیونکہ فیصل کی انڈینڈی کا انہیں پتا تھا وہ مرکز بھی اپنی قلمی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔
 ان کے گھر کا شیرازہ ہی بکھر گیا تھا۔

جنان فیسے میں راجیہ کو کیسے چھوڑ آیا تھا۔ حالانکہ وہ فیصل کے مقابلے میں بہت نرم خور و مہربان مرچ قسم کا شوہر تھا۔ لیکن راجیہ کی بہت تن طرازی نے اس کی سولی ہوئی صراحتی کوچہ والا تھا۔ جنن تو بیٹھ کے لیے راجیہ جیسی زبان دراز اور گستاخ بیوی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ اس موقع پر تراب اور نیلم اس کے ارادے کے آگے مضبوط دیوار بن گئے تھے۔ راجیہ پر ہنگامت تھی وہ کسی بھی حال میں یہ تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔
 راجیہ کی ڈیووری قریب تھی۔ اب اس کے سارے کس مل نکل چکے تھے۔ وہ جنن کے بچ کی ماں بننے سے سخت نفرت کرتی تھی۔ لیکن ننھے ننھے بچے نے جب اس کی گود میں آ کر اپنی حیران اور معصوم آنکھوں سے اسے دیکھا تو ممتا کے سوتے پھوٹ پڑے۔ اب فیصل کے مقابلے میں جنن اسے دنیا کا بہترین شوہر نظر آ رہا تھا۔ فیصل نے تو پروا کو صفائی کا موقع ملے بغیر سزا دے ڈالی تھی اور جنن نے اس کی کتنی بے نیازیوں اور غلطیوں نظر انداز کی تھیں۔ کس کس موقع پر گھروالوں کے سامنے اس کا بھرم نہیں رکھا تھا۔
 جنن بچے کو دل پر موم ہو گیا۔ اس نے پروا کے معصوم لہجے کو فیصل کے ہاتھوں میں سمجھا دیا۔
 ”بھائی جان! اس کے صدمے راجیہ کو معاف کروں۔ وہ بہت شرمندہ ہے۔ لودھراؤ بھر کی سنی سنائی ہے۔ راجیہ کو شک ہو گیا تھا، کچھ اس کا حسد اسے لے ڈیا۔ لیکن اب وہ تمہارے دل سے شرمندہ ہے۔“ جنن وضاحتیں دے رہا تھا۔ راجیہ بھی جھکی نگاہوں سمیت اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
 گھر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب لائبر اس کی زندگی میں آنے لگی تھی۔
 وہ اپنے پچھتوؤں سمیت آیا تھا۔
 چھری طرح سخت ہے جس ہر جذبہ سے عاری۔
 نوسل مرکز چکے تھے، کتنی تبدیلیاں آئی تھیں۔
 در شہوار اور راجیہ وہ دو بچوں کی مائیں بن گئی تھی۔
 سلوی کے بھی دو بچے تھے۔ وری کی شادی ہوئی تھی وہ اب صاحب دلاوا تھی۔

تیسرے مجموعہ کلام کے بعد پروا کی اپنی سرگرمیاں رفتہ رفتہ ماند پڑ رہی تھیں۔ اب اس نے اپنی تقریباً میں آٹھ سال کا گڑوا ہوجہ تخلیق کا مکمل کب کاست پڑچکا تھا۔ اس کا قلمبھا بھو گیا تھا۔
 مزید شہرت کی خواہش اس کے اندر دم توڑ چکی تھی۔ دعوت ملنے سے اب بھی ملتے لوگ تقریبات منعقد کر کے اس کی شہرت کو کیش کر دینا چاہتے تھیں۔ وہ پہلے والی روایتیں تھیں۔
 ڈاکٹر انجم انگلینڈ میں ہی تھے۔ وہ ان کے پاس آتی جاتی رہتی۔ وہ اب ٹھکنے لگے تھے۔ اب ان کی ایک ہی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنے وطن کو دیکھ لیں۔
 ان دو دیوار کو چھو آئیں، جہاں اقراء کی یادیں سانس لے رہی تھیں۔ جہاں ان کے بہت سے خوب صورت شب و روز بھرے پڑے تھے۔ لیکن پاکستان واپسی کے نام پر پروا کو غصہ آجاتا۔ اس نے کہا تھا ”اپنا آپ بے شک پاکستان چائیں، میں نہیں جاؤں گی۔“
 انھیں اکیلے جانا نہیں چاہتے تھے اور وہ تیار نہیں تھی۔
 وہ اپنی صدمہ پوری طرح ڈٹی ہوئی تھی۔ جب اس کے بوسٹنگ آرڈر آگئے، سفارت خانے والوں نے اسے پاکستان تعینات کر دیا تھا۔ وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر حکام بلانے اس کی درخواست رد کر دی تھی۔
 ڈاکٹر انجم بہت خوش تھے۔ پروا کو بے شکل تمام راضی کیا تھا۔ ورنہ اس نے ریزائن دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ریاض احمد اور ان کی بیوی نے بڑے خوب صورت طریقے سے دلائل دے کر اسے فیصل سے باز رکھا تھا۔
 فیصل واپس اسلام آباد آ گیا تھا، لیکن اوپر کی منزل پہ واقع اپنے بیٹے روم کو اس نے حملوانے سے منع کر دیا۔

تھک چکی منظر کے مشاہیر روم کو اس نے اپنے رہنے
 سونے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ رائے بڑھ
 میں لایہ کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس
 کی حسرت ہی رہی کہ اس بڑے روم کو دیکھنے جہاں فیصل
 پہلی بوی کے ساتھ رہتا تھا۔ فیصل نے شادی کے بعد
 اس کی جانب چھڑا دی تھی۔ وہ حمل طور پر کھیلو
 عورت کے روم میں ڈھل گئی تھی۔ اس کی بیٹی کی
 بال بون تھی۔ لیکن آج بھی اس کے دل تک رسائی
 نہیں پاسکتی تھی۔ وہ اسے خود سے بہت دور محسوس ہوتا
 تھا۔

عہدہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ فیصل کی ذمہ داریوں
 میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔
 ان دنوں سلوٹی بھی پاکستان آئی ہوئی تھی۔ پرواکے
 ساتھ فیصل کی جنون کی حدوں کو چھوٹی محبت سب کے
 ساتھ اس کے علم میں بھی تھی۔ اس نے کتنی بار اپنے
 طور پر پرواکے ساتھ رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ
 جواب نہیں دیتی تھی۔ تنگ آکر وہ خاموش ہو گئی۔
 فیصل اگر چاہتا تو اس کے پاس جاسکتا تھا۔ با آسانی اسے
 ڈھونڈ سکتا تھا۔ وہ کوئی عام مہم لوگ نہیں تھی۔ لیکن
 اتانے اسے توڑ دلا تھا۔ مگر جھگڑنے نہیں دیا۔ وہ آج بھی
 پرواکے سے خفا تھا کہ وہ چپ چاپ خاموشی سے اس کی
 زندگی سے نکل گئی۔ وہ اس سے لڑتی، جھگڑتی، زبردستی
 اپنی منوائی، تو وہ مان ہی جاتا، لیکن اس نے پولیٹ کر
 ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ شروع میں وہ شے میں تھا
 ٹھیک تھا، لیکن وہ اس کا غصہ اترنے کا انتظار تو کرتی کہ اتنا
 پیار کرتا تھا وہ اس سے تو کیا تھوڑا سا بھی غصہ کرنے کا
 حق نہیں تھا اسے۔ کاش! وہ صرف ایک بار اس سے
 کہہ دیتی کہ راجہ بے جو کہا ہے سب بھوٹ ہے۔ تو
 وہ سب کچھ بھول کر اسے سینے سے لگا لیتا۔ اسے سب
 سے دور لے جاتا۔ کوئی اپنے چاہنے والے ساتھ یوں
 بھی کرتا ہے۔
 وہ اسے بھی نہ ختم ہونے والی لذت کے سپرد کر گئی
 تھی۔
 صرف نیکم کے پاس اس کمرے کی چابی تھی۔ مینے

میں دو تین بار وہ خود اپنی نگرانی میں صفائی کروا کر بیٹے کی
 طرح لاک کر دیتی۔ اس کے علاوہ کوئی بھی اندر نہیں
 جاسکتا تھا۔ فیصل نے ہر چیز کو اس کے ہاتھ بندھ دیا۔
 پورے نو سال بعد اس نے پاکستان میں قدم رکھا
 تھا۔ وہ کل تو شادی کے بعد کراچی چلی گئی تھی۔ لیکن
 رطلابہ اور جہیز بھی وہ اس کی آمد کتنے ہی پہلے آئی۔
 بہت ہی جگہ رنگ کے کپڑوں لمبوس بنا کسی
 آرٹسٹ کے وہ بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ ساتھ
 کان گھاسی بھی جسم کی بیو لاری سے بے نیاز، کتنی خالی
 خالی اور ویران سی تھی۔ وہ اتنی کامیابیاں اور شرمیں
 سمیٹنے کے بعد بھی۔ رطلابہ اسے لپٹا کر ست روٹی۔
 "پروا! تم نے کیا حال بنالیا ہے اس عمر میں۔" وہ
 تاسف سے دیکھ رہی تھی۔
 "کیا ہوا ہے حال کو؟" وہ خود یہ قابو پا کے انہاں اس
 سے سوال کر چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ رطلابہ کچھ کہتی
 پڑوس سے کچھ عورتیں چلی آئیں۔
 ذرا تنگ روم میں ڈاکٹر انجم کے دوست آئے بیٹھے
 تھے۔ انہوں نے آنے سے پہلے اپنی آمد کی اطلاع دے
 دی تھی۔
 انجم خود کو بہت مسرور اور مطمئن محسوس کر رہے
 تھے۔ گھر کے دو دروازے کھلا پھرے جی اٹھے تھے۔ اس
 پڑوس سے بہت سے دوست احباب جمع ہو گئے تھے۔
 وہی اپنائیت تھی جو اس ماحول کا حصہ تھی۔ لیکن پروا
 بالکل خوش نہیں تھی۔ وہ خود کو بے چین سا پارہی
 تھی۔ رطلابہ کے کتنے سوالوں کے جواب اس نے ہوں
 ہاں میں دیے۔
 رات وہ اس کے پاس ہی رہی مگر بہت سی باتیں تھیں
 جو اس نے کرنی تھیں۔ رات کے کسی پہر اچانک
 بارش شروع ہوئی جس کا پتہ تب چلا جب وہ پوری رفتار
 سے برساتا شروع ہوئی۔
 رطلابہ نے کمرے سے پورے ہٹا دیے۔
 "پروا! بارہ دیکھو کتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔"

"ہاں رطلابہ! کتنی عجیب بات ہے" اندر بھی بارش
 ہو رہی ہے اور ہمارے۔" پروا کی آنکھیں چمک چمک پڑی
 تھیں۔ اس سے پہلے کہ رطلابہ کچھ بولتی اس نے مزید
 آواز نہ دی بلکہ دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 "آؤ نکلتے ہیں بارش میں۔" رطلابہ نے جھپٹے
 وقت کو تو اڑا دی تھی لیکن اس نے فقی میں سر ہلا دیا۔
 "کیوں؟" جیسے تو بارش بہت پسند تھی، اب کیا ہوا
 ہے؟" رطلابہ مسلسل اس کا شہنا آزار رہی تھی۔
 "بس اب نہیں ہے پسند۔ میری پسند وہ پتہ بند بدل
 گئی ہے۔"
 "کیوں پروا! پسند وہ پتہ بند بھی بدلتی ہے۔" اس
 نے اٹھاتے میں اس کی دیکھی رنگ پر ہاتھ رکھا تھا۔
 "پلیز رطلابہ! چپ ہو جاؤ۔" اس نے التجائیہ انداز
 میں اس کی طرف دیکھا تو رطلابہ کو بیچ اس پر ترس سا
 آیا۔
 "پروا! ہاں! کر جاؤ۔" سب سے مزاد سے لی ہے تم نے
 ٹوڈ کو اور اپنا صبر نہ آؤ۔ دیکھو خود کو۔ تمہارے بالوں
 کی رنگی نہایت کیا ہوئی۔ تمہاری آنکھوں کی وہ
 ہلک سی گہرائی، تمہارے چہرے کی لمبائی کیوں کم
 ہوئی ہے تمہارے قدم نے تحقیق کا عمل کیوں ترک
 کر دیا ہے۔ کمال گئی تمہاری وہ خوش لباسی کیوں رنگ
 دھجھ گئے ہیں تم سے؟ کمال گئی تمہاری کشش ہٹاؤ تا
 جواب دو۔"
 "پلیز رطلابہ! میں بہت لمبے سفر سے آئی ہوں تھکی
 ہوئی ہوں، سوئے دو مجھے۔" اس نے نظریں چرائی
 تھیں۔ لیکن رطلابہ اتنی جلدی پارہانے والی نہیں
 تھی۔

پروا نے دو ہفتے بعد آفس جوائن کرنا تھا۔ رطلابہ روز
 آجائی۔ لہٰذا کل کو بھی کراچی سے بلوایا گیا تھا۔ میڈیا کو
 بھی پروا کوڑھل کی آمد کی سن کر مل گئی تھی۔ وہ جس
 چیز سے بچتا چاہی تھی وہ ہو کر رہی۔ عرفان بالیل نیازی
 نے سب سے پہلے رابطہ کیا۔ انہوں نے اپنے طور پر

ادب کی ترقی و ترویج کے لیے ایک انجمن بنائی تھی اور
 وہ اس کا چیئر مین پروا کوڑھل گل کو بتا چارے تھے، لیکن
 اس نے معذرت کر لی۔ انہوں نے بھی اپنی کوششیں
 جاری رکھی۔ پروا اس دوران جلال صدیقی اور اس جیسے
 کمال ہو جانے والے پرستاروں سے نمٹنا اچھی طرح
 سیکھ گئی تھی۔ اس نے عرفان بالیل نیازی کی آخری
 کوشش بھی ناکام بنا دی۔ ایک دن پراسیوٹ فی وی
 چیٹلر کے نمائندے کے سامنے سمیت گھر پہنچ گئے۔
 اس نے انٹرویو دینے سے انکار کر دیا۔ اپنی جگہ اپنی
 تقریبات پروا کوڑھل کی تحقیقات سے سچا چاہ رہے
 تھے۔ اس نے ہر ایک کو سختی سے انکار کر دیا۔

"ہیلا! انجم اکل واپس آگئے ہیں" میں نے ان کا
 کیلنک دیکھا کھلا ہوا تھا۔ "کھانا کھاتے کھاتے حنان کو
 یہ بات یاد آئی تھی۔ فیصل کا ہاتھ پلیٹ میں ہی ساکت
 ہو گیا تھا۔
 "تم نے نہیں جاکر؟" تڑپ لگاری کے لیے میں
 جوش قلب سب حنان کی طرف دیکھ رہے تھے۔
 "میں کیلنک گیا تھا، لیکن وہ تو ڈیوڑھی پہنے ہوئے تھے
 کے لیے نکلے تھے، اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی۔"
 اس نے فیصل کے ہاتھ میں واضح اور تقاض محسوس کیا
 تھا۔ وہ کھانا اور چائے ڈکرائے گیا۔
 ان سب نے ہی اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ کو
 دیکھا۔
 نیکم میں تھیں، تڑپ سی گئیں، باقی تھیں اتنا اور
 خندنے لے اندر ہی اندر تو ڈر کر رکھ دیا تھا۔

موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ آسمان پہ
 کالے لیل تیرتے پھر رہے تھے۔ فضا میں اڑتے دنوں
 سے جو مٹن اور اواسی تھی اس کا خاتمہ ہوتا نظر آ رہا
 تھا۔ انجم صاحب حسب معمول اپنے کیلنک اور
 مریضوں کے ساتھ بڑی تھے۔ پروا گاڑی لے کر گھر
 سے نکل گئی۔

یوہی ڈرائیو کرتے کرتے وہ راول ڈیم کی طرف نکل آئی۔ اسے راول ڈیم کا یہ قدرے الگ تنگ سا حصہ بہت پسند تھا۔ اس نے گاڑی دریا پارک کی اور خود پانی کی طرف اگر ایک پتھر پھینک دیتے۔ بہت خاموشی اور سکون تھا اور لوگ بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ پتھر نیچی صاف شفاف پانی کو دیکھ رہی تھی۔ جب اپنے پیچھے اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس کے دھنسنے سے پہلے ہی وہ سامنے آگئے۔ وہ دو لڑکے تھے۔ انھارے سے بیس سال کے درمیان۔ چہرے پر سفاک تاثرات تھے۔

”ہو چکے بھی ہے خاموشی سے ہمارے حوالے کر دو اور اگر شور کیا تو یہ گولی کھڑی کے آریار ہو جائے گی۔“ وہ آہستہ مگر خوف ناک آواز میں بولا۔ دوسرا پروا کو لیتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سم کی گئی۔

”میرے پاس تو کچھ نہیں ہے ہاں میرا سیل فون اور بیک گاڑی میں رہا ہے۔“ وہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ ”کہاں ہے گاڑی؟“ ان میں سے کئی شرٹ والا بولا۔ پروا کو لڑکی ایک تنگ دھڑک دھڑک کر خوف زدہ کرنے کے بعد وہ اب اسے دوبارہ شرٹ کے نیچے چھپا کر تھا۔ ”میری گاڑی وہ سڑک سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہے۔“ اس نے وہیں سے اشارہ کیا تو ان دونوں کی نگاہوں نے اس کی بتائی جگہ کا تعاقب کیا۔ گاڑی دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”یہ تو اچھی خاصی موٹی آسامی ہے اسٹو!“ ریڈ چیک شرٹ اور نیچی جینز والے نے بڑے بے ہودہ انداز میں آنکھ دھائی تو وہ اور خوف زدہ ہو گئی۔ ان دونوں کے تپور قطعاً ”اچھے“ نہیں لگ رہے تھے۔ گاڑی سے موبائل اور بیک اٹھا کر پروا نے ان کے حوالے کیا۔ مگر ان کی نیت میں فتور آچکا تھا۔

پروا دونوں پتھر ان کے حوالے کر کے جو نی باہر نکلی ریڈ شرٹ والے نے آنکھوں آنکھوں میں ہی دوسرے کو اشارہ کیا۔ اس نے پروا کا بازو پکڑا اسے دوبارہ گاڑی میں دھکیلنے کی کوشش کی۔ ان کے منہ موم

عزائم ایک بل میں جکڑ گئی تھی۔ پروا نے شور مچا دیا۔ وہ دونوں قطعاً ”اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ منظر پاس سے گزرنے والی ایک گاڑی میں بیٹھے اس شخص نے بھی دیکھ لیا۔ اس نے مزید ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور ان کے سر پر پتھر گرایا۔ ان دونوں کو اپنے ہتھیار نکالنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ اس دوران کچھ اور لوگوں کو بھی گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا۔ صورت حال کا پتا چلا تو وہ بھی قریب آگئے تھے۔

ان دونوں کو بے بس کرنے کے بعد کسی فرشتے کی طرح نازل ہو جانے والے شخص نے قریبی تھانے میں فون بھی کر دیا تھا۔

ان سے ٹھننے کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھی منہ چھپائے روٹی ہوئی پروا کو لڑکی کی طرف کیا۔ وہ لاکھ اپنی سسکیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن نہیں کیا رہی تھی۔ آنکھیں تو شدت منہ سے اس کی بھی لال ہو رہی تھیں، لیکن وہ مروتا ہوا دیکھا تھا۔

اس کی اس اور لوگ بھی کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے پاس آگے۔ پروا ڈرائیو تنگ سیٹ سے اتر آئی تھی۔ وہ جانتا تھا اس خدی سی پروا کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ وہ اتنے سارے لوگوں میں تماشا بننا نہیں چاہ رہا تھا۔ سو پروا بڑے آرام سے گاڑی ڈرائیو کر کے وہاں سے نکل آئی تھی۔

فیصل لغاری نے آنکھوں کی سرفی چھپانے کے لیے ڈارک گلاسز چھالے تھے۔

وہ گاڑی گیٹ پر ہی چھوڑ کر خود اندر آئی تھی۔ انجم صاحب ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ اور پروا کے واپس آنے کی بارش پر سنا شروع ہو گئی تھی۔

آنکھیں اس کی بھی برس رہی تھیں وہاں میں ہی بیٹھی تھی۔ اب بارش کے قطرے اور اس کے آنسوؤں میں فرق نہیں رہا تھا۔

فیصل لغاری نے پروا کی گاڑی کے ساتھ ہی اپنی گاڑی بھی پارک کر دی۔

پروا ابھی تک گیسٹ میں کئی چھوڑ گئی تھی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ شاید اسے بند کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ ان تک آتے آتے وہ بھی جھجک چکا تھا۔ وہ چکر پیڑھیوں کے پاس گھٹنوں میں سر دیے دو رہی تھی۔ پتھر کے اس کا پروا وہاں رہا تھا۔ ابھی ڈرائیو کھنڈ پہلے اس نے اپنے سامنے فیصل لغاری کو دیکھا تھا۔ جیسے جیسے فیصل کو۔ وہ پہلے سے بڑھ کر چند لمحوں اور ڈینٹ لگ رہا تھا۔ پروا کو تو اپنی آنکھوں پر اب پتھر نہیں رہا تھا۔ جب وہ گاڑی میں اس کے قریب بیٹھا تو اس کے پاس سے وہی جالی پانی ملک آ رہی تھی۔ اب تو اسے یقین کرنا ہی تھا۔ پروا نے نو سال بعد وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ کتنا گھبراہوا سا تھا وہ۔ اور وہ خود اپنی اور انتظار کی انتہا سے کہتا تھا۔ کیا ہے کیا ہو گئی تھی۔ اور وہ تک سب سے تیار خدشوں میں بسا ورنہ لڑکی کی طرح جاذب نظر لگ رہا تھا۔ اس نے کتنا کچھ گھوڑا تھا اور دوسری طرف کچھ دیکھ کر اسے انتہا محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ احساس دیاں ہی دیاں تھا۔

وہ حوازن قدموں سے چلتا پروا کے پاس خود بھی گئی پیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

”پری! آؤ گئے گھر ملیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ ان نو سالوں میں پروا کے آنسوؤں نے اسے بہت ادبی تھی۔

”کون ہے گھر؟“ اس نے تپ کر گھٹنوں سے سر اٹھایا تھا۔

”بے گھر اتنے سال بعد؟“

”ہاں پری! اپنے گھر۔“ تب پروا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اونچا سا بچہ والا فیصل لغاری خود بھی رو رہا تھا۔

”آپ مجھے ڈھونڈ لیتے نا!“

”آج ڈھونڈ لیا ہے نا!“

”بہت دیر لگادی واپسی میں۔“ پروا نے نو سال فیصل نو سال کا انتظار تم نے میرے نصیب میں کھلنا مجھے میرا جرم تو بتاتے تھے۔ تم نے تو مجھے اپنی زندگی سے ہی نکال دیا۔ اس طرح جیسے میں کبھی تھی ہی نہیں۔“

”سب کچھ بتا دوں گا میں تم جلدی سے تیار ہو جاؤ“ صرف پانچ منٹ ہیں تمہارے پاس۔“ اس نے بڑی تیزی سے فیصلہ کیا تھا۔ پروا اس کی محبوب بیوی تھی۔ وہ اسے دوبارہ گھوڑا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی انا پندی نے پہلے ہی اسے بہت دکھ دیے تھے۔

فیصل اور وہ مرکزی گیٹ سے آٹھ اندر داخل ہوئے تھے۔ سلوی اور دتر سوار بیٹھی موسم کا منہ لے رہی تھیں۔ یہ منظر ہی حیران کر دینے والا تھا۔ پانچ منٹ سے بھی کم میں گھر کے سب افراد سوائے لائیو کے جمع ہو کر پروا کو گھر میں لے گئے تھے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ پروا انیم کے گھر سے لگی رو رہی تھی۔ غلام کی بھی یہی حالت تھی۔ منور انیم نے کتنی ہی دعا میں اسے دے ڈالی تھیں بے غرض اور بے لوث۔ جن کو سب سے آخر میں پتا چلا تھا۔ وہ مضامی لے کر گھر آیا تھا۔ راجہ ابھی تک اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ پروا کے لیوں بہت سے سوال تھے۔

ایمان شور سے جاگ گئی تھی۔ اس کی نیند ایسی ہی تھی۔ لائیو نے اٹھ کر اس کا منہ ہاتھ دھو لیا اور باہر نکلی۔ گھر والے سارے ہال میں جمع تھے۔ لگتا تھا کوئی مہمان آیا ہے۔ وہ ایمان کی انگلی پکڑے ہال میں آئی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی خاموش چھا گئی جیسے سب کو سانپ سوجھ گیا ہو۔ وہ ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ لائیو پروا کو دیکھ کر تنگ سی گئی تھی۔ یہ صورت اس کے لیے جالی پچھائی تھی۔ پروا کو وہ

اسے اپنی ہتھیوں میں بیٹھ کے لیے قہر کر لیتا چاہتی ہو۔
پھر لہوں سے گویا سر سرائی ہی آواز نکلتی تھی۔
”بس فیصل! تمہیں رُک جانا۔ تمہاری زندگی میں
میری کوئی مداخلت نہیں۔ اب کبھی میرے پیچھے نہ
آنا۔ تم جانتے ہو میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گی۔“ وہ
بڑھاپہ قدموں سے چلتی دروازہ عبور کر گئی۔



اور اپنے گھر کی بنی سیڑھیوں پر بیٹھی وہ گویا اپنا
احتساب کر رہی تھی۔
”میں شہرت کی چمک دمک میں کھو کر پہلے ہی اپنا
بہت نقصان کر چکی ہوں۔ اور شاید تمہارے بے پناہ
پیارے بیٹے ہی مجھے بے جا احمق بنا کر چاہے کچھ ہو جائے
میرے لیے نہیں رہ سکتے۔ اپنی بے جا انا اور نام
کمانے کے پیکر میں نے تمہیں کھو دیا۔ اپنی زندگی
کھو دی۔ اور اب میں یہ ہی دکھ تمہاری بیوی کو دوں؟
اس کا کیا قصور ہے؟ اور تمہاری بیٹی؟ ایک بنا ہوا مرد
انصاف کیسے کہہ پائے گا؟ نہیں۔ میں ایک اور گھر
اجڑے نہیں دوں گی۔ میری بے لگام خواہش اور انا کی
سزا مجھے ہی ملنی چاہیے۔ اس میں ان کا حصہ کیوں ہو؟
ایک اور غلطی۔ میں ہرگز نہیں۔“ آنسوؤں کا چھو
بھگوتے رہے۔ پھر جیسے تھک کر دیوار سے سر ٹکا دیا۔

شہر آزاد کو کھلتی ہوئی کھڑکی کی جھلک
آنکھوں کو جھگوٹی ہوئی آواز رہا
دوش دیوار پہ بے زار کھڑکی کی تک تک
میرے انجام پہ رو تا ہوا سانسیوں کا ستار
ٹوٹی الماری میں کچھ بے ہوش چاہت کے نقوش
رہیں کرتی تھائی کے بیا سے سائے
اور میں ہوں اکیلا بہت
ان سایوں کے درمیان



ٹی دی۔ دیکھ چکی تھی۔ اس کی کتاب کے نیک ناسل
پہ اس کی تصویر چھپی وہ دیکھ چکی تھی۔ فیصل کے بس
اس کی کتابیں موجود تھیں۔ وہ خود فیصل کے دل میں
تھی۔ تو وہ اس وقت اسے کیسے نہ پہچان پاتی۔ لمبے کے
بڑا دوسرے جسے میں اس نے جانچ لیا تھا کہ یہ وہی ہے
جس کی تلاش میں فیصل اس سے صدیوں کے فاصلے پہ
ہے۔

ایمان اس سے ہاتھ چمڑا کر ایک دم فیصل کی طرف
بھاگی۔

”ایمان! یہ کون ہیں اور وہاں کیوں رو رہی ہیں؟“ وہ
فیصل کی گود میں بیٹھ گئی۔ چپ پروا بے ساختہ چلی۔
”ایمان! بولیں تا یہ کون ہیں؟“ خاموش بیٹھے فیصل
سے اس نے دوبارہ سوال کیا۔ لائیبہ دروازے میں کھڑی
دیکھ رہی تھی پروا کی نظر ابھی تک اس پہ نہیں پڑی
تھی۔ سب کے سب سانس روکے فیصل اور ایمان کی
طرف دیکھ رہے تھے۔ تب لائیبہ چھوٹے چھوٹے قدم
اٹھاتی نکل گئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے پڑی اونچی آواز میں سلام
کیا۔ وہ پروا کے سامنے کھڑی تھی۔ فیصل نے ایمان کو
گود سے اُتر دیا تھا۔
”یہ وہی شہزادی ہیں جو بہت پہلے کم ہوئی تھیں،
میری غلطی کے سبب۔ میں ایسے وضو نہ کر لے آیا
ہوں۔“ فیصل کی نگاہ پروا پہ جمی تھی جو بڑی حیرانی سے
ایمان کو دیکھ رہی تھی۔ کتنے سارے سوال تھے اس کی
نگاہوں میں۔ فیصل کو اپنا آپ مل صراط پہ محسوس
ہوا۔

”پری! یہ میری بیٹی ایمان اور یہ لائیبہ ہے۔“ اس
نے تعارف کا کار فرما کر اپنے خود ہی انجام دیا۔ وہ حیرت
سے چیخے ہوئی اور پھر وہیں سے قدم تیز تیز کھینچتی باہر
نکل گئی۔ وہ اس کے پیچھے پکا۔

”پری! پلیز رُک جانا۔ اب مجھے چھوڑ کر نہ جانا،
میں پہلے کی طرح اکیلا نہیں ہونا چاہتا۔“ اس نے پروا
کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ اس نے آہستگی سے اپنے بازو
چمڑائے اور پھیل چکوں سے اسے دیکھا۔ یوں کہ جیسے

تمہیں لاکھ سویرے

"اگر تم روسی" ایمیل "پڑھنا تو تمہیں احساس ہو کہ وہ لوگ جو نامراد نظر آتے ہیں ان کی مدد میں کتنے طوفان ہوتے ہیں اور یہی طوفان اکثر روسی طرح انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔"

عکرمہ رسول کے سب سے بڑے طوفان میرے ساتھ فیضی روحا ویشن 'عائشہ اور احسن کو بھی چھوٹا گیا۔

"لیکن اس کے باوجود وہ تمام عمر تشویش ہی ہاں اور ناں کی کیفیت میں رہا۔" وفا بھی کسی طور مٹنے کو تیار نہ تھی۔

"ہاں اس کے باوجود بھی قریب کاری / رسم پرستی اور مصنوعی زندگی سے نفرت اسے ایک آئینہ فلسفہ بنانے میں نمایاں تھیں۔"

"بہت مچھلی ہے" یہ روحا کے ریمارکس تھے۔ "لیکن بہر حال ہے بہت اچھا۔" فیضی اس سے بہت متاثر تھا اور شاید ہم سب ہی۔ میں نے دیکھا وفا باشی کتابیں اٹھائے انٹرنیٹ کی طرف جارہی تھی۔

"چلو۔ کیا آج سرخف احمد کی کلاس گول کرنے کا ارادہ ہے؟" ویشن اٹھا تو ہم سب ایک ایک کر کے چل دیے۔ "آخر عکرمہ رسول اے جانے کے بعد سب پوریوں ہو جاتے ہیں؟" میں نے بیٹھ کر تنگ نظری سے سوچا۔

نیا ولیٹ



<http://pakfunplace.blogspot.com>

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

حسب معمول آج پھر وہ سرائی رضوی سے بحث کر رہا تھا۔
 ”لیکن سرائی آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں خصوصی طور پر تعلیمی اصلاحات وقت کا تقاضا ہیں۔ اب تک ہم صرف خلی خلی الفاظ کا سارا لیے ہوئے ہیں۔“

سر رضوی اس کا لفظ لفظ یوں غور سے سن رہے تھے جیسے اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے ایک ایک حرف پی رہے ہوں۔

”یہ ہمارا الیہ ہی تو ہے سر کہ باقی ترقی کی چیز چمک نے ہماری اخلاقی اسلامی تعلیمات کی آنکھوں کو خیر و کر دیا ہے اور ہم کسی اندھیری رات کے مسافر کی طرح اپنا صحیح راستہ کھو کر بھٹک رہے ہیں۔“ کھٹکھٹا لہجہ اس کی میراث تھا۔

”ایسا نہیں ہے سر۔“ وقفا بھی تو جیسے اس کی بات رد کرنا فرض سمجھتی تھی۔ ”اتنے سارے لوگ جو جدوجہد کر رہے ہیں اس طرح کہہ کر ہم ان کے جذبے کی توجہ نہ کر رہے ہیں۔ کوئی ایک شخص بھی کچھ کر رہا ہو تو یہ کتنا غلط ہو گا۔ یہاں تک کہ ہم نہیں ہو رہے۔“

”مجھے علم ہے۔“ عکرمہ رسول نے بات کٹی۔ ”میں مانتا ہوں کہ لوگ لٹے ہیں مگر مغرب کی اقوام کا سارا لے کر۔ کون ہے جو غلہ بن ولید ہو گا کون ہے جو غازی علم دین بن گئے آیا ہو؟ ہم بہت کچھ کئے کا تو جذبہ رکھتے ہیں مگر کچھ کرنے کا نہیں۔ ہم کتابوں میں بھی مغرب کے مہیون منت ہیں۔ ہمیں غر سے ریاکاری کے لیے نہیں علم کے لیے کتابیں پڑھنی ہیں۔ ہم علم کے لیے کورو نائیک کی ”گرو گرنیہ“ بھی پڑھیں گے اور سیدنا غوث الاعظم کی ”فتح ربانی“ بھی۔“

وہ بغیر کوئے نفل اسید کوئل رہا تھا۔ جب وہ بولتا تھا تو سنا ہوا جانا تھا۔ اسے پہنچ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے غصے والا لہجہ پروفیسر کو بھی بچ کر دیتے تھے۔

”ہوں۔“ کٹی دیر بعد سر کی کواز کٹی۔ پھر بھی ہمیں یہ ماننا ہے کہ ہم آگے آ رہے ہیں۔ ہم باپوس

نہیں ہیں۔“
 ”لیکن سر۔“ وہ پھر تن کر کہہ رہا تھا۔ ”ہمیں باپوس ہونا بھی نہیں ہے کیونکہ انہی دگر یوں کے پیچھے ہماری وہ وقت کی مدنی رہی ہے۔ شاید ہم متوطن نہیں ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ پھر بیٹھ گیا۔ اور میں سوچتا رہا کہ جب عکرمہ رسول مانتا بھی ہے کہ ہم صرف کہہ سکتے ہیں لیکن نہ کر سکتے پر مجبور ہیں پھر بھی یہ کہنے پر مجبور کیوں ہے؟

کہنے کو عکرمہ رسول پوری دنیا میں بیٹنے والے ہر انسان کو دوست کہتا تھا لیکن میں اور وقفا بھی اس کے ایسے دوست تھے جن سے وہ بیشہ لاپرواہی برتا تھا۔ اس لحاظ سے ہم اس کے ”خاص“ میں سے تھے وقفا باپوس اس کی انکوریس سے بہت لاپرواہی برتی تھی اور خود ماتھے پر ”تولفت“ کا بورا چپکا جاتی تھی جب کہ میں اس کی انکوریس سے انتہا شرب ہو تھا کہ دعا مانگتے گنا تھا۔ ”یا اللہ وہ ریٹان ہو اور میرے پاس بٹکا ہونے کے لیے آئے کیونکہ وہ جب بھی ریٹان ہوتا تھا میرے پاس ہی آتا تھا اور اس لحاظ سے میں اس کا بھری دنیا میں ”واحد خاص“ تھا۔

”ہیلو! وقفا کی آواز نے مجھے چونکایا۔
 ”ہائے ڈریم گرل۔“ میں بیشہ موڈ میں اسے یہی کہتا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟ کیا گھاس پہ کوئی رس بچ و فیو؟“ وہ اپنی لمبی خوب صورت آنکھیں حیرت سے پھیلاتے ہوئے بولی۔

”او نہیں۔“ میں نے ہاتھ میں پکڑا وہ گھاس کا تھکا زور سے پھینکا جسے جانے کب سے میں دونوں ہاتھوں میں لیے موڑ رہا تھا اور جس کی ذات کا احساس مجھے دفعتاً دلایا۔

”کیا سوچ رہے تھے؟“ وہ میرے قریب بیٹھتی ہوئی بولی۔

”کچھ نہیں شاید بہت کچھ۔“ میں ہنسا۔
 ”یہ ڈیل مائنڈ ڈونے کی کوئی خاص ٹنگ؟“ وہ غور

سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ میرا پی چاہا کہ وہ کہہ کہہ جاں تم جب بھی میرے پاس ہوتی ہو میں ڈیل مائنڈ ڈونے جانا ہوں اور یہ تعلو کی کیفیت مجھے بھی روسو کی طرح تاثر دینے دے۔

”نہیں کوئی خاص نہیں یا شاید کوئی ہاتھ ہو اس کے پیچھے۔“ میں نے پھر بھی وہ براہوس ہر لیا تو وہ بیٹنے لگی اور میرا پی چاہا وہ جتنی رہے اور وقت گزر رہا ہے۔ ”پولیو اور وقفا۔“ عکرمہ باپوس نے حسب معمول مہا میں مجھے شمار کے بجائے یار کہا۔

”ہیلو جان کیسے ہو؟“ میں نے اس کی بد اخلاقت نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے وہ ڈیل کی طرح متحرک۔“ وقفا اس کی انقلابی سوچ کو کھیر کھیر کر نشانہ بناتی رہی اور وہ ستارہ۔ ”سوسوفا ایک دو ترم اپنے اس ناچیز دوست پر غر کر گئی کہ یہ بہت ہی میرا دوست بھی رہ چکا ہے۔“ وہ بیٹنے پر ہاتھ دکھ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے یقین سے بولا۔

”اوسے جاؤ ہیرو۔“ اس نے طہرے کہا اور عکرمہ رسول کے مہلکی سے بیٹنے میں حیران ہو رہا۔
 ”باپوس کیسے؟“ وقفا نے پھر جھڑپ۔

”ہاں۔“ برائیوں سے گھر لینا اگر بدلتی ہے تو میں باپوس ہوں۔“ اس کے لہجے کا یقین کسی کو بھی چونکا سکتا تھا۔

”دیکھیں گے دیکھیں گے“ کہیں ٹھیک ہے ناراجہ شہسار؟“ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ میں نے مسکراتے پر آٹھا کیا۔

پھر پلا کے حکم کے مطابق میں ڈیمینوں پہ قصور چلا گیا۔ ہفت بعد دو ناؤ جیسے نو نو دہائی میں ہو چکا تھا۔ وقفا عکرمہ رسول نے سر جوارف مہلکی کے ساتھ مل کر ایک نئی تحریک ”الحزم“ کی بنیاد رکھ دی تھی جو بہت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ویسے بھی ہم یں چیز کو جلد ک کر لیتے ہیں۔ ہر ایک یکسانیت سے گھبرا جاتا ہے یا شاید ہم انقلاب چاہتے ہیں۔ میں نے بیشہ کی طرح دو باپوس سوچیں عکرمہ رسول ایک دم ہی بہت

مصروف ہو گیا تھا۔ اس کی شاہیں ہم سے کپ شپ لگاتے تھے۔ ”الحزم“ کے آفس میں گفتات سیاہ کرتے ہوئے گزرتے تھیں اور میرے دن وقفا بھی کے قریب سے قریب تر۔ عکرمہ رسول نے مجھ سے بہت کہا کہ ”الحزم“ جو ان کر لو۔ مگر میں پلا کو دیے وعدے کے عین مطابق اسٹڈی میں مصروف رہا اور اس سے زیادہ مصروف اس ڈریم گرل کی سوچوں میں۔ ان دنوں ایک سوچ مجھ پر حاوی ہو چکی تھی کہ ”اگر میں وقفا کو نہ پا سکتا تو؟“ اور اس تو سے آگے سوچنا میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ مجھ پر کچھ طاری ہو جاتی جیسے کلہوشتو کا کوئی بڑا توہ جھ پر آن گرا ہو۔ مگر بڑی الجھن میرے لیے یہ تھی کہ میں اس سے اٹھتا نہیں کر پاتا تھا۔ میرا بہت ہی چاہتا تھا کہ اسے بتا دوں۔

”میں راجہ شہسار تمہیں اپنے کمر میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں وہ جو سڑک کے آخر میں ٹیڑھ منڈ تھا سار دھت ہے اس کے نیچے آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گا۔ پھر یہ کہ اسے لیڈر دن ہنری کی وہ نظم سنائیں کہ۔

”تمہارے بغیر میری ہر جگہ ایسے ہی ہو گی جیسے مجھنی کے بعد کلام کلام
 تمہارے بغیر میرے پاس وقت اور دولت ہو گی بغیر مصروف کے

اور تمہارے بغیر اخبار کار تکین ایڈیشن بلیک ایڈر وہاں نہ کھلی دے گا۔“

مگر میں بھی کچھ نہیں کہہ پلا۔ ایسا نہیں کہ میں بد صورت ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ میری روشن روشن اور بدامنی آنکھوں کے ست سے ”پرستار“ ہیں۔ کھنی مونچھوں کے نیچے بیٹے لب اور لب مروان وقفا اور لب واجد مجھے دو سروں سے قلمباز رکھتا ہے اور یہ بھی کہ میرا اندر بہت خوب صورت ہے نرم اور گداز ہے خود قلمباز نہیں بلکہ خود شناسی ہے مگر یہ سب مجھے نہیں بتاتا۔ اسے خود جانتا ہے۔ میں حرف تراشا ہوں۔ وہ سن کر حیران بھی ہوتی تھی۔ لیکن جو میں نے کہہ دیا کچھ تو وہ ہنس دے گی کہ ”دیکھو عکرمہ رسول! یہ راجا

لےنا پودا نکلا۔ بہت عام کہ ذرا سے مل بیٹھنے کو محبت کہنے لگا ہے۔ "میں اس کی طنزیہ جہی سے خوفزدہ تھا۔"

”العزم“ کے کارکنوں کی محنت سے یہ تحریک کامیاب جاری تھی۔ یہ واقعی ایک انقلاب تھا کہ یونیورسٹی کی ٹراسپورٹ میں تقریباً چار نئی بسوں کا اضافہ ہوا تھا۔ کینٹن میں چیرس کرسی تو نہیں البتہ صاف ستھری اور معیاری نظر آنے لگیں اور یہ کہ چند عاشقِ قسم کے مشنرے بغل رو حاکم ”بے چارے“ لڑکیوں سے برعزیزی کرنے کے عوض جیل کی ہوا کھانے چلے گئے تھے۔ ان میں بہت زیادہ اہم نام کاشف رضا تھا جو کچھلے پانچ سال سے یونیورسٹی میں مقیم تھا اور اپنے کئی فیکلٹیز کے مالک باپ کی جائداد پر عیش کے نام پر عورتیں نیلام کر رہا تھا اور جسے گرل اسٹوڈنٹس ”ریڈ سٹکل“ کہتی تھیں۔ اس سے سکرمہ رسول نکرایا تھا اور بلا آخر اسے نکلوانے میں کامیاب ہوا تھا۔

آج پھر ایک اہم اجلاس تھا جس میں مجھے وفا کے
 کئے۔ "شرکت کرنا پڑی۔ ذاتی طور پر میں بھی "العوام"
 کی کارروائی سے مست سزا ہوا تھا۔ سر عارف مہتابی
 کے چند ابتدائی کلمات کے بعد وہ اسٹیج پر نمودار ہوا تو
 جیسے پورا روی ہل تلیوں کی آواز سے کھڑکھڑانے لگا۔
 "شکر ہے۔" اس کی کھنٹی ہوئی آواز نائیک میں سے
 ابھری۔ "العوام کی کچھ عرصے میں کامیابی نے ہم سب
 پر یہ روشن کر دیا ہے کہ ہمارے اندر رہتی کی کمی نہیں،
 بس پہل کی کمی ہے۔ اگر کوئی ایک آگے تن جاتا ہے تو
 پھر پیچھے لائیں لگ جاتی ہیں، قیض زندہ جاتی ہیں۔
 ہمارے پاس جذبے کی کمی ہرگز نہیں۔ جب انقلاب
 آتا ہے تو پھر ہم نہیں ہماری رو میں دوڑتی ہیں اور پھر
 جہاں ذہن آزاد اور صاف ہوں وہاں انقلاب آتے دیر
 نہیں لگتی۔"

وہم بھر کورک "یہ سب ہم نے تمہیں ہمارے اللہ
نے کیا ہے۔ جب برائیاں حد سے بڑھنے لگتی ہیں تو پھر

کوئی نہ کوئی ابراہیم ڈٹ جاتا ہے پھر آگے سب اللہ
 کرتا ہے وہ خود کہتا ہے کہ تم میرے لیے سر ہو تو مجھ پر
 قصاص یا عدت فرض ہو جاتا ہے اور ہم اس سوچ پر خود
 کو پابند نہیں کر سکتے کہ یہ ہم ہیں جو انقلاب لائے
 بلکہ ہوں کہنا چاہیے کہ ہمارے اچھے مقدر ہیں کہ خدا
 نے ہماری تقدیر میں انسانیت "خلوص اور عاجزی
 لکھی۔"

ہاں میں تالیوں کا شور تھا۔ وقائع نامی سے لگا ہوں
 جہانے اسے دیکھ رہی تھی شاید اس کے ذہن میں جی
 عکرمہ رسول کے انقلابی نعروں کو گونج رہے ہوں گے۔
 میں حیران ہو کر رہا تھا اور کوئی طاقت مجھے وہاں پہنچانے
 لے گئی جہاں عارف صبا لگوں کوں سے چپکے اور کیش
 وصول کر رہے تھے۔

ایک وقت ہو وقت محیط ہوتا ہے

اور میں اس محیط میں رہ رہا ہوں مگر شعوری طور پر کسی ان دینی طاقت کے زیر اثر۔"

دور ریڑھیوں پر باندھ اور نشان سے باتیں کرتی
 ہتی کھلکھلائی دغا بازی آخر میں اسے توڑ دیں اچھی
 لگتی ہے، اگر اچھی لگتی ہے تو میں اسے بتا دیں نہیں
 بتا دیں یہ تو میں کہ میں اس سے مادی حیثیت میں کسی
 طرح سے کم ہوں۔ کئی ایک زمین، کئی آنکھ کی
 کلاؤں اور پانچ کنل میں پھیلے ہوئے اس عایشان
 راجا بھائی کا واحد مالک میں راجا شہر اس کامی
 ازک سی گڑیا کے لیے میں سے وہاں تک بولایا بولایا
 بھڑا ہوں۔ جی چاہتا ہے اسے اپنا ملک نام ہی ہو جائے
 پھر میں ہی برادری سے اس کا ہاتھ پکڑ کر عکرمہ
 رسول کی طرح انقلاب برپا کروں دل کی دنیا میں اس
 سے کہہ دوں کہ سنو دغا بازی۔ ہم جو بدی کے دو
 نناروں کی طرح ساتھ چل رہے ہیں ہم شستی میں بیٹھ
 کر اٹھیں اس قابلے کو پاٹ دیں اور وہاں تک جا میں
 دل تک یہ کوئی تقدیریں اپنے گھر اپنے اصل کی

طرف یا پھر یہ کہ ”یہ جو ہمارے درمیان خاموش
صکنت کا سحر اچھل گیا ہے اس کو مل کر طے کر لیں
اور بھاگتے ہوئے آن لائن اور انٹر نیٹ سکا مندر میں
تو پھر راستے میں ہی کسی جگہ گر کر ہانپتے ہانپتے مر
جائیں۔“

”سنو“ وہاں بھی نے جیسے پکارا۔ میں نے سر اٹھایا۔
کیا وہ زور زور سے اڑی رنگت کے ساتھ جیسے بھاتی
ہوتی مجھ تک آئی تھی۔

”علم و رسول کو کوئی مار دی کئی۔“ میرے تو جیسے
 جو اس ہی گم ہو گئے۔

”کب؟ کہاں؟“ میں نے بے حد کھرا لڑپو چھا۔
”کسی نئے اجلاس کے لیے اشتہار چھپوانے پر میں
حارہ تھا اور اب ہسپتال میں ہے۔“

ہم نے بھاگ کر کار تک کا فاصلہ طے کیا۔ روحا
عاشق اور احسن بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ بقی لوگ
ایک دوسرے کی کاروں 'موٹر بائیک' سے قائمہ اٹھا کر
مجلس خضارہ پہنچے۔ اس قدر شور میں بھی سناٹا
سامع سامع کر رہا تھا۔

مقدمہ رسول کو تہنیشن تھیلے جایا جا چکا تھا مگر
عارف صہبائی اور ندیم جو کئی باہر کھڑے ہر انساں ہو
اسے تھیلے

”مگر یہ سب کس نے کیا؟“ یہ فیضی تھا۔
 ”لہجہ جو ننھی لکی روز سے کاشف رضا اور اس کے
 ساتھیوں کی طرف سے دھمکیاں آ رہی تھیں اور پھر
 آج بریس سے واپسی پر کار میں بیٹھے ہوئے انکی طرف
 سے گولی آئی اور بانو جمیدتی شیشہ بار کر گئی۔ شہنشاہ
 شہنشاہ دو سری گولی دامن ہاتھ اور بامیں بانو پر جا
 گئی۔“ مگر یہ جو کیرنل نے بتایا۔

”اے زندگی کا رستہ نہیں لینا چاہیے۔“ میں نے احتجاجاً سوچا آخر کو میرا بہترین دوست تھا۔ وفا وہاں بڑی بخیر مساکت بخیر پیشے پر بڑی مہند سے باہر چلے گیا پھر مجھے کی کوشش کردی تھی دروازے کی چرچر ابھ رہی تھی۔ نگاہیں ایک ساتھ دروازے پر نمودار سفید اور کوٹ بنے ہاتھوں سے۔

دیوٹی بکس کا حیر کردہ

سوتنی میرا امل



☆ گرتے ہوئے ہمارے کو روکتا ہے۔
☆ نئے مال کا گناہ ہے۔
☆ ہمارے کو مضبوط اور جلد ہلاتا ہے۔
☆ مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لئے
☆ ایک ہی شے۔
☆ ہر موسم میں استعمال کیا جانے لگتا ہے۔

سوتنی ہر پیراں

تیت = 80 روپے

12 جزی احوال کا مرکب ہے اور اس کی بنیادی کڑی سے متعلق ہے
لہذا یہ قومی مفاد میں چارہ ہے۔ یہ ہزاروں سالوں سے جو
مشرب ہیں، اس کی بنیادی کڑی سے متعلق ہے۔ یہ ہزاروں سالوں سے
7000 سے زائد ہے اور اس کی بنیادی کڑی سے متعلق ہے۔
تھوٹا ہے اور اس کی بنیادی کڑی سے متعلق ہے۔

- $\frac{1}{4} \times 100 = \dots\dots\dots$ 25% 1
 $\frac{1}{4} \times 180 = \dots\dots\dots$ 45% 2
 $\frac{1}{4} \times 270 = \dots\dots\dots$ 67.5% 3

نوٹ: اس میں ڈاک ٹرین کے چارے شامل ہیں۔

عربی کے قواعد

تبعی نمبر 53 اور گھر پ مارٹس، سیکٹر نمبر 53 کے ساتھ راج روٹی گراہی

آفرینے والے خدا کا نام لے کر

۵۳ اور کتب دار کتب و کتب خانوں کے متعلق

کتبه محمد بن ابی بکر، 37، دیوار کربلا۔

فون نمبر: 32736021

اور تہ ذاکر جار کیں جس نے ہمارے مسیحا کوئی
اچھی یادیری خبر سننا تھی۔
”کہ نہ تو ذاکر اور دی ہادی۔“ ذاکر مسکرایا۔ ”لیکن
بوش ابھی نہیں آیا ہے آپ لوگ جائیں۔ فکر کی کوئی
بات نہیں اور ہاں۔“ ذاکر مڑا۔ ”ان کے گھر کوئی
اطلاع؟“

اس نے سوالیہ نظرس ہم پر جمایں۔ ہمیں واقعی
یاد نہیں رہا تھا کہ عکرمہ رسول کے گھر اطلاع کرنا تھی۔
میں نے ہسپتال سے باہر آکر بلیک کال آفس سے انکل
عبدالرحمن کو ریزی کے آفس فون کیا۔ میرے والہیں
آنے تک سب چاہتے تھے وفاقی طرح پتھر کی مورچی
بنی مسکت بیٹھی تھی۔ میں بھی چپ سا دھڑے کان کی
طرح بل کھاتی بیڑھیاں کھتا رہا۔ آنے جاتے پھر وہ
لوگ۔ شاید ان کا بھی کوئی عکرمہ رسول۔ اس سے
آگے میری حتمی سوچیں سکڑنے لگتیں۔ کتنا سکوت
اور ٹھنڈے اور آخر عکرمہ رسول جیسے لوگوں کا بونہی
انتقام کیوں کیا جاتا ہے مجھے جھڑپھی آگئی۔ نہیں
عکرمہ رسول کو ابھی جینا ہے ابھی ہمیں کسی محمد بن
قاسم کی سخت ضرورت ہے۔ اوٹے لے لے قد چوڑے
شاہوں والا۔ روشن پیشانی۔ او اس مڑا آگے تک کہ مجھے
والی آنکھوں اور کیا پلٹ دینے والی سوچ کا مالک عکرمہ
رسول اسے ابھی زندہ رہنا ہے۔ تھے سالوں کے بعد
کوئی ایک عکرمہ ہی تو پیدا ہوتا ہے۔

عکرمہ رسول کے بازو سے گولی نکل دی گئی تھی۔ مگر
کاش یوں ہو سکتا کہ گولی نکلے ہی عکرمہ رسول بھلا چکا
ہو کر کسی نے اجلاس میں اسی مخصوص کھٹکتے لیے میں
انقلاب کی باتیں کر رہا ہوتا۔ مگر سرت سارا خون ضائع
ہو جانے کی وجہ سے ہستے پھرتے بعد تھکوا تھک کر بیٹھ
نہیں سکا تھا۔ میں اور وفا اس کے آس پاس رہتے۔ وہ
جھک گئی آنکھوں سے ہمیں دیکھ کر رہتا۔
”سنو یار۔ اتنا بوجھ مت بناؤ۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر
کہتا۔

”ارے چھوڑو دوست۔ تم جب ٹھیک ہو گے نا تو
ایک ایک احسان کا بدلہ چکا لو گی۔“ میں ہنس رہا تھا۔
”یار! یہ اپنی وفا خاصی ٹھیک فاک نہیں ہے کیا؟“
وہ ہستے ہوئے شرارت سے کتنا دھم دھم توں کا قہقہہ اس
انگلش کمرے میں اور دھوا دھرتی وفا کو جو کھڑا تھا۔
”کیوں؟“ کیا کوئی پیچھے مڑا نظر آگیا؟ وہ مڑ کر
کہتی۔

”صحیح کرو۔ کیونکہ چھو پھرے ملی کو نظر آتے
ہیں۔“ میں نے اسے چڑایا۔
”دیکھو عکرمہ! تمہارا یار کچھ زیادہ ہی اور ہونے لگا
ہے۔“ اس نے عکرمہ سے کہا تو وہ مجھے متنبہ کرتے
ہوئے مسکرائے لگا۔ اس کے ہم اور بلایا اپنے اس
اکھوتے بیٹے کے گرد یوں چکر لگاتے جیسے کوئی منتر
پڑھنے کے بعد کسی کے گرد پیچھے لگا تا ہو۔

آج کی روز کے بعد میں یونیورسٹی آیا کیونکہ فاضل
سمسٹر نہیں صرف سو دن رہ گئے تھے۔ میں لائبریری کے
ساتھ کھڑا سرائق رضوی اور سر شاہد چٹائی سے
”العزم“ کی کتابیں پوں اور عکرمہ رسول کی صحت کے
بارے میں ڈسکس کر رہا تھا کہ پیشان اور تابید جعفری
نے مجھے آلیا۔ میں سر سے معذرت کر مان کے ساتھ
ہو لیا۔

”رات ہم سب دوستوں نے عکرمہ رسول کی
صحت کا جشن منانے کے لیے ایک چھوٹی سی تقریب
ارنچ کی ہے۔ کوکے نا؟“ زیشان نے پوچھا۔

”تم اتنے دن سے عجب تھے اور ہمیں عجب سا
لگ رہا تھا کہ عکرمہ رسول کی اتنی اہم تقریب ہو اور تم
نہاؤ۔“ تابید جعفری نے اپنی مخصوص مسکراہٹ
چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

”تھینکس کہ تم نے بتا دیا ورنہ شاید نہاؤ ہی
ہوتا۔“ میں نے شکر ادا کیا۔

”الرسال اللع“ میں شام چھ بجے سے ہی لوگ ہجوم
در ہجوم آتے رہے۔ ان میں خاص طور پر جرنلٹ

آگے آگے تھے ”جو کوئی گتے کی وجہ اور سس
ہاوی کے جنس میں جیسے تھے عکرمہ رسول ہیں
اس کر انہیں ذیل کر رہا تھا اور کسی ایک کو بھی اس
ہادی کہانی میں اس نے قصور وار نہ کروانا۔

”عجب ہو عکرمہ تم بھی۔ کہہ دیتے سب کچھ بے
لقاب کرو دیتے ان چروں کو۔“ میں نے فیسے کہا۔

”میں یار۔ اس طرح ذاتی لڑائی ابھرتی اور ”العزم“
کیسں چپے رہ جاتا۔ ہم نے کسی ایک کثافت رضا
میں رکنا۔ ہمیں ایسے سب بڑے لوگوں نے لگا کر
ہے اور ہم ایک تحریک کی صورت میں ان کی ٹھکانی
کریں گے۔ جب ان کی چاروں مٹیں رہندو جا میں کی
پہران کا کھو کھلا ہیں دیکھنے والا ہو گا۔“ عکرمہ رسول کے
لبے کا ج میرے سین کو کھٹی تھا۔

”ہائے۔“ وفا بے بی رنگ شلوار کرتے میں بڑا سا
ادبے شاہوں پر پھیلائے نہائی خوب صورت ترین لڑکی
لگ رہی تھی۔

”پلووفا! کو۔“ عکرمہ رسول نے بڑی وار قتل سے
اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ سیاہ نقیس گلو د میں سے اس
کے گان باتھ ٹھک رہے تھے۔

”تم خانہ“ مہمل کسی ایسی تقریب کے لیے کیے
راضی ہو گئے؟“ اس نے ہاں چپچپے ہناتے ہوئے
تھکری ہونٹ سکڑے۔

”اصل میں یاد لوگوں کی خوشی تھی۔ پھر ہم نے تو
”العزم“ ہی کی بات کرنا ہے۔“ عکرمہ رسول نے صفائی
چیش کی۔

”آؤ بیٹا آؤ! کیسی ہو؟“ انکل عبدالرحمن وفا کو
ساتھ لہاتے ہوئے بولے۔

”بالکل ٹھیک۔ آپ کیسں کیسی طبیعت ہے آپ
کی؟“ وفا نے پوچھا۔

”میں تو ٹھیک ہوں۔ تمہاری آنٹی کا بلڈ پریشر کل
سے بہت ہلکی ہے۔ یوں بھی جب سے عکرمہ کے گولی
لگی ہے تب سے حواس ٹھیک نہیں ہوئے فتنیں
کر کر کے تھک گئی ہے مگر عکرمہ ہنس رہا ہے۔ بہادر
ہے۔“ انکل نے تفصیل بتایا۔

”آؤ بیٹا اس کا۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔
”شکر اللہ۔“ میں نے ہنسنا جاری رکھا۔
”چند گیارہ وفا میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے بعد وہ
انٹنے والی ہلکی ہلکی مسکرتے بے حال کر رہی تھی۔

”کافی مٹس کید رنگ ہے۔“ میں نے نئی اڑتے
سینے آنکھوں اور وار قتل سے دیکھتے مردوں پر نظر
دوڑائی۔ عکرمہ رسول اسچ پہ آیا تو ”العزم“ اور
انقلاب کی باتیں کو بھی وہیں۔

”تم جانتے ہو شہیار! عکرمہ رسول نے مجھے پوڈ کیا
ہے۔“ میرے بائیں طرف سے آواز آئی میں پچھر
ہوئے لگا اور اس پر نظرس گاڑیں۔

”پھر؟“ میں نے بے شکل تھوڑے تھکے ہوئے پوچھا۔
کاش یہ جان لے جیسے کوئی مراقبہ کر کے مدح کو پڑھتا
ہے یہ میری مدح کو پڑھ لے۔

”پھر یہ کہ میں اسے ریجیکٹ نہیں کر سکی۔
سو سمسٹر کے بعد ہی ہماری ایکلیمنٹ۔“

میں اپنی حتمی سوچوں کے پکڑ میں پڑا خود کو یاد کرانا
ہا کہ میں شکست خورہ نہیں۔ شکست نہ ماننا بھی تو
ایک بڑی شکست ہے۔ فیضی اسچ پر کھڑا اپنی خوب
صورت آواز میں گارہا تھا۔

جس کا بھی دل ٹوٹا یا رو پٹانے میں ڈوب گیا
اک ستارہ چلتے چلتے یقانے میں ڈوب گیا
جان بوجھ کے ڈوبنے والے تجھ سے ہی تو شکوہ ہے
اس سے کوئی گد نہیں جو انجانے میں ڈوب گیا

میں سن سارو یوں کی مانند سب دیکھتا رہا جیسے کسی
غم خوشی کے پھر اچانک انھا اور عکرمہ سے معذرت
کیے بغیر اٹھ آیا۔ کیونکہ مجھے اچانک کوئی اہم کام جواو آ
گیا تھا۔ وہ حیران آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی کہ
عکرمہ سے بھی زیادہ کچھ میرے لیے اہم ہو سکتا ہے۔

”واہ یار عکرمہ رسول! تم تو واقعی انقلابی رہندے ہو۔
تم نے تو میرے چھوٹے خواہوں کے جزیرے میں
بھی انقلاب برپا کر دیا۔“ میں بلاوجہ سڑکوں پر بھاگتا
رہا۔ جانے میرے لاشعور میں کیا فاصلہ تھا۔ جو میں

یوں بھاگ بھاگ کپاشا چاہتا تھا۔

شاید کوئی رکھی ہو۔" میں اٹھ آیا۔ میرے گئے میں

آسوس کا پتہ تھا۔

آسوس کا پتہ تھا۔

گھلت میرے جتنے میں آئی تھی لیکن وہ راجا
شہزادہ کیاجو اپنی گھلت کسی تاریک گوشے میں بیٹھ
کر سرت پھونک پھونک کر رہا تھا۔ میں یوں نہ سنی
چلا آیا۔ کلاس لے کر کھائی تھا کہ عکرمہ رسول سے
مکرا گیا۔

"وہ راجا شہزادہ۔ تم تو بہت بڑے لنگے۔" میں نے
بہن کے نیچے میں اپنی سرخ آنکھوں کو دکھا اور پانی
کے پینے مارنے لگا۔ جانے میں کیوں خود کو بے بس یا
رہا تھا۔ بہت سے بے بس اور پھر یہ عکرمہ رسول کو بھی تو
آج ہی مجھ سے ملنا تھا۔ اوہ اوہ ہو تا وہاں میں رہا اس آیا
تو وہ میری ڈانری کے آخری صفحات کو لے بیٹھا تھا۔

"ہیلو یار رات میں تمہیں بہت ڈھونڈتا رہا۔ لیکن
تم نہیں ملے۔ پھر وہاں سے بتایا کہ تمہیں کوئی ضروری کام
پار آ گیا تھا۔ وہ بھی رات پارہ بجے۔" اس نے بٹاش
کچھ میں کہا۔

ہم ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے کہ ڈانری
جیسی ذاتی چیز نہ ہونے کے لیے پوچھنا نہیں پڑا تھا بلکہ
میں یادہ اگر کوئی خوب صورت ٹھیکہ یا کوئی بات پڑھتے تو
ایک دوسرے کو پکار پکار کر سنا کرتے۔

"بس یار! طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" میں فرار
چاہتا تھا۔

"سوری یار! لیکن یہ بڑی انٹرٹیننگ چیز۔" اس
نے ڈانری کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو آؤ چائے پیو۔" میں اس کے پیچھے پیچھے
چلنے لگا جیسے ٹرین کا کوئی ایک ڈبہ دوسرے کے
پیچھے۔

"کیا؟" میں حواس میں آنے لگا۔
"میری رقیب سے۔" اس نے فیض کی نظم کی طرف
اشارہ کیا۔

"جینٹو۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"وہاں رست اچھی چیز ہے۔"

"ہیلو مونج دیا۔" اس نے پھیل پواسے رست
خان کو پیش کی طرح منہ دیا پکارا۔

"ڈانری مجھے پکارتے ہوئے تھا۔" چلو چلے
ہیں۔" اور پھر ہم چائے پیے بغیر اٹھ آئے اور مونج دیا
میں آواز میں رہا رہا۔

"لیں سب وہ روشت کی طرح حاضر ہوا۔
"اچھی بلکہ بہت اچھی ہو چائے۔"

"اچھی بلکہ بہت اچھی چیز ہے۔"

"ابھی دایا۔" کہہ کر وہ چلا گیا۔

سسر کے بعد میں اس ڈریم گریل کی سوچوں سے
بچنے کے لیے کتابوں میں پناہ تلاش کرنے لگا۔ میں
فیوڈ ستر سے تصوف کے موضوع پر سید عبد العزیز دہلوی
کی کتاب "ازریز" لے کر آ رہا تھا۔ تصوف کی کتابوں
میں بھی ایک سکون ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوا آ رہا تھا کہ
مجھے احسن مل گیا۔

"یاد یہ مونج دیا بھی واقعی مونج دیا ہے۔ اب
دیکھو تا اس نے میں سے کوئی اتنا ساہ اور سید جلد
آج کل کے توپاگل بھی ہو سیا رہا۔" وہ بھرپور ہنسی
ہنستا رہا اور میں خاموشی سے خود کو مضبوط بنانے میں
لگا رہا۔

"ہیلو راجا شہزادہ۔" وہ میری طرف لپکا۔
"ہیلو۔" میں رک گیا۔ کافی دیر "العزم" کی جوانی
کے قصبے ہوتے رہے۔ "ویسے راجا عکرمہ رسول نے
اتھا ہو کر بھی کچھ اچھا نہیں کیا۔" میں عجیب سا اسے
دیکھنے لگا۔ شاید کوئی نیا "برو اسٹشپ" بندوق کی حد

"کیا بات ہے یار۔ اتنی سنجیدگی اور تم؟ اور آج شیو
بھی نہیں کیا تم نے؟"

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"میں خاموش رہا۔
"اگر طبیعت خراب تھی تو نہیں آتا تھا آج؟"

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"میں خاموش رہا۔
"اگر طبیعت خراب تھی تو نہیں آتا تھا آج؟"

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"میں خاموش رہا۔
"اگر طبیعت خراب تھی تو نہیں آتا تھا آج؟"

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"میں خاموش رہا۔
"اگر طبیعت خراب تھی تو نہیں آتا تھا آج؟"

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"میں خاموش رہا۔
"اگر طبیعت خراب تھی تو نہیں آتا تھا آج؟"

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

نک۔

"کیا۔" وہ اور بھی حیران رہ گیا۔

"یعنی عکرمہ جو راجا کے بغیر ایک قدم آگے نہیں
چلا تھا۔ واقعی یار یہ شہرت بھی بڑی ہی چیز ہے۔ بیوں
بیوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکال رہا ہے۔" وہ
تکسلیل بنا رہا تھا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔

"کیا معنی؟"

"مگر پھر بھی کوئی ریزن اہیل وجہ۔ جس کی آڑ میں"

میں نے پوچھنا چاہا مگر خود کو روک لیا۔ یہ سب بار
بار کہنا وفا کو تار سائی کے گڑھے میں بٹھا کر اوپر سے پتھر
مارنے والی بات تھی۔ اسے ٹھکرائے جانے کے ٹھک
سے بچانے کے لیے میں ہر راہ ہر ذریعے سے سوچتا
رہا۔

"وہ ایسا تو نہیں تھا پھر؟" میں نے لیے سکوت سے
گھبرا کر سوال دیا تھا۔

"میں تو تو کہہ رہا تھا کہ تم میں سب یہ
چلتے ہیں کہ وہ ایسا تو نہیں تھا پھر۔ اور اب لوگ
مجھے شک کی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔"

"سن کر میں نے حواس میں رہا۔ میں نے سوچا
تھا کہ اسے وہاں رکھوں جہاں نہانے کا کوئی گرم سوز
اس پر اثر انداز نہ ہو۔ اسے عکرمہ میرے دوست
میرے یار نے سزاوار نظام کرنا چاہا۔ کیا شخص ہے تو
عکرمہ رسول! یہ قوم کی بیٹیوں کی چادر کی تو قسم کھاتا
ہے اور تیرا بیک گراؤ نہ یہ ہے کہ تو نے بغیر کسی وجہ
کے اس معصوم کو رسوا کر ڈالا۔ کچھ تو جو آواز رکھتے یار۔"

میں سوچتا رہا۔ مجھے میں چننا رہا اور وہ اپنے بلاوجہ
ٹھکرائے جانے کے محروم رست اڑاتی رہی۔ میں
بغیر کچھ کہنے سے اٹھ آیا۔ پھر نہ میں نے عکرمہ کو
ڈھونڈنا چاہا نہ ہی وہ مجھے ملا۔ مجھے دکھ تھا کہ اگر وہ کسی
بات سے پریشان تھا تو میرے پاس آتا ہے وہ اپنا واحد
خاص "کنا تھا میرے پاس آتا۔ کچھ کہنے سننے۔ لیکن
اس نے تنہا ہی سارے فیصلے کرالے۔ شاید یہ اس کا
بہت ہی پرست مسئلہ تھا۔ بہت پرست۔

"ہیلو۔" میں اس کے پاس بڑی چیز تھکیت کر بیٹھ
گیا۔

"ہیلو۔" اس نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

"ہیلو۔" میں نے اتنی حیرت سے مجھے دیکھا کہ خود
مجھے بھی اپنے وہاں ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ کافی دیر
خاموشی رہی۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس کھرچتی

راست اٹھل ایراز حسین باہمی کو دفا کے لیے اپنا پروپوزل دے سمجھا اور مجھے حیرت اس وقت ہوئی جب بہت خاموشی سے قبول کر لیا۔

کس مصلحت کے تحت وفا تم نے اتنی جلدی پروپوزل قبول کر لیا۔ تم کئی بار مجھے ٹھکراتیں اور میں کئی بار نے سرے سے تمہارے پاس چلا آنا نہیں مانجیے۔ میں بے حد خوش تھا۔ وفا کی طرف سے ایک کنٹ اور شادی سے ابھی منع کروا دیا تھا۔ میں نے انج ڈی کے لیے امریکا جانا چاہتا تھا۔ پھر مجھے کیسے یقین رہا کہ وہ میری ہے اور کوئی راست نہیں تھا۔ فریمن "کناخ" پر مشفق ہوئے تو مجھے لگا جیسے وہ جیتا جاگتا خوب صورت تراشا ہوا جسم۔ سر جیتے جاگتے دل کے ساتھ میں نے لٹو کر دیا۔ ایسا ہیورٹ بر آئی اور اٹھل ایراز حسین باہمی کے ساتھ جنگ جاتی آنکھوں والی وفا بھی مجھے سی آف کرنے لگی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی جی جیت کا احساس بہت خوش کر گیا۔

"اے یار۔ وطن سے جاتے وقت بڑے بڑے گھاگ لوگ رو رہے ہیں اور تمہارا ہوا جو بہت خوش ہے۔" اٹھل نے ہنستے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ پڑا دیا۔

نی اٹھل تو بہت خوش ہوں۔

میں نے اٹھل کے پیچھے سنی سنی سی مسکراتی ہوئی اس دفا کو دیکھا جو میرے ساتھ میری بخت و سحر کر رہی ہوئے نہیں گھبراتی تھی۔ سب جو اتنا "فانا" ہوا تھا مجھے غم اور خوشی سے آگاہ کر گیا۔ مجھے اس عرصے میں علم ہوا کہ کسی کو کھونے کا دکھ کیا ہوتا ہے اور پھر چاکلک مل جانے کی خوشی کیا ہے۔ تقدیر پر یقین آنے لگا۔

"پیرانی قسمت میں ہی لکھا تھا عکرم رسول!" وہ جیسی آنکھوں سے ہنستے تھے میرے لئے رسول! جب مجھے گڈی لگے کہ دی تھی میں مسکور سا اپنی آنکھوں سے اسے عکرم رسول کی طرف سے ملنے والے دیکھے اور دکھ کو دھو کر دیا۔

اس روز جب میں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بیٹھا نوٹس تیار کر رہا تھا تو اٹھل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہیلو عکرم رسول۔"

"ہیلو اٹھل! تم کب سے یہاں آکھوڑے ہو؟"

اس کی حیرت میں ڈوبی تو اڑنے لگی تھی۔

"میں تو کوئی چھ ماہ سے یہاں ہوں۔ پنی انج ڈی کرنے کے لیے۔" اٹھل جو پاکستان میں سب سے بڑا مشہور تھی اس وقت اپنا ہم وطن دیکھ کر چھوڑی تھی۔

"کیا تم نے میری بہت بڑی چیز ہے۔"

"اچھا تو ذکر یوں کے سارے چکر ہیں۔" وہ ہنسا۔

"ہاں! بس یہی سمجھو۔" اٹھل نے راجا سے ملو آؤں۔

"وہ اس کے میری طرف آئی۔"

"السلام علیکم یار۔" کسی انگریز ملک میں کوئی اور مجھے اس طرح کہتا تو شاید میں بے تحاشا خوش ہوتا۔

"وعلیکم السلام۔" اٹھل کا تھنسا تھا۔

"کیسے ہو یار؟" وہ میری آنکھوں میں دیکھا ہوا ہوا۔

"بہت اچھا۔" میرے اس قدر سیٹ چرے سے اسے ہی نہیں مانا کہ کوئی ایسا نہ ہو۔

"اچھا تم نے یوں ڈرا نہیں ہے کل کے نوٹس کی بابت پوچھ لوں۔" اٹھل نے یہ کہہ کر نکل گئی۔

"کیا بات ہے؟ پوچھ رہا تھا۔" وہ چپ سا ہو گیا۔

اور میں ایک ٹکڑے سے دیکھتا رہا۔

"تو عکرم رسول! تمہیں کون سا اس انقلابی مہم کو سر کرنے پر گولڈ میڈل مل گیا ہے۔ جو تمہاری آنکھوں کے نیچے اس قدر سیاہ چلتے رہے ہیں اور چہرے پر چھوڑنے سے ڈیرا لیا ہے۔ تم کو کس چیز نے پریشان کیا ہوا ہے۔ جس میں بھی تمہارا اندر ضرور بے چین رہے گا۔ جب تک تم چو گے۔" میں ایک دم بہت پرل۔

"اے سنو تو۔ کیا ہوا اندر اس ہو گیا؟" وہ بے بس سا مجھے دیکھنے لگا۔

"نہیں۔" ناراض ہونے کی ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے انقلابی عکرم رسول؟"

اس کا چہرہ مزید زور پڑ گیا۔ "تم بھی مجھ ہی سے بدظن ہو۔" وہ بچا ہوا ہونٹ اتار لے کر چلنے لگا۔

"میں کیلغور دنیا کس سلسلے میں ہو؟" میں نے بات گھمائی۔ آخر اتفاق بھی کسی چیز کو کہتے ہیں۔

"العزم" کے سلسلے میں۔" وہ خود کا ہوا چکا تھا۔

"اس کا مطلب ہے تم نے بہت ترقی کر لی۔ بین الاقوامی سطح پر۔" میں نے طنز کیا۔

"میں نے نہیں۔" "العزم" نے "میں نے صحیح کی۔"

"اٹھل! ہمارا ملک یوٹیا بن گیا۔"

میرا دل بھر پڑا۔ وہ کیلئے دیکھ کر میں کاہو میں نہیں رہا تھا۔ یہی چاہتا تھا اس سے ساری حقیقتیں منوالوں کے مجھوڑ والوں سے۔ وفا کی ان چند باتوں کی اہمیت کا یقین چن کر حسیل ہوں۔ مگر میں جانے کیلئے غائب ہوا۔ وہ ایک میں قلم بند کر کے خیال کو کھینچنے لگا۔ کیونکہ میں اس وقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"یار! جہاں پوری سوسائٹی نہ چاہے وہاں ایک "العزم" آیا کر سکتی ہے۔ ماسوائے اس کے کہ اگر برائیاں شتم نہ کر کے تو سامنے ہی لائے۔ لوگ کم از کم برائی کی وجہ سے جہاں ہیں۔" وہ ابھی پاؤں نہیں تھا۔

"جو جی تو برائی کا بڑا سبب ہے۔" میں نے سوچا۔

"تو کیا میں مغربی اقوام سے سفارش کرنے آئے ہو۔" مجھے اس کا وہ زور زور سے مغربی اقوام کے خلاف بولنا یاد آیا۔

"نار کو کس۔" منشیات ہمارا آج کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ لوگ بڑھ کر منس دیتے ہیں۔ بہت عام سلفظ مگر گہرا اجاز دینے والا۔ ڈرگ مافیا کے خلاف بظاہر چھوٹی لیکن ایجوکیشنل ایک بڑی جدوجہد۔ "اس نے وضاحت کی "مگر یار جب ہم اقوام متحدہ کے سیکریٹری سے ملے تو۔ اس نے ہمیں ہی مورد الزام ٹھہرایا کہ تم لوگوں نے اس وقت ہمارے احساسات کیا تھے؟ وہ کہنے لگا کہ "سب سے زیادہ ہیروئن اور الیون کی پیداوار تمہارے ممالک میں ہوتی ہے۔ بلکہ ہمیں بھی بھوکا ہماری اتنی فیصد آبادی تمہارے دیے گئے اس تحفے سے فیضیاب ہو رہی ہے۔" وہ نچ ہوا ہوا ہوا۔

"ایک بڑا ملک ہمارے لوگوں کو مجرم ٹھہرا کر ہمیں اچھل رہا ہے۔ تو پھر بتاؤ تاکہ آخر ایک "العزم" وہاں کتنا کچھ کرے۔ جہاں اقوام متحدہ بھی لاچار ہے۔"

میں نے اس قدر پریشان آج سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"سب سے بڑی اسٹیج وہ ہے یا ز جہاں انسان کچھ کرنا چاہے مگر وہ کچھ نہ کر پائے۔"

وہ اٹھ بیٹھا۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے چلا ہوا روڈ پر نکل گیا۔ "یہ بڑی بڑی بڑھکھڑا ہوا ہے۔ صاف اور کشادہ سڑکیں یہ ہماری ان چھوٹی چھوٹی سڑکیں اور ان عمارتوں کے سامنے کچھ نہ رہیں۔ اگر ہم کچھ کرنے کا عزم کر لیں۔"

عام سی چیز اور کوٹ بننے مقرر کالوں کے گرد لیپے یہ شخص بظاہر دیکھنے والوں کو کتنا عام لگ رہا ہو گا مگر ذاتی خلص کے بلو جو اس وقت مجھے بہت اونچا لگا کہ کم از کم کوئی اتنا اچھا سوچتا تو ہے۔ ہم نے سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ خدا کرے عکرم رسول! تمہاری آواز میں بولتی ہماری سوچیں سچ ہو جائیں تو پھر ہم میں سے کسی کو بھی یہ بڑے ہو لڑے اور اپنی پہلی خوب صورت دکھیں۔ ہمیں نہ کر سکیں۔" میں سوچنے لگا۔

بھرا ہوا بڑے شہر کی دھند میں کس کی ہو گیا۔

پاکستانی اخبارات "العزم" کی بہترین کارروائیاں سے پڑھنے لگے۔ کبھی ڈرگ مافیا کے کسی بڑے ایجنٹ پر کوئی بڑا چھاپا۔ انوشادہ پتھان کی برکد اور بہت سی بڑی بڑی سٹائی برائیاں کے سامنے ڈٹ جانے کی کاروائیاں۔ عالمی سطح کے اخبارات "میگزین" میں "العزم" کا شوریچ گیا اور میں اس چھوٹی سی تحریک کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب یہ شروع ہوئی تھی اور بہت سے لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ اگر انسان ڈٹ جائے تو بھلا کیا مشکل ہے۔ مگر ایک ذاتی خلص جو بظاہر بہت چھوٹی اور آنور کر دینے والی تھی۔ مگر شہر کی قسمت کی ہمیشہ مجھ پر حاوی رہی اور میں عکرم رسول سے اندر ہی اندر رو رہا۔

دفا کے فون آتے رہے اور وہ ہنسی روٹی لگایا میرے

جیسے کامیاب ہو گئی تھی۔ وقت گزارنے کا جواز جس کی آواز سن رہی تھی۔ میری جھپٹیں جان کر وہ بے انتہا خوش تھی اور اس کا اس جملہ یہ فون بند کرنا کہ "اب آجیائو" یہ چھوٹا سا جملہ میری عمر کی لمائی تھا۔ میں بھی مسکراتی تھا اور وہ بھی تار سالی کے ہر وجہ سے آزاد میری وجہ سے خوش سیہ خود پرستی مجھے مست مچھی لگتی۔

پاکستان پہنچنے پر مجھے پنجاب یونیورسٹی میں ہی چاہی مل گئی۔ وہی بزرگ شمس دہی انتہائی گہری پڑھیاں۔ ہرے بڑے بال اور لان اور وہی سونہریا۔ لگتا تھا ابھی کہیں سے عکرمہ رسول اگر جتا ہوا آئے گا اور پھر وفا اسے "پانی کیس کا" کہتی ہوئی اس پر طنز کرے گی اور وہ ہنستا جیسے گا۔ ہنستا چلا جائے گا۔

"العزم" اسی طرح جوان تھا۔ سر عارف سہیلی اب بھی کوئی عکرمہ پیدا کرنا چاہ رہے تھے اور وہ عکرمہ رسول جس کا پچھلے چھ ماہ سے کچھ پتا نہ تھا۔ اخبارات عالی لیڈ پر عکرمہ رسول کے بارے میں پیش گوئیاں کرتے رہے تھے۔ شور مچا رہا تھا جس کے لیے فز فز دہا تھا اور دوسرے سے ہراساں بھی کہ شاید وہ کہیں سے اچانک آجائے۔ اپنی فطرت کے مطابق چونکا ڈالے سب کو مگر عکرمہ رسول کو نہ آتا تھا نہ ہی وہ آیا میرا ہی چاہتا ہے پکار کر لاؤں۔

"دیکھو عکرمہ رسول! تمہاری وہ چھوٹی سی کوشش ایک جدوجہد بن کر پورے عالم کے سامنے تن گئی ہے۔ دیکھو تمہارا لگایا ہوا وہ پورا درخت بن چکا ہے۔ اتنے کم عرصے میں۔" تم نے کبھی نہیں دیکھا کہ تمہاری کویلا کا کوسوے ہو اور منہ دیکھو درخت بن کر جلتی دھڑکی پر سایہ فگن ہو جائے۔ کو میں تمہیں دکھائوں۔"

مام اور بیلا کی جہاز کے جلائے میں موت نے اس پر بہت اثر چھوڑا تھا۔ پھر وہ اپنی ساری جائیداد اور فیکٹریز اٹھاتا ہونے کے سبب "العزم" کو دے کر خود روپوش ہو گیا۔ اس بیباک کمال کے الرسول اللہ پر گئے "العزم"

کے پورا کوڈ کچھ کرو فائبر جیسے دیکھتی ہے اور میں اسے۔
وفا نے میری زندگی میں خوشیوں ہی خوشیوں بھری ہیں۔ مگر وہ خلقت جس پر میں عکرمہ سے ناراض رہتا تھا اب گہری صورت میں مجھے بے سکون رکھتی ہے۔ وہ میرا دوست، ہمارا بیٹا ہو جائے گا۔ میں رہا تھا۔ وقت نے ہماری جھولی میں پھول ڈالا تو ہم بے حد خوش تھے۔ میں نے اس کی سرخ ہوئی جبین پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا عکرمہ ہے۔" وفا نے پہلے مجھے حیرت سے دیکھا اور پھر ہنسنے لگی۔ اسے علم ہے وہ جانتی ہے کہ مجھے عکرمہ سے کتنا لگاؤ تھا اور اسے دھونڈنے کے لیے کیسے میں نے اندر ہی اندر کوشش کی ہیں۔

فرض کرو ہم اہل وفا ہوں فرض کرو دینا ہے ہوں فرض کرو یہ دونوں باتیں جھولی ہوں افسانے ہوں فرض کرو یہ جوگ بیجوگ کا ہم نے دھونڈ کر چھاپا ہو فرض کرو بس یہی حقیقت باقی سب کچھ بابا ہو میں عکرمہ رسول گردیزی اور بقول راجا جیسا رے انتہائی عکرمہ رسول جو آج تک اپنی زندگی میں انقلاب برپا نہ کر سکا۔ اخبار "میرے پور" "العزم" کی تار کو کہیں اور سلانی برائیاں کے خلاف ڈٹ جائے اور پھر کلمہ یابیوں کی ایک لمبی قطار میرے اندر ایک سکون سا بھر دیتی ہے۔ سکون جو میں یہاں دھونڈتا پھرنا ہوں۔ کوسند کی اس پسمناد سی بستی سے بھی آگے اکیلے کچے مکان میں بیٹھال کی آگ سے پانی ڈالنے کو ترس رہا ہوں۔ بیلا نذر محمد کھڑیاں لاکر آندھان جلائے کی کوشش کر رہا ہے۔

"بیلا! کھڑکی بند کرلو۔ ست سردی ہے۔" بیلا مجھے ہمیشہ سردی سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسے پتا ہے تاکہ میں ساری ساری رات کھانا نہ رہتا ہوں اور جب مجھے کھانسی کا وہ وہ پڑے تو وہ اس تھا مکان میں کف سیرپ کا ایک ٹچہ پلانے کے علاوہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ اس نے آج تک مجھ

سے بہت کچھ پوچھا ہے۔ بس حیران سا اپنی بوڑھی آنکھوں سے مجھے تکتا رہتا ہے۔ اسے کیا پتا کہ میں کیسے بچتا پھر رہا ہوں۔ اپنے آپ سے۔ اپنے لوگوں سے مجھے خود میں علی ایسا ہے کہ خود سے چھپانا پھرنا ہوں کہ یہ جوگ کیسا۔ کیوں؟ کس کی خاطر۔ راجا "امار" "اپنے یار" کے لیے۔ خود کو چھپانے کے لیے یا اس کا کسی سی وفا کے لیے۔ بیلا نے چھوٹا سا لپ جلا یا ہے۔ تار کی دور کرنے کے لیے۔

"تم نے ابھی تک کھڑکی نہیں بند کی بیلا۔" وہ آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دیتا ہے۔ "میرے اندر اتنی آگ ہے بیلا جسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اتنی سردی پاناگنی ہے۔"

"آجیائو کھانا کھاؤ بیلا۔" وہ بیٹکے سے کھانا لایا ہے اور مجھے انداز ہے کہ اس کے سوالات سے بچنے کے لیے بلکہ اس کی خوشی کے لیے مجھے چھو لگے لیٹا پرس گے۔ "آج پھر ایک نیا جوڑا کیا ہے بیٹکے میں۔ ایک بچہ بھی ہے ساتھ۔" بیلا نے اطلاع دی۔

"بیلا! پھر خاموش ہو گیا ہے۔ کبھی کسی روز میں بھی اس بیٹکے میں آیا تھا سکون کی خاطر۔ پھر یہ جگہ مجھے اچھی لگی اور بیلا بھی۔ اور میں بن پاس کھٹنے یہاں رک گیا۔ لکڑیوں اور یاروں میرا سارا ہیں۔ ہاں اخبار روزانہ باقاعدگی کے ساتھ بیلا مجھے بیٹکے سے لاکر دیتا ہے اور میں فسر کے کنارے انتہائی سردی اور دھند میں بیٹھ کر رہتا ہوں۔ بیلا کے منع کرنے کے باوجود۔

مجھے پانی اچھا لگتا ہے۔ میں اس پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا ہوں۔ پھر دیکھتے دیکھتے اس میں "یار" کی دو بڑی بڑی یادیں آنکھیں ابھر آتی ہیں۔ یہی پانی جو ان آنکھوں کی سحر پر تیرا ہاتھ مجھے چونکا گیا۔ میں نے بھی اس پانی کے سامنے یار کو بے بس پایا تھا اور وہ چھینٹے مار مار کر اچھا ہوا ہوا تھا اور میں نے اپنا آپ ہار دیا تھا۔ یہ محبتیں یہ عشق سے ہی بری چیز اور پھر کوئی ایسا۔ اس قاتل ہو جس کی خاطر یہ سارا سو بھر چلا۔ جائے اور وہ وقت کا کچ ایسی تازگی بھی بس خوب صورت آنکھوں

مختصر فی ہونٹوں والی وفا جس کی معصوم مسکراہٹ اس کی ذات کا خاصہ تھی۔ اس کے لیے یہ سارا سو بھر چلا جا سکتا ہے، بیجوگ بھی لایا جا سکتا ہے۔

یہ ڈائری بھی عجیب ہوتی ہے۔ جب تک دھڑس میں ہو رازدار رہتی ہے اور جب کسی اور کے ہاتھ لگے تو راز کھولی جلی جاتی ہے۔

جیسے اس روز میں نے یار کو حرف حرف بڑھ لیا تھا پھر بھی مجھے حیرت ہوتی ہے۔ وہ اپنی "دھونڈ" میں اس قدر کم تھا کہ اسے آج تک یہ خبر نہیں کہ وفا جیسی معصوم لڑکی کو چھوٹے ہاتھ کس چیز نے مجبور کیا۔

تمہاری آنکھوں کے سوالوں سے ڈرنا ہوا میں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
زوجہ اب دشمنی	رضوانہ شہزاد	500/-
خوشنما کی کمریوں	رضوانہ شہزاد	200/-
شہزاد کے دربارے	شہزادہ چمری	400/-
جیسے تم کی شہرت	شہزادہ چمری	200/-
دل ایک شہزادوں	آیہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	نازک ماسٹر	500/-
بھانسنے دھنگ کا لے	فاطمہ شہزاد	200/-
مکمل سے شہرت	خود شہزاد	200/-
دل سے دھونڈ لایا	آیہ زاتی	350/-
کھرنا کی خواب	آیہ زاتی	200/-
خواب رہے	سعدیہ کاشف	200/-

ناول شہزاد کے لیے کتاب ایک 30/- روپے
شہزادہ لکھتے
کشمیر و خواتین ڈائجسٹ 57 ارد گرد ماری
فون نمبر 2216361

تیرا ہونے لگا ہوں

سے لڑائیاں جھگڑے غمناک جو کے دن رات عفریت کی طرح بڑھتی منگنی کی وجہ سے ہوتے تھے نکل سودا لینے جاؤ تو قیمت کچھ آج لینے جاؤ تو بیٹھ ہر چیز یہ دیا تین روپے بڑھے ہوئے — ملتے دکان دار شکوہ کرتے تھے مال بیچنے سے منگا آ رہا ہے خدا معلوم بیچے کون تھا جس نے انگوں کی زندگیں حرام کر رکھی تھیں۔



”تیرا ہونے لگا ہوں“ کھونے لگا ہوں“ جسے ملا ہوں“ تیز تو اس میں جتنے میوزک سے پورا کھر گونج رہا تھا“ رواڑے سے اندر قدم رکھتی اماں کی تیور بوی پر غلبہ پکے تھے۔ تواڑ کانوں کے روپے بھاڑے رہی تھی ایک ہاتھ سے ہر قسم کے شبنم کھولتی اور دوسرے ہاتھ میں چٹل اٹھائے سامنے نظر آتے کمرے کے رواڑے میں داخل ہوتی اماں جیسے ہی سہو کو نظر آئیں گلے پر تھمرا چھوڑ کر چٹا ٹیس مار تکیہ جاوہ جاہو کیل۔

”شمر تو ذرا کیفیت! اماں غصے سے چٹکھاؤتی اس کے پیچھے لپکیں ٹکرو کہاں ہاتھ آنے والا تھا“ بندر کی طرح ملا نہیں بھرتا چست پر پہنچ چکا تھا۔ اماں وہیں بائیں کانپتی خن میں بڑے سخت پڑھیر ہو گئیں ایک تو شدید گرمی میں بازار سے سودا لانا بیڑیوں کو شت والوں

بھر جائے اتنی کہ سیلاب آجائے مگر ایسا کب ہو سکتا ہے شکیار کہ میرا یہ تھا آنسو تو ایک ذرہ بھی نہیں جھک سکتا پھر پھر میں کیوں محسوس کرتا ہوں کہ جب یہ میرا واحد آنسو زمین پہ گرے تو زمین وہاں سے سچی انصافی ہے۔ جیسے قطرے اور ہوا سا کر گیا ہو۔

میں یوں روؤں بھلا؟ ایک انقلابی جوان ایک عورت کے لیے آنسو برساتا ہوا اس خاموش دلدلی میں چپکے سے بے بسی کی موت مرجائے کیوں؟

مگر ایسا ہو سکتا ہے یا۔ یہ عشق بڑی بڑی چیز ہے۔ اس کے پیچھے کوئی عورت موز نہیں ہوتا۔ یہ تو خاص دین ہے اللہ کی طرف سے۔

وہ اللہ گواہ ہے یا یہ کائنات کے چند کلمے جو ہر روز کی طرح جھاکر میں اس شہر میں ہاتھوں گھمرو نہی ایک روز پلاٹھے اس چھوٹے سے قبرستان میں جہاں اس کی بیوی اور بیٹی کی قبریں ہیں“ مجھے بھی دفنا دے گا۔ تھا ہی میرا جنازہ پڑھ کر۔

آگے سارے صفے خالی ہیں اور مجھے جو صبح پلا پٹھے سے بلا کر لایا تھا۔ میں ڈاکو لے کر پہنچا تو میرا دوست۔ ہمارا انقلابی بیو کھاسی کے شدید دورے سے لڑ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھ سے نکلے ولادہ تھا آنسو مجھے عمر بھر رلانے کے لیے کٹتی ہے۔

پھر بھلا عمر دے رسول یہ صفحات پڑھ کر جسے بھانے کی بھی ہمیں ملت نہ ملی مجھے عمر بھر بے چین رکھنے کو کٹتی نہیں ہیں کیا؟

مجھے امریکہ میں اس سے کی گئی طرز متنگو اپنی نظروں میں کر آئی۔

تم نے تو پھر منزل پائی عکرمہ رسول۔

وفا تم جیسے بیو کو دیکھ کر واقعی اب فخر کے کی کہ یہ بیو بھی میرا دوست رہا ہے اور میرا کرب مجھے یہی ملے دو کے کھڑا ہے کہ آخر مجھے کون فیصلہ دے عکرمہ رسول کہ نامراد کون تھا؟ سو تمہارا میں!

یہاں چھپا بیٹھا ہوں یا۔ میں نے کبھی ہمیں انصافی طور پر ”یار“ نہیں کہا تم میرے جگری یار تھے۔ پھر میں نے لپٹا آپ دوا کر لگا دیا۔

یہ تو جتن میں مجھے کھلا کہ وہ کاشمی سی گڑیا میری مراد تھی اور جس کے بغیر میں نامراد تھا۔ پھر وہ شہرت وہ عزت وہ دولت میرے کس کام کی؟ بولو یا یار۔ تم تو جانتے ہو کہ کسی کو کھو دینا کتنا کرب آمیز ہے۔ پر یار کسی کو کھو کر جو کھ لپٹا بھی پناہ لذت آمیز ہے۔ پر ہے بہت مشکل۔

اس تلاش میں مجھے نہیں ملی تو وفا نہیں ملی ورنہ کیا کچھ نہیں ملا۔ یہ وہ بددی تمہاری حقیر آمیز نظریں اور وفا کی نفرت۔ سوچو یا بھلا اپنی محبت۔ اپنے عشق سے بھی کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ اسے غلط اور برے الفاظ میں یاد کرے؟ یہ عشق محبت بڑی خود غرض چیزیں ہیں۔ پھر وہ کیا تھا کہ میرے جسے میں یہی کیا۔ میں تمہارے اس سوال سے بہت بھاگتا ہوں کہ آخر بلا جواز؟ وفا کو کیوں بھوڑا؟ تو یار میں تمہیں کیا جواز تھا؟

مجھے خبر ہے کہ جب کھاسی کے دورے کے وقت مجھے تم کوک میں خون آنے ہے تو بلا کتنی بے چارگی سے مجھے دیکھتا ہے اس کا میرے بھتا جوان بیٹا جسے موت کھاسی جی نہیں کی لگا ہوں میں صاف لکھا ہوا ہے کہ کتنا اونچا اور خوب صورت جوان ہے مگر یوں ضائع ہو رہا ہے۔ مجھے اپنی عمر کے پچھلے تیس سال بہت زیادہ لگتے اگر میں کچھ نہ کر سکتا یا بہت کم لگتے اگر میں یوں بے بس نہ ہو جاؤں گا۔

ہاں یار میں بے بس ہونے لگا ہوں۔ میرا بی چاہتا ہے تم مجھے ملو مگر چلے آؤ۔ تم نہیں آئے مگر سوچوں کہ تم آئے ہو۔ تم جو میرے اکلوتے ”خاص“ تھے۔ تمہارے گلے لگ کر ایک یار۔ بے تمہارا روؤں تم میرے لیے اور میں اپنے لیے ہے ناخوہر سنی کوٹھے لگ کر خوب روئیں میں اپنے لیے اور تم میرے لیے بین کریں اتنی اور کتنی تواڑ سے کہ ان لوہے اونچے پھاڑوں کے جگر پھٹ جائیں۔ ہماری آہوں سے۔ یہ بھولی سی شہر سوکھا جائے اور پھر ہمارے آنسوؤں سے

”رہا اے اور میرا ذرا پانی تو پلا دے جاس کے بارے میں سوچ رہا ہے۔“ امل نے اپنی نور انظر کو آواز لگائی مگر جواب نہ ملا۔

”اللہ جانے کہاں مرگئی ہے۔“ امل بے شکل تخت سے اٹھیں اور فریق سے پانی کی بوتل نکالی گلاس میں پانی ڈال کر پی اور ریمائے کمرے کا دروازہ مڑ مڑا دیا۔

”ریماء چپ رہ کر رہی باہر نکلی۔“

”کیا ہے امل؟ اس کو چیخا چلا تا سب کو پتہ چل گیا ہے کہ تم انجلی ہو۔“ امل اسے کچھ سناتے ہی والی ٹھیک کر رہا کے پیچھے سے ایک اور شخصیت برآمد ہوئی۔ مونا پے کی طرف مائل جسم ”سوالا سارنگ چہرے پر عجیب سی چالاک لہے اتنی تیز گری میں بھی فل میک آپ کیے اور چیخے سے رنگوں کا ڈھوا پڑنے یہ ریماء کی عمر بڑا جان دوست یاد تھی۔

”السلام علیکم خالہ؟ کتنی دیر ہوئی دوواڑے کی طرف چل دی۔“

”بے حیا تو یہ مصوفیت تھی تیری جو کمرے سے نکلے کا ٹیم نہیں لیا جا رہا تھا۔ کب سے آئی ہوئی تھی؟“ امل کو ریماء کی یہ پہلی ایک آنکھ نہ بھائی تھی مگر یہ بالکل اسی کی بارگاہی کوئی خاص پروا بھی نہ تھی۔

”ایک ہی ایک تو میری سبکی ہے مگرے جہاں میں۔ وہ بھی تمہیں کھتی ہے فالتو نہیں بیٹھی تھی وہ میرا فیشل کر رہی تھی کیا فیشل آیا ہے آپو رویدک انڈیا سے پورے ہزار روپے کا ہو تا ہے اگر پارلر سے کراؤں تو۔“ ریماء غریبہ اپنی سبکی کا کارنامہ بیان کر کے غراب سے واپس اپنے کمرے میں امل کا لایا سوا سلف یونٹی امل کے تحت کے اس پر اٹھا۔

”امری اونکھی آپ یہ سوا اٹھا لے کر تیرا کوئی نوکر اٹھا کر رکھے گا۔“ امل کا دروازہ دیا رہا ہوا کمرے سے۔

اوپر کی سیڑھیوں سے ایک بچہ گود میں اٹھائے ایک بچے کو گھینچتی رہو کے اگلی بھائی تری تھی۔

ندیم بھائی کے آنے کا وقت ہو چلا تھا تمام دن اوپر اپنے کمرے میں آرام کے بعد اس وقت جیسے اترتا

ضروری تھا کہ بھی تو ظاہر کرنا تھا کہ وہ تمام دن بیچے ہی کلام کا دن میں لگی رہی ہیں۔ بھائی کو دیکھتے ہی امل نے پاندان لکھیا اور اس میں سے کوئی نہ ملنے والی شے ڈھونڈنا شروع کر دی امل کی ایسی حرکتوں کی بھائی کی جوتی کو بھی پروا نہ تھی گود لائے بیچے کو امل کے پاس تخت پر بیچ کر دے بیچے کو لے کر بچن میں جا چکی تھی۔

مچھ مستقل ریس ریس کر رہا تھا امل اسے گود میں اٹھا کر بسلانے کی کوشش کرنے لگیں مگر بیچے کا تو لگتا تھا کہ کوئی مٹن غلطی سے دب گیا ہے بونہ چپ ہونے کا ٹیم ہی نہیں لے رہا تھا امل کا حوصلہ جواب دے گیا۔

”ختم“ امل دھاڑیں ”پسلے اسے چپ کر دو پھر کچھ اور دیکھنا۔“

مگن سے بھائی بچو لے ہوئے منہ کے ساتھ برآمد ہوئیں واپس آکر بچے کو اٹھایا اور دوبارہ مگن میں غروب ہو گئیں۔

”تمہارے سر اور ندیم آتے ہی ہوں گے پہلے چائے چڑھاؤ۔“

امل کی آواز پر بھائی بچوں سبست مگن سے برآمد ہوئی اور تخت پر بیٹے کو بٹھا کر انتہائی ”مصوفیت بھرتے انداز میں مگن میں بیٹھ گیا۔

یہ بھائی کا انتہائی نکو دلانے والا انداز تھا جسے امل نے کڑوے کھونٹ کی طرح جی لیا کے لپاکے گھر آنے کا وقت تھا اور ایسے وقت میں کوئی مگر کر لپاکے بیٹھ کے بگڑے موڈ کو اور بھی بگاڑ دیتا تھا۔ جھکڑے کا ڈنڈہ دار چاہے کوئی بھی ہوا بابا کے حباب کا نشانہ امل ہی بنتی تھیں۔

امل اور ندیم کی اچھی خاصی بڑی خوب چلتی ہوئی دکان تھی علاقے کی مٹن مارکیٹ میں گھر میں روپے پیسے کی کمی نہ تھی جس سلیٹے کا نقدان نظر آتا تھا امل بے چاری سے جو بچن پڑا تھا کرتی تھیں مگر ان کا بھی پرہیز تھا وہ دونوں والی بھرتی امل سے آتی ہوا تیرا بڑا گھر سنبھالنے کے لیے دور کار تھی۔ ندیم کے بعد انجمن تھی شادی شدہ اور اسے گھر کی بھی اپنی کالی اور کام سے

جہاں بھانے کے چکر میں بیٹھے میں تین سے چار دن انجمن کے مگن میں گزرتی تھی انجمن سے چھوٹا سہو ہونے کے بعد سے اب اور ندیم کے ساتھ دکان پر جانا تو تھا مگر ان کے دن بھانے کر کے پٹیاں بھی جی بھر کے کرتا تھا تو بار گزری اور انجمن موڈ اس کے شوق تھے اپنے ہی جیسے تھے یا دوست ہمارے تھے جن کا کام لٹ لٹا ہوا اور بچوں کے اسٹائل بنا کر گلی میں آتی پانی لڑکوں کو پڑا تھا سب سے چھوٹی ریماء جس کی زندگی کھانے اور سونے کے گرو گھومتی تھی مگن چڑیوں سے کچھ وقت ملا تو تینے فیشن اور اندین ڈرائے بھی اس کی جان تھے زود جو کر بمشکل انٹر تک پہنچی اور انٹر میں مل ہونے کے بعد کچھ بیٹھ گئی بقول اس کے۔

”یہ خشک رہائی ہمارے پس کی بات نہیں۔“ امل و صورت تو کچھ خاص نہ تھی رنگ ضرور گورا تھا جس پر اسے ناز بھی بہت تھا۔

ندیم سید حسانا اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا پاپ کا خوب ہاتھ بنا تھا کاروبار میں اس کی بیوی جنم جو امل کی چوتھی بہن کی بیٹی تھی جب امل کے ہاں ندیم پڑا تو امل کی بہن بھی اندیشہ سے تھیں امل نے انہیں صاف کدوا تھا۔

”دیکھو لی اگر تمہارے ہاں لڑکی ہوئی تو وہ جنم ہوگی اور میرے ندیم کی دوسری بیٹی۔“ سولہاں اسے بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائی تھیں مگر شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد جنم نے وہ اداکاری کے جوہر دکھائے کیا فلم انشاں جنم نے دکھائے ہوں گے امل تو دانتوں تلے انگلیاں جا کر رہ گئیں۔

ریماء اور جنم کا اینٹ کتے کا یہ تھا وہ دونوں ایک دوسری کی شکل دیکھنے کی دوا دار نہ تھیں امل کو بھی جنم کسی کیفیت کی مٹی نہ سمجھتی تھی ہاں سر کے سامنے اس کی بوتلی بند ہو جایا کرتی تھی کہ لبا نہایت خستہ والے اور بد لحاظ سے انسان تھے امل نے ان کے ساتھ بڑے صبر و حوصلے کے ساتھ گزارا کیا تھا یہ اور بات کے امل کو پیش بھی امل نے ڈب ہی کرائے تھے۔

امل کو قلمیہ دیکھنے کا بڑا چسکہ تھا۔

سو پرانی قلم کے آنے پر امل کی سیٹھا میں بکثرت کرا لیا کرتے تھے اور پملا شوق دکھانے امل کو لے جایا کرتے تھے۔

اس معاملے میں امل ابادوں ہم ذوق تھے بچوں کے قلم بھی باہمی رضامندی سے اپنے پسندیدہ قلمی بیرو بیرون کے ناموں سے منسوب کر کے رکھ گئے۔

رات جب سب لوگ کھانے کے لیے دسترخوان پر جمع ہوئے تو اوپر بچت پر نئے کمرے میں سونے سہو کے تختوں تک بھی کھانے کی خوشبو پہنچی سب کھانا شروع کر گئے تھے۔ جب وہ انڈیا لکھ لیتا بیڑھیوں سے اترتا نظر کیا اسے دیکھتے ہی آبا کی تیوریوں پر ہل نمودار ہو گئے۔

”ندیم کے آبا کو فتنے اور ڈالیں نا آپ کی پسند کا سامن ہے۔“ امل نے ان کا دھیان سہو کی طرف سے ہٹانے کو ان کی پلیٹ میں سامن ڈالنا شروع کیا۔ سہو بغیر کسی کو مخاطب کیے چپ چاپ کھانے میں مگن ہو گیا۔ ”تمہارے گلاب صاحبہ جی ہوئی آپ کی گویا کے“ امل نے بولے۔

”کھان آوارہ گردی کی دکان پر کیوں نہیں آئے گویا کے؟“

”گویا کے لپاکے کلام تھا۔“

”وہ امل مجھے بٹھا تھا صبح سے“ سہو منہ نہایا۔

”کل شرافت سے دکان پر آ جانا ورنہ مجھے بخار اترنا اچھی طرح آتا ہے۔“ امل کے ہاتھوں سہو کی یہ عزت افزائی روز کا معمول تھی سب لوگ اطمینان سے کھانے میں مگن تھے۔

”یہ اسے دیکھو لگتا ہے پورے دن کا کھانا ایک ہی وقت میں کھاتی ہے تو بے کس قدر جتنا خوراک ہے تھی ریماء! چاولوں اور بیٹوں سے پلیٹ میں خانا بنا سا پناڑ کھائے اندھا دھند کھانے میں مگن رہا امل کو سر ٹپسا لگائی۔

ریماء کھانے کے وقت یونٹی فوٹ کر پڑتی جیسے کہ وہ

اس کی زندگی کا آخری کھانا ہو۔

اس کا تیزی سے بڑھتا وزن اہل کو تشویش میں مبتلا رکھتا تھا۔

”مکون آئے گا اس آلے کی پوری کو بیاتے۔ آج کل کے لڑکوں کے خُرخے بھی تو بہت ہیں اور گیہوں نہ ہو پوری دنیا کی پہوٹی ایک سو سو ٹن کے جین کے دبائے پر حاضر ہوئی پہلی لڑی پر کیل کی بدولت۔“

بیوی میں ہر وہ خوبی چاہتے ہیں جو کہ کسی ماٹل میں پائی جاتی ہو۔

اہل ایمان کے رشتے کے لیے بڑے ہاتھ پیر ماری
 حصص پر ایک کو کہہ رکھا تھا رشتہ کرانے والوں تک
 کو کہہ رکھا تھا ہر اس گھر میں بڑے غلوں سے جاندار
 جہاں قتل اور اچھے لڑکے پائے جاتے کئی رشتے
 آئے مگر ریمائے بوئے سے قدر بے تحاشا چھوڑا جو
 رشتوں کو لانے پر لوٹا گیا کج کل اہل نے سچی سے
 اس کے کھانے پر بے نظر رکھی ہوئی تھی اہل اکثر سر
 پکڑے دہائی دیتی نظر آتے۔ بچے جب تک چھوٹے
 ہوں ماں باپ کے کنٹرول میں تو ہوتے ہیں بھول
 جوں بڑے ہوتے جاتے ہیں الگ ہی مسائل شروع
 ہو جاتے ہیں۔ بڑے ہوتے بھول کو کنٹرول کرنا زیادہ
 مشکل کام ہے اور جب شادی شدہ ہو جائیں پھر تو مسئلے
 مسائل کا ایک الگ ہی کھانڈا کھل جاتا ہے۔

ہمو اور والدہ کے معاملے میں ایسا کچھ زیادہ خوش
نسیب نہ تھیں ہمو حتیٰ تو اپنے کمرے کو اپنی کل
کائنات سمجھتے ہوئے اسی میں محو ہو- وجہ یہ وجہ منہ
پھلائے رکھنا، ہر بات کو شک کی نگاہ سے دیکھنا میاں پر
پورا کنٹرول اور قبضہ رکھنا باقی بورے گھر سے عجیب
تعلق یہ بھی ایسا کی رائے جو کے سراسر ان کی ہمو کے
مسلے پر مبنی تھی۔

اور رہا والوئسے جب تنگ مزاج اور عصبیل چھوٹی
 چھوٹی باتوں کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر ناراض ہو جانے والا
 تجسب جب وہ انجمن کے ساتھ گھر آنا پورے گھر میں
 ہالی الارٹ ایئر جیسی کا سا سال ہو جا تاکہ
 آج بھی انجمن صبح سے گھرتی ہوئی تھی اس کے
 چاروں بچوں نے پورے گھر میں اودھم مچا رکھا تھا

انجمن تو سر پر برقعہ ڈال محلے بھر کا دون خیر سگالی پر نفی ہوئی بھی بقول اس کے۔

مدرسہ الہی میں تو کاموں کی پہلی میں پہنچی رہتی ہوں۔ کم از کم میرے آکر تو ذرا سکون کا سانس لے لوں۔ اور اس کے سکون کے سانس کے چکر میں ابل اور رہی جاؤں۔ انک جاتی تھیں۔

شہرام کو اس کے میاں شفت کو اسے لینے آنا تھا اور
لازمًا "کھانا بھی کھانا تھا" کھانے میں کسی بھی قسم کی کمی
اس کے موڈ کو بری طرح نہ لگتی تھی اور خود بخود چمن بھی
اسی بات ناراضی ہو جاتی کہ۔

”میرے خیال کی اس کے شہدایانِ شہن کو بھگت کیوں نہیں ہوتی؟“
 اسی لیے سب گمراہوں کی ہر ممکن کوشش ہوتی
 کے والد کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔

رہا بھی اماں کے ہزار بار کہنے پر کھانا پکانے میں کبھی ہوئی تھی یہ اور بات کے اس کی مستقل بیڑیا تھی اس کے بڑے موز کا پتہ دے رہی تھیں۔

”خدا جالبی نہیں بنلا۔ ایمان کا تقاضا یہاں
پڑے اڑے فرما لیں کر رہا تھا۔“

تمہارے اپنے کی فکر تھی ہوں کہ میں کے لیے بھی
کھلتے پکھولے اور تمہاری فرمائشیں الگ پوری کروں
تمہاری اہل خانہ کے دورے سے آئے تو اس سے ہی
کہتا آجاتے ہیں ہر تیسرے دن منہ اٹھا کے ”یہا
خفت تھی ہوئی محمد۔“

اسی گری میں جو لمبے کے سامنے کھڑے ہو کر کلمات
پڑھنا پڑھا تھا، خیر بھی حسب معمول اپنے بچوں کو
لے کر اس کے لیے میں شریف فرما تھا۔ اُن دنوں حتی
القدر اس کا تھکا ہوا رویہ تھا جس میں اس پر حالے میں
زیادہ کلام ان کے بس کا نہ تھا۔ جلد ہی ہائے شہر شروع
کرتی تھیں ویسے تو گر میں جھانڈو پونچھا اور برتن
پکڑے دھونے کے لیے ہاں ہی کمرہ دھوئی اپنا کلام
نہا کے چل جاتی تھی بانی کے پورے دن کے کلام تو
موجود تھے۔

”کیا ہو رہا ہے بھئی بڑی خوشبو میں آ رہی ہیں۔“

ہر ایک کے دروازے میں سرگھسائے جانے والے رہی
 اور کوئی کچھ کر پڑے کی باغیچیں کھل گئیں۔

”اور وہ تو کب آئی؟“
 ”اور وہ تھا تھا ہی لیے سیدھی اندر آئی۔ افواہ کر
 نام قسم کر چکی تو کھڑکیاں سے کتنی شدید گری ہے
 لیکن میں۔“ ”اور وہ نے سے بچھا جلتی کہہ رہی تھی۔
 ”ہاں ہاں چلو دوش میں نے کرتا تھا کر لیا پانی لیاں خود
 لٹائیں گی۔“ ”زیر بار کو لیے لپٹے کمرے میں چلی آئی
 اہل اپنے کمرے میں نمازیں مصروف تھیں۔“

"ہائے رہا! الکی پادری ملتی ہوئی رگت ہے
 تیری یہ چولوں کے سامنے کھڑے ہو ہو کر سب
 پناہیں ہو جائے گی۔" پادرو آسف سے کہہ رہی
 تھی۔

”جی ہاں، اگر جو توتلے میل نہ کرے
 میرے چہرے پر تو واقعی میں تو کلا تو اپنی بن کے رہ
 جاؤں ہماری اہل کو بھی یہ کچھ عجیب و غریب تو ان کی پہنچی نہیں
 تھی کہ وہ لوگوں کا میل بنا رکھا ہے۔“ وہ اپنی سے
 کہہ رہی تھی اور پارو اس کے ہاں میں ہاں ملا رہی
 تھی۔

پارہ اپنی قسم کی اصولی آئینہ بھی پورے مکمل میں۔
اس کی ماں نے پہلی بار لرھول رکھا تھا، جہاں مکمل پھر
کسی عورتوں کی ذاتی ضرورت کی چیزوں سے لے کر
فیضیل، پاول کی کنگ، میک آپ سب دستیاب تھا۔
پارہ اپنی ماں کے بدمذکر کے طور پر کام کرتی تھی اور اپنے
پارہ لر کی چلتی پھرتی ماں بھی تھی لیکن کی طرح تھے
فریک ایو، ہائی لائٹ کے مولڈنگ ہاں ولہنے آپ کو
کسی ایروون سے کم نہ سمجھتی تھی رعایا کی وہ اسکول لایو
تھی پہلے تو اتنی ہی ہوتی نہ تھی۔ لیکن آج کل وائٹ کافی
دوستی چل رہی تھی جس کی پہلی وجہ تو پارہ کی مہارتیں
جو وہ رعایا سے بغیر کوئی معاوضہ لیے کرتی تھی اور ان
مہارتوں کی وجہ تھا، جو پارہ کے دل کو بھا گیا تھا اس
بجاء جیسا انداز اور ماحول تھا۔ بہت بے نیازی سے بڑے
ہاں پارہ کا دل چرا لے گئے تھے مسخو کی طرف سے بھی

پارو کے والدینہ انداز کی پذیرائی ہوتی تھی۔
 پارو جو بچہ، بھی اپنی ماں کے گھر اور پار کی اکلوتی
 وارث تھی، سوچو میرے بچے کی تو لڑائی ہی نکل آتی تھی جو
 پارو اس کی دامن میں جاتی پارو کی ماں کی طرف سے بھی
 ضرب کا کرین سنگل مل چکا تھا اور وہ تو ابھی سے سوچو کو
 والدہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ ماں کا
 تھا جو پارو کو ایک آنکھ پر بندھ کر لیتی تھی۔
 انجمن محلے کے درے سے واپس آتے تھے اس
 کے حیرتیز بولنے پر ماں گھبرا کر کمرے سے نکل
 آتیں۔

”ہائے اللہ! اپنے کو نصیب ہی حرام ہیں مگر
مذلوں سے کیا شکارت کے دوتو ہیں ہی غیر لیکن میرے
اپنے بھی غیر ہو گئے ہیں راتنی دیر سے اکیلی یہاں محض
میں چھٹی ہوں نہ کسی نے میرے بچوں کو کھانے کو پوچھا
نہ جیسے دیکھو ڈرا کیے بچوں کے پیٹ کمر سے چھپے
ہوئے ہیں میں ڈرا سی دیر باہر کیا چلی گئی آپ سے
میرے بچوں کو کھانا تک نہ دیا کیا۔“ انجمن دھواں
دھار ہوتے ہوئے اچانک منہ پر لادشہ رکھ کر کہہ
سکتے

انجمن کا مہلکا چالاک سا بیٹا اسے ساری رپورت
دے چکا تھا، خالد کا کہا ایک ایک لفظ اپنی طرف سے
مزید برہا کر لیں کو بیٹا کا تھکا لیں، ہنسنی سانس بھر کر
اسے منانے سمجھائے گئیں، بیٹی مشکلیں سے انجمن
کے آفتو تھے اس کے بڑے بچے کو باغیچہ کا ٹوٹا ٹھکانا
کہ باہر سے سب بچوں کے لیے کچھ کھانے کو لے
آئے اور خود کچن میں آکر چائے پینے لگیں، کچن سارا
بری طرح پھیلا ہوا تھا، جب تک چائے پتی لکڑی
تک میں موجود برتنوں کا ذخیرہ دھو کر ٹھکانے پر رکھنا
شروع کر دیا۔

”اے بے لعل کن وحصلوں میں لگ گئی ہو۔“
انجمنِ کچن میں چلی آئی۔ اے لویہ برتن کیوں دھوئے
تھیں اس مذہب خرام رکھنا تھا یا اس ممانہائی جہنم کو
بولو، اگر یہ دھیر دھوئے تھیں تو کوئی عرس یہ کام کرنے
کی۔“ لعل خاموشی سے برتن دھو کر گھومتی رہیں پھر

یابیوں میں چائے نکال کر باہر لے آئیں۔ انجمن کی پروڈیوٹ جاری تھی مگر ایک دفعہ بھی اہل کو یہ آفر نہ دی کہ وہ آرام سے بیٹھ جائیں وہ خود ترن وجود سے۔ انجمن کی ہر آمد پر اہل کی بودی ہڈیاں مزید کمزور ہو جاتیا کرتی تھیں۔

اہل اور تباہی سے تیاری میں لگے تھے کیا کے کسی دو پار کے رشتے دار کے انتقال پر تعزیت کرنے جانا تھا اور یہی دوسرے رشتہ دار بھی تھے جن سے عرصے سے ملاقات نہ ہوئی تھی سو آج اپنے چھٹی کر کے یہ کام بنانے کا سوچا اور بذریعہ بس حیدر آباد روانہ ہوئے معزیت وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے کچا زاد بھائی قیام الدین کے گھر کا ارادہ ہوا جو فوج میں ہوا کرتے تھے تمام عمر بھی کسی شہر اور بھی کسی شہر میں بری۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل طور پر حیدر آباد کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ پوچھتے تھے کیا اہل کو لیے آخراں کے گھر پہنچے تھے وہ لوگ بڑی خوش اخلاق اور محبت سے ان کے اہمیت صاف تھا مگر ایک خاص طریقہ اور سلیقہ ہر چیز سے نمایاں تھا مگر کے اندر اور باہر خوشامیوں کے لئے عجب ہمارے رہتے تھے اور ایسا سکون اور اطمینان سا پھیلا ہوا تھا پورے ماحول میں کے آنکھیں آہوں آپ بند ہونے لگیں۔ اہل کے ذہن میں اپنا بکھرا پھیلا سلیقہ سے یکسر خالی گھر محکم رہا تھا۔ قیام الدین انہیں مہمانوں کی طرح ڈراٹنگ روم میں بٹھانے کی بجائے لاؤنج میں لے آئے لاؤنج سے ملحقہ کچن میں ان کی بیٹی چائے کے انتظامات میں مصروف تھی وہیں اگر اس نے سب کو سلام کیا بڑی بڑی آنکھوں والی ساتھی ہی پر کشش لڑکی اہل نے اس کے سلام کا جواب بڑی محبت سے دیا۔ ٹھوڑی دیر میں اس نے کھیل کو مختلف قسم کے لوازمات سے بھر دیا تمام چیزیں گھر کی بیٹی ہوئی تھیں کوئی بھی چیز بازار سے منگوائی ہوئی نہیں تھی۔ بیگم قیام الدین اصرار کر کے ہر چیز کھلا رہی تھیں۔

لبا ہر چیز سے انصاف کر رہے تھے اور دل سے تعریفیں کر رہے تھے اہل نے بھی تمام چیزیں چھینیں اور اپنی دانے کی مغز بھری ہو گئیں۔ گھر واپس پہنچے پہنچے رات ہو گئی تھی۔

”میں گئی ہوں انجمن کے لیڈر خوش ہو گیا قیام الدین کے گھر جا کر اور ان کی بیٹی تو میرا ہے جس گھر میں جاتے کی اس گھر کے نصیب بگاڑے کی۔“ اہل پر خوش سی کمرہ رہی تھیں۔ ایسا کسی سوچ میں کم تھے۔ ”میں کیا ہوا ہے مکالم کم ہیں؟“ اہل نے لیا کا کانڈا ہلایا لیا پوچھ گئے۔

”میں سوچ رہا ہوں بیگم اگر ہم کتنے بد نصیب ہیں کہ اپنے بچوں کو وہ تربیت اور تہذیب نہ دے پائے جو ہمیں دینا چاہیے تھی۔“ اہل ایک دم خاموش سی رہ گئے۔

”ٹھیک کہتے ہیں آپ واقعی کو تھی ہوئی آپ تو مود تھے مگر سے باہر جا کر آپ کو کمائی تھی تمام میں بھی سسرال والوں کی خدمتوں میں اپنے بچوں کو نظر انداز کر گئی۔“ اہل نے اہل کی رنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے کہا شروع کیا مرنے سے ہونے کے طے تم نے اپنی ذمہ داریاں بھائی اور میں نے بڑا بیٹا اور بڑا بھائی بن کر اپنی چھ بیٹیوں بیٹیوں چار بھائیوں کو ان کے دوزخ گار سے لگانے میں مدد دی اہل باپ کو سچ کر لیا آخری وقت ان کی خدمت کی اپنی طرف سے تو تم نے اور میں نے سب کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی مگر کہیں تو کوتاہی ہوئی اور یہ خسارہ ہمارے حصے میں آیا۔“

”چھا چھین چھوڑیں اللہ پر چھوڑیں رب اچھا ہی ہو گا رات بہت ہو گئی ہے سو جائیں۔“ اہل نے لیا کو تسلی دے ہوئے کہا تھا۔

دوسرے دن رات کو کھانے پر اہل اور اہل نے باہم مشورے کے بعد یہ اعلان کیا کہ وہ قیام الدین صاحب کی بیٹی کو ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں یہ خبر سن کر سب نے دانتوں تلے انگلیاں دھالیں۔ سعود تو

ایک فٹ اور اچھل گیا اور احتجاجاً ”واکٹ آؤٹ کر گیا۔“ گھر میں ان کی لڑائی کا عالم ظاہری تھا عرصے کے بعد وہاں سے کھانے کا پروگرام وہیں سے شروع کر دیا۔ چھل سے چھوڑا تھا۔ ہمیشہ سے اہل اور اہل کے فیصلے پر راضی ہو جاتے والا اس وقت بھی اطمینان سے کھانے میں مگن تھا۔

لوہر سعود نے اہل کے سامنے خوب داد دیا ”جیلا“ میں وقت پر انکار کر دینے کی دھمکی بھی دی بھیل اس کے ”جائے کسی فیئر می بائی لڑکی کو پسند کر آئے ہیں۔“

اہل کی تو پسند بھی بہت پرانے زمانے کی تھی اہل اسے سمجھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں مگر اس کی مستقل تاہم پلاٹرو ٹوک لیجے میں رہیں۔

”مجھے پتہ ہے تمہارا ارادہ کہ حشر شادی کرنے کا ہے لیکن میرے چیتے تو یاد اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ اگر اس گھر میں رہنا ہے تو ہماری پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کرنی ہوگی“ ورنہ اپنا کوئی دوسرا ٹھکانہ جو بڑا لونہ مارا چھوڑے کوئی تعلق نہیں۔“ کہہ کر اہل وہاں سے ہٹتی ہیں سعود کا کانٹا انہیں جاتا ہوا کچھ رہا تھا۔ وہ خواتین میں رہنے والا شخص تھا صرف زبانی جمع خرچ کرتا ہی جانتا تھا عملی طور پر کچھ کرنا اس کے لیے ناممکن سی بات تھی سو خاموشی میں ہی عافیت تھی۔

اپنے قیام الدین صاحب کو فون کر کے اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔ انہوں نے کراچی آکر سعود سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر اہل نے فوراً ”نہیں کراچی آنے کی دعوت دے والی۔“ قیام الدین صاحب ان کی بیگم اور بیٹا کراچی آئے اور سعود کو پسند کر گئے۔ بات چلی ہونے کی مشغلی بھی اس وقت کھلی گئی اور آئے والے مہینے کی تاریخ بھی طے کر گئی۔ کیونکہ حیدر آباد آنا جانا اتنا آسان نہ تھا اور دوسرے قیام الدین صاحب ان خراجات کو قلعی پسند نہ کرتے تھے کہ تاریخ طے کرنے کے لیے الگ سے تعزیت منفقہ کی جائے گی

بھی ان کے ہم خیال تھے باقی معاملات فون پر طے کرنے کا کمہ کر دیا لوگ رخصت ہو گئے۔

مطلے بھر میں تاریخ طے ہونے کی مصلحتی بات دی گئی۔ دوسرے دن زوردار انداز میں دروازہ بجنے کی آواز پر رخصتے دروازہ کھولا اور پارو کو کچھ کر تے ان رو گئی۔ کالے رنگ کے سوٹ میں لمبوس سرخ رنگ گلابی گلابی ستور سی آنکھیں چہرے پر اداسی کمال کا سوکار میک اپ تھا پارو کے چہرے پر بخور عیا کو یہ پتہ نہ ہوا کہ سوکار میک اپ بھی ہوا کرتا ہے جو کہ عموماً ”کسی جی اور دکھ کے موقع پر کیا جاتا ہے تو رخصتی پر دھوکہ دے دیا جاتی۔

”ہائے ہائے پارو یہ کیا حال بنا لیا ہے تو نے“ رخصا اسی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے میں لے آئی۔

”میری دنیا اجازت کرا اس کی خوشی میں مٹائیاں بات کر مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ کیا ہوا پارو منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکتے لگی۔

”ہائے پارو احم سے سعود ہائیں بے تصور ہیں۔ یہ سب اہل اور اہل کی شادی کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ بھائی تو اس شادی سے باہل انکاری ہے۔“ رخصا اپنی سسکی کے فم میں برابر کی شریک تھی۔

”کہہ دینا کہہ دینا اس بے وفا کو کہ پارو کی بد دعائیں اسے چین سے نہیں رہنے دیں گی۔“ پارو رخصا سے یہ کہہ کر رو پڑی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔ رخصا شدید تاسف سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی گھر میں خوشگوار سی چل چل شروع ہو گئی تھی اور مقررہ تاریخ پر بڑی دھوم دھام سے سعود کی بارات روانہ ہوئی۔ نکاح ہوا رسومات ادا کی گئیں اور رخصتی کا جذباتی سین دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹپک ٹپک دھن نے رو رو کر دیا ہوا ڈائے نہ شکل دھن کو گھر والوں سے الگ کر کے گاڑی میں بٹھایا گیا اور بارات رخصت ہو گئی۔

سعود نے کمرے میں قدم رکھا اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنی پسندیدگی کے بارے میں محل کرنا ہو

اور بچن میں لگ گئی اور واقعی اس رات ستر خوں پر جو
روح خوشبو میں اور ڈالنے سب کھڑا لیں نے کھائے
وہ اس سے پہلے بھی نہ دیکھے نہ کھائے تھے "اے کیا"
رعباً مندم سب سب بے حد خوش تھے۔ عظیم پروپی انڈی
لا تعلقی کا عالم تھا، خاموشی سے خود بھی کھادی بھی اور
بچوں کو بھی کھلا رہی تھی۔ ثناء کھانے کے بعد بیٹھا
لانے کے لیے بچن کی طرف بڑی اور وہیں لہرا کر صیر
ہوئی جس میں گھر والے بھاگے اسے اٹھا کر جیسی میں ڈالا
جہتل لے جایا گیا اہل ہا اور سعود پریشان سے لالی میں
شمل رہے تھے۔ ثناء اندر کمرے میں بھی بھاگنے
کمرے سے باہر آکر سب کو مبارکباد دی اور ماں بابا کو
دادا دی بے کی خوشخبری سنائی۔

اہل خوشی سے جھوم اٹھیں لیکن ڈاکٹر کے اگلے
الفاظ سے اہل کی تمام خوشی ایک لحظہ ختم ہو گئی وہ
تھکے تھکے قدموں سے پس پڑے بغیر بیٹھ گئیں ڈاکٹر
کے الفاظ اہل کے کان میں گونج رہے تھے۔

"کیونکہ آپ کی بیوی بے حد کمزور ہے اس لیے ہم
نے ان کے لیے بیڈ ریسٹ تجویز کیا ہے صرف گھانا
کھانے اور واش روہ جانے کے لیے بیڈ سے اٹھ سکتی
ہیں باقی ضروری تک کا نام انہیں بیڈ پر صرف آرام
کرتے ہوئے گزارنا ہو گا۔"

اہل خلی خلی نگاہوں سے کبھی ڈاکٹر کو کبھی خوشی
سے بے حال سعود اور بھی آیا کو سختی چلی گئیں اچانک
ہی انہیں نگاہ کہ ان کے اندر کی تھکان پریدہ رہی ہے،
دو جی ہو رہی ہے ان کے منہ سے کراہی نکلی۔

ایچو نکے

"کیا ہوا نیک بخت؟"
"کچھ نہیں" اہل بولیں اور اہل کے ہاتھ کا سارا لے
کر تھکے تھکے قدموں سے باہر کی طرف جانے والے
راستے پر چل دیں۔



جتاؤے گا اور یہ بھی کہ وہ اس کے لیے کوئی حیثیت
نہیں رکھتی اور اسے اپنی اوقات میں رہنا ہو گا کمرے
میں خاموشی تھی وہ کس نظر نہیں کرتی تھی کھٹکے سے
واش روہ کا دروازہ کھلا اور وہ واش روہ سے برآمد ہوئی۔
سعود نے نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھیں اور منہ
کھلے کا کھلا رہ گیا وہ خدا کی پناہ معصوم حسن کی دلکشی
دہانے کا حسین روپ اور چلبلی جھپک جھپک کر
دیکھنے کا قاتل انداز سعود چاروں طرف سے جت ہو چکا تھا۔
رعب حسن نے کچھ کہنے کے لائق ہی نہ تھوڑا بس یاد
تھا تو اس کی قیمت کا اور اپنی خوشی کے احساس۔

ولیمہ بھی خوشی سے گزر گیا چوٹی چالے کی
رسمیں بھی ہو گئیں ریمان رخصت ہوئے اور تمام گھر
دوبارہ سے اپنی پرانی روش پر لوٹ آیا ماں نے ثناء سے
کھیر پکولی بھی کروالی تھی کھیر تو اہل نے ہی پکائی تھی
بس ثناء نے رکھی سا بچہ چلا دیا تھا۔

اہل مطمئن کہ اب کرنا تو سب چھوٹی ہو کوئی ہے۔
شادی کے بعد سے سعود باقاعدہ اہل کے ساتھ دکان پر
جا رہا تھا دکان سے واپسی پر سعود آکر اپنے کمرے میں
غائب ہو جاتا شام میں دونوں تیار ہو کر باہر نکلتے اور
انہیں ٹھونسنے پھرنے پہلے جاتے یہ تمام سلسلے یومی
جاری و ساری تھے۔

اہل اب جتنے قلمی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب
ثناء گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کرے گی کب
اس کے ہاتھ کے لذیذ کھانے انہیں نصیب ہوں گے
اور کچھ دن انتظار کے بعد اہل نے خود ہی یہ ذکر پھیر دیا
کے بھی۔

"ثناء اب اپنے گھر کو سنبھالو اور ہمیں چھٹی دو۔
جہیں معلوم ہے کہ وہی ہو گا کہ گھر میں جمعیت اور
میں ہی اس پر حجاب میں قلمی رہتی ہوں اب تم آئی ہو
باتو اب وہی طریقہ سلیقہ جو تمہارے گھر میں تھا یہاں
بھی رائج کر دو جسے دیکھ کر ہم نے تمہیں پسند کیا تھا۔"
اہل کہہ رہی تھیں۔

"جی اہل آج سے آپ آرام کریں اور میں سب
گھر کے کام کروں گی۔" ثناء قہقہے سے کہہ کر اٹھی



بے اختیاریاں بتاتے لگتا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ میری ہر بات میں صرف میری اپنی ہی اغراض کا طویل سلسلہ چھتا رہتا۔ خیر خیر بتایا گیا کہ وہ ہو گیا نہیں سے زیادہ نہ میں اس کی پروا کرتا تھا میری طبیعت اس طرف مائل تھی کہ میں کسی کی ایسی فکر کر سکوں۔

اور اس کے جواب میں وہ مجھے آٹھ صفحوں کا طویل خط لکھتی یا آٹھ لائٹوں کا صرف میری ہی پروا میری ہی فکر میرے ہی بارے میں تردد میرے کھانے پینے سے لے کر میری پڑھائی تک کی وہ حد سے بڑھ کر فکر کرتی۔ بلکہ اگر آپ سے مبالغہ نہ سمجھیں تو میرا دل خیال لگتی کہ کیا میری سبھی فکر لکھتی ہوگی۔

وہ کون تھی! میری سبھی خیالات کی بیٹی نائلہ! ایشیا، ہم بچپن میں ساتھ کھیلے ساتھ لے پڑھے تھے۔ میرے اپنے دو بھائی اور دو بہنیں اور ہمیں لیکن نائلہ کا کوئی بھائی نہیں تھا، وہ تین بہنیں ہی تھیں اور ان میں بھی نائلہ سب سے بڑی تھی۔

اس کا اپنا کوئی بھائی نہیں تھا، اس لیے یا اپنے گھر میں بڑی تھی اس لیے یہ بڑا بن تو اس کی طبیعت میں کھلا ہوا تھا وہ ہر کسی کے لیے اتنی ہی شخصیات اور دو گارڈز ہو جاتی تھی۔

مگر میری طرف آتے آتے ان چیزوں میں جان دے والے کی حد تک ہوش اور جنون شامل ہو جاتا۔ میں سب جانتا، سب دیکھتا تھا، میں کیا سب جانتے تھے۔

نائلہ تو عدیل کے لیے جان تک دے سکتی ہے، دونوں میں دوستی ہی اتنی گہری ہے، بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، شہر سے ہی ان کی آپس

وہ میرے خط کا لپٹا انتظار کرتی کہ کیا میری رائے رائجے کا انتظار کرتی ہوگی۔ حالانکہ میرے کسی خط کو الف لیلی کی داستان کی خوشبو تک نہ پہنچی ہوگی۔ بھلا میں کیا میری وفا کو جانوں یا رائجے کی محبت کو بچوں۔ سیدھے سپاٹ چند لفظ لکھ ڈالتا۔ زیادہ سے زیادہ خالص لڑکوں والے لطیفے لکھ بھیجتا یا اپنی الجھنیں پریشانیاں، بھی استہول کی زیادتیاں یا دوستوں کی

تلافی



میں جتنی بہت ہے۔
اسی طرح کی باتیں سب جانتے تھے اور کہتے تھے
کوئی ایسی سیدھی بات کوئی برا خیال نہ کسی کے دل
میں آسکتا نہ زبان پر اس لیے کہ ہمارے درمیان کوئی
اشارے نکالنے والا یا ڈھکا چھپا جذبہ ہی نہ تھا۔
بہت پہلے جب ہم سینئر اسکول میں پڑھتے تھے تب
ہی ملے کر لیا تھا کہ ہم آپس میں بہت اچھے دوست تھے
دوست ہیں۔ ہماری معمول میں بھی تقریباً ڈیڑھ سال
کا فرق تھا۔

”اوی محل سے بڑا ہوتا ہے قد کاٹھ یا سالوں سے
نہیں اور تمہاری عقل تو مجھ سے پانچ سال چھوٹی
ہے۔“ وہ اس ڈیڑھ سال کے فرق کو بھی گردانتی نہ
تھی۔ ایک اور سلسلہ بھی تھا اس کی والدہ میری سہیلی
خالہ تھیں اور ساتھ ہی اس کے والد میرے والد کے
انتہائی گھرے اور بچپن کے دوست تھے لہذا جانتے ہیں
کہ جب ان کی شادی ملے ہوئی تو ایک دن یونہی ازراہ
مذاق احتیازاً انکل کی والدہ نے کہا۔

”بیٹا اگر تمہاری منگیتری کوئی بہن ہو تو اسے بھی
دکھا دو شاید پسند آجائے تو ایک ہی گھر میں دونوں کی
شادی کر دیتے ہیں۔ تم لوگوں کے لیے آسانی رہے گی
کیا خیال ہے جناب آپ کا یہ دونوں لڑکے تو سائے کی
طرح ایک دوسرے سے چنے رہتے ہیں۔“ پھر انہوں
نے اپنے میاں سے پوچھا۔

”خیال تو بہت اچھا ہے ان لڑکوں سے ہی پوچھ
لو۔“

”بہن تو ہے آنٹی اور بہت زبردست ہے میری والدی
سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔“ سچ بتاؤں انکل اس
نے تو دیکھ بھی رہی تھی۔

”گوئے جھوٹے کیوں الزام لگا رہا ہے، جسم سے لبا!
یہ بکواس کر رہا ہے، میں نے کوئی لڑکی دوڑی نہیں
دیکھی۔“ وہ بیٹھا گئے۔

”چلو بیٹا کوئی بات نہیں، نہیں دیکھی تو اب دیکھ
لو۔“ یوں لڑکی دیکھ کر پسند بھی کر لی تھی اور دونوں
دوستوں کی ایک سی گھر میں شادی ہو گئی۔

آئی مکئی میں ہی خالہ کو دیکھ کر امتیاز انکل زندگی
میں پہلی بار مجھ جذباتی سے ضرور ہوئے تھے اور
سرسری طور پر مذاق میں اس کا ذکر کیا ہے بھی کیا لیکن
دل میں ابلی ہوئی خاموش آرزویوں لہریں ہو جانے لگی
انہیں خبر نہ تھی۔ اس ایک بات پر امتیاز انکل ساری
زندگی خالہ کے ساتھ بول دھجھتے بن اور محبت سے گزار
رہے تھے کہ کہیں شکر گزاری میں کوئی کوتاہی نہ
ہو جائے۔

نانکھ کو اس کے والدین کے خوشگوار اور نرم مزاج
طرز زندگی نے ہی اتنا شعور اور پامورت بنایا تھا۔ وہ ہر
کسی کا خیال رکھتی، ہر کسی کی پروا کرتی نہ کبھی جھکتی
تھی نہ وقت کی کمی کا شکار ہوتی۔ بلا کا مبر تھا اس کے
اندروں کمال کا عرف مجھے سے لال پلے ہوتے یا کسی
سے حسد کرتے میں نے کیا کسی نے بھی اسے نہ دیکھا
تھا۔

ایسی لڑکیاں ہر کسی کا عزیز مل ہو سکتی ہیں وہ بھی
لے میں توازن کا انداز چھٹو جو ایک مخصوص سطح سے
لوہر بھی نہ جاتا تھا۔ لہذا اس نے ریڈیو جس کی آواز کا
بائیں بھی اور دائیں کو بھی ملتی نہ تنگ سیٹ کر کے توڑ
دیا گیا۔ کسی بھی معاملے میں اس کی توازن سے
اوجھتی نہ ہوا کرتی تھی۔ اپنی اس عاقبت کی وجہ سے وہ
خاندان کی لڑکیوں میں مشکل بنی ہوئی تھی۔

”تم تقریری مقابلے میں حصہ لے رہی ہو؟“
”کیوں تمہارے خیال میں کیا مجھے بولنا نہیں
آتا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ارے تقریر کرنے کے لیے جس پرورے کالج
کے سامنے چلا کر بولنا پڑے گا اور تمہاری تو آواز
ہی نہیں نکلتی۔“

”کیوں مائیک کس لیے ہوتا ہے خود چلانے کی کیا
ضرورت ہے؟“

”پھر بھی لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے جوش اور
تیزی تو دکھانی پڑتی ہے۔“ میں اس کا مذاق اڑاتے
ہوئے اسے قائل کر رہا تھا۔

”جنا ہے جب رسرسل ہو رہی تھی تو میری ٹیچر نے

کہا مضمون کی خلافت میں جو بحث آپ نے لکھے
ہیں انہیں تو آپ کو اونچی آواز میں بولنا پڑے گا۔ مگر
میں نے کہا نہیں میڈم میں اونچی آواز میں تو تقریر
نہیں کروں گی لیکن مجھے پتا ہے کہ میں اچھی تقریر
کروں گی۔“

اس نے واقعی اچھی تقریر کی اور اسے دو سرائے انعام
ملے۔

”دیکھا میں نہ کتنا تھا کہ یہ چننے چلانے والی عورتیں
آج کل ہر جگہ میڈم بن رہی ہیں۔“ مقابلے کا احوال
سن کر میں نے اس سے کہا۔

”مجھے نہیں لگتا کہ اس کے گرم جوش لیے اور تیز
آواز کی وجہ سے اسے پہلا انعام ملا اس کی تقریر میں
چند پوائنٹس واقعی بہت ملاؤ تھے۔“

”تمہاری انیلہ امتیاز محال ہے جو کسی سے جھلس
ہو جائے۔“ میں ہنس دیا۔

”ارے دوستوں کے ساتھ گھومنے جا رہا ہوں یہ
تمہارا بیٹا یا حلوہ کبھی ساتھ لیے لیے پھوٹے گا۔“

”میرے گھر تم نہ کھانا میں اپنے چوکیدار کو دیتی
ہوں وہ بھی تو بے چارہ اپنے گاؤں ہی جا رہا ہے وہاں
بھی شدید سردی ہوئی تو زانو نہ جھٹکتے میں اٹھاؤں گا تو
اسے زیادہ سردی نہ لگے گی۔“ غریب آدمی دعا میں بھی
دے لگے۔ ”اس نے خوب صورت سے بیچ پاس میں
محببتوں سے بیٹا حلوہ واپس لے لیا اور پلٹ کر جانے
لگی۔“

”وہ اگر چوکیدار کو ہی دیتا ہے تو میں پنچاؤں گا“
ہمارا گزران کے گاؤں سے بھی ہو گا۔“

”رہے ہو اب تم کبھی اٹھائے اٹھائے پھوٹے گا۔“
”شباب کی نیت ہے اٹھاؤں گا نا!“ میں نے لپک
کر پاس اس کے ساتھ سے چھین لیا۔

”اگر نہ پنچایا نا تو“ اس نے تنبیہ کرتے ہوئے
انگلی اٹھائی لیکن میں نے اس کی بات نہ کی۔
”بھئی راستے میں بھوک لگی تو کھالوں گا۔“ میں
پشیمان کا تودہ بھی مسکرا دی۔

”بھوہ شکر ہے کہتا ہے دو بول تعریف کے ہی نہ

سے نکالے کہ اگلے کاٹی بڑا ہو۔“ میری بیوی بہن جتنا
کٹانے کہا تو وہیں انورجی میں پڑی ڈانٹ لگ کر
صاف کر دی تھیں۔
”ارے کیا اس کاٹی بڑا ہو گا تو یہ اگلی دفعہ پورا اٹھل
پٹا کر لے آئے گی۔“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ ہنسنے
لگیں۔

”تم کو ذرا قدر نہیں۔“ جتنا آپا کی دو مہینے بعد شادی
ہوئے والی تھی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔
”مجھے یاد ہے وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے پہلی گئی
تھی۔ اگر میری لارو اسیوں پر ملاں ہونے والی ہوئی تو
کب کی ماپوس ہو چکی ہوتی۔“

شام کو جب میں خالہ کو خیر حاضرت کئے گیا تو وہ اپنے
ہی جوش سے مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اگر گرم پڑے لے
لیے ہیں نا اور کوٹ رکھا اور اونٹنی ٹپٹی مغللوں کو اور گرم
موڑے لیے یا نہیں۔ ”یوں جیسے میں پاکستان چھوڑ کر
لندن یا سوئٹزر لینڈ جا رہا ہوں۔“

”سب کچھ رکھ لیا ہے بی بی اور نہ بھی رکھا ہو تو
راستے میں سب کچھ مل جائے گا۔“

”جب وہاں کی سردی خالہ کے ساتھ مجھے ضرور یاد کرو
گے،“ مزن عدیل عمران! ”جب وہ زیادہ جڑتی تو مجھے اسی
طرح میرے ہاتھ اور رشتے کو لگا کر پکارتی۔“

”بھئی اینٹ آبلو اور تنہا کھلی ہی تو جا رہے ہیں
زیادہ سے زیادہ چرال پلے جائیں گے اور یوں بھی کوئی
پکلی بار بار فٹھنے ٹھوڑی جا رہا ہوں نہ ذرا ڈنپ فریزر
میں دیکھا رہتا ہوں۔“

”ہاں بیٹا! اٹھیکسی تو کہہ رہا ہے تم زیادہ تر وزن کرو
پھر ڈنپ فریزر ہی میں تو جا رہا ہے۔“ امتیاز انکل نے
ایسا مجھے لایا جواب کیا کہ بس۔

اس وقت میں کامرس کالج میں پڑھتا تھا۔ کالج ہی
کے دوست مل کر بالائی علاقوں کی سیر کے لیے جا رہے
تھے۔ نانکھ امتیاز کی بے چینی بتا رہی تھی کہ اسے میرا
آٹھ اوس دن کے لیے گھر سے متا رہتا اچھا نہیں
لگ رہا۔ بہر حال کسی کی ٹاپنڈی کی پر زندگی کا سفر رک

میری اہی جان بھی کچھ آپ سیٹ تھیں وہ تو لپانے بہت آسرا دلایا کہ "ہمارا بچہ اب کچھ نہیں رہا ہے دنیا میں کھوئے گا پھرے گا تو کئی وار بنے گا۔ ناورنہ اہی جان بھی بلی بڑا کرتے والی نہ تھیں۔"

خیر خیریت کے لیے جب اہی یا آتا ہے بات ہوتی ایک مخصوص جملہ سننے میں آتا تھا کہ "خاص طور پر تمہاری خیریت پوچھی ہے۔ اس کا پوچھنا یقیناً" اتنا خاص ہی ہوتا ہوگا کہ مجھ سے ذکر لازمی تھا۔ میں جواب میں ہوں یا نہی اچھا ہی کہتا اور بس۔

میں جب واپس آیا تو حنا آپ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

نانکھ نے دوستی "رشتہ داری" موت "سب بھائی" ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی "لیکن اس نے اپنے گھر کی شادی بھی یوں ہی حنا کیا اس سے بہت لاڈ کرتی تھیں اور بدلے میں کیسے ممکن تھا کہ نالکھ امتیاز ان کے لاڈ کا صلہ نہ دے۔"

"میں بھی نہ والا کرتا شلوار مندی میں کچھ خاص موزن دے گا۔ تمہاری پوائس بھی بس ایسی ہے۔" اس نے میرے شوق سے بہانے مندی کے سوٹ کو دھجکت کر دیا۔

"تو خوب صورت کھر لیا ہے" آخر بڑا بھائی ہوں مجھے بھی سویرہ کھنا چاہیے یا حملہ اور جینو جیسے کھر لے لوں۔" میں نے چھوٹے بھائیوں کا نام لیا۔

"ہاں تو بڑے بھائی ہی ہوتا یا میں تو نہیں ہو اور حنا آپ سے تو چھوٹے ہی ہونا چاہیں بھی جینہ اور حملہ جیسا ہی سوٹ بنانا چاہیے۔"

"اگرے لوہے اتھنگ سوٹ اس کا کیا کروں گا؟"

یہ سوٹ تم لوہے میں پکن لیتا۔ "لوہے میں کرتا شلوار پنوں کا؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں نالکھ اب تھری ہیں سوٹ پنیں گے اور میں کرتا شلوار۔"

"تو تم سے کس نے کہا تھا کہ یہ آف وائن کھر کا سوٹ مندی کے لیے خرید لو اسی ڈھنگ کے آدمی

سے مشورہ تو کر لیتے۔"

"اپنے دوست کے ساتھ گیا تھا اس نے مشورہ دیا کہ تمہارے لیے کہیے کھر اچھا رہے گا۔"

"تو یہ ہے" دوست بھی اپنے جیسا بد وقت ڈھونڈا ہے مجھ سے پوچھ تو لیتے۔"

"خیر وار میرے دوست احسان کو کچھ نہ کہتا" میرا تمہارا بھڑا ہو جائے گا۔"

"میں تم دوست کو کچھ نہیں کہہ رہی صرف تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ میں نے اس کی پوری بات نہ سنی۔"

"تم ہمیشہ صرف یہ سمجھاتی ہو کہ مجھے تمہارے علاوہ کسی سے کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔"

"نہاں" یہ کرتا شلوار لے کر آپ خود چل کر میرے پاس آئے ہیں۔"

"لیکن اب میں یہ کرتا شلوار لے کر واپس جا رہا ہوں" حال ہے جو بھی تم نے میری پسند کی دلوری ہو۔" میں چڑکھتا تھا۔

"پسند بھی تو اس قابل ہو۔" وہ جیسے بولی۔

مجھے اب ناو کیا اس بات پر نہیں کہ اسے میری چچا پسند نہ آئی "لیکن اس بات پر کہ اب مجھے پھر بار بار کی خاک چھانا تھی۔ ممکن نہیں تھا کہ میں اس کی کوئی بات ٹالوں "جائے میرے لیے اس کے مشورے استے اہم کیوں تھے۔"

میری بچپن سے عادت تھی میں چھوٹی بڑی کسی بھی بات میں الجھتا تو دوڑا ہوا اسی کے پاس جاتا۔

حنا آپ کی شادی کے فوراً بعد ہی چھوٹی بہن شاکا بھی بہت اچھی جگہ رشتے ہو گیا۔ آپ کو خوش اور مطمئن ہونا چاہیے تھا کہ دونوں بیٹیوں کے اچھی جگہ رشتے ہو گئے "اسی طرح اہی جان کو بھی ہر سکون ہو جانا چاہیے تھا کہ چلو بیٹیوں کے فرض سے تو لو اٹھیں ہوئی۔ لیکن میرے والدین اپنی بیٹیوں کے بعد میری خالہ کی بیٹیوں کے لیے بھی اسی جانفشانی سے تنگ دو کر رہے تھے۔"

"بس اس ذکر کو آگے نہ بڑھانا ایسی باتیں بہت جلدی پھیل جاتی ہیں" بلاوجہ نالکھ کے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔"

میرے والدین نالکھ کے بارے میں یوں شکرتے تھے جیسے وہ خدا خواست تیز بارش میں بھیک رہی ہو یا کڑی دھوپ میں کھلے آسمان کے نیچے پڑی ہو۔

جائے آیا اور اہی کا یوں اس کے رشتے کے بارے میں پریشان ہونا مجھے اس وقت کیوں باور لگ رہا تھا۔

چند ہی دنوں میں میرے امتحان شروع ہونے والے تھے میں سب کچھ چھوڑ کر پڑھائی میں مگن ہو گیا۔ مجھے آگے بڑھنے کے لیے بہت محنت اور جدوجہد کرنی تھی "یونکہ مجھے پڑھائی کے لیے باہر جانا تھا یہ اس وقت ممکن تھا جب میرے تمام مضامین میں بہترین نمبر آتے۔ سو اب میں تھا اور میری پڑھائی اور اس کے ساتھ ہی نالکھ امتیاز کی نوازشوں اور عنایتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔"

"خوب پڑھائی ہو رہی ہے" جب میں کتابوں کے ڈھیر میں سر جھکا کر بیٹھا تھا وہ میرے پاس آئی تھی۔

"یہ آنا کس بھی بڑی مصیبت چیز ہے یا رہتا نہیں کیوں پڑھائی جاتی ہے" میں چڑا بیٹھا تھا۔

"میں نے تو سنا ہے بہت آسان محسوس ہے۔"

"نہاں نالکھ آسان ہے" انتہائی پورے تھک ہے۔"

"پڑھنا تو بڑے کا اگر اچھے کر دے لائے ہیں تو۔"

"پڑھ تو رہا ہوں سب کیا کہوں کر پڑھاؤں؟"

"اسنے آگے آگے ہوئے ہو ایسے موڈ میں کیسے پڑھائی ہو سکتی ہے۔"

"یاد اور اصل صبح فجر سے پہلے اٹھ کر جتنی پڑھائی ہو سکتی ہے ویسی پڑھائی سارے دن میں نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں تو صبح جلدی اٹھ جایا کرو رات کو جلدی سو جایا کرو۔"

"میں نے ایسا ہی خطرناک قسم کا نام نہیں بتایا ضرور ہے "لیکن اس پر عمل کون کر لائے۔"

اہی جان کو نالکھ کی تو بڑی فکر رہتی۔ شاکا شادی ہونے والی تھی اور نالکھ کی ابھی کہیں بات نہیں تھی تھی۔ دونوں تقریباً "ہم عمری" تھیں۔

"نہاں بارہی تھی کہ اس نے منہ سے اپنی نالکھ کا ذکر کیا تھا۔ ان کا بیٹا بہت لائق ہے" ایک بڑی کچھنی میں اچھی جانب کرتا ہے "ویسے باپ کا بھی بہت اچھا کاروبار ہے" لڑکا ٹیک اور شریف بھی ہے "بس ایک نظر اپنی نالکھ کو دیکھ لیں باپ کی بیٹیوں کیسے نہیں بنتی۔ اہی بہت بڑی خوش ہو رہی تھیں۔"

"حنا کی بڑی دلی مندی بات کر رہی ہو؟" لپانے پوچھا۔

"جی ہاں جو کلفشن رہتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے" حکم الین وہ لوگ استے زیادہ شریف بھی نہیں ہیں۔"

"اچھا! حنا تو کہہ رہی تھی کہ۔"

"حنا ابھی بچی ہے اس کی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے جو وہ اپنی سسرال کے ہر فرد کو پچھان لے گی۔ وہ تو آپ سے وہی کچھ کہے گی تاہو اسے اس کے گھر والے ہٹاتے ہوں گے۔"

"جیسے تو آپ ٹھیک ہی ہیں۔"

"تم پریشان نہ ہو میں نے بھی چند ایک لوگوں سے کہہ رکھا ہے "من شاء اللہ جلدی باتیں بن جائے گی۔"

"نالکھ کے بارے میں عجیب سی فکر رہتی ہے۔"

اہی کہہ رہی تھیں۔

"ہاں نالکھ کا رشتہ جلد اچھی جگہ ہو جائے تو مالک کا کرم ہو" پھر اس کے بعد سویرا اور میرا تو ابھی چھوٹی ہیں۔"

"سویرا کو تو میں نے اپنے عدیل کے لیے پسند کر لیا ہے۔"

"میں بھی گئی بڑا فیصلہ نہ کرتا بیچوں کا رشتہ تو کچھ لینا ضروری ہوتا ہے۔" آپ نے فوراً "تنبیہ کی۔"

"میں کسی اور سے تھوڑی کہہ رہی ہوں جی میں یہ بات بہت عرصے سے ہے" صرف آپ سے ذکر کیا ہے۔"

"میں کیا مشکل ہے؟ تم تو ہمیشہ صبح جلدی اٹھ کر ہی پڑھائی کیا کرتے ہو نا؟"

"مگر کوئی اٹھانے والا بھی تو چاہیے؟ اللہ ہو تو میں اٹھتا نہیں، جتنا تا صبح جب تک میٹھ جے پاگل پر فکٹ نا پڑے اٹھانے پہنچ جاتیں اور پھر میں جب تک اٹھ کر منہ نہ دھو لیتا وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں نہیں جاتی تھیں۔ اب امی کو تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا اور شادی خیر تو مشورہ ہے، خود بین باندوں پر نہ اٹھو دوسروں کو کیا اٹھانے کی۔"

"چلو اب میں تمہیں اٹھا دیا کروں گی۔"

"تم کسے اٹھاؤ گی؟"

"فون کروں گی اور کہلاؤ۔"

"فون پر میں نہیں اٹھنے والا۔ ان گھنٹیوں پر اٹھنے کی عادت نہیں ہے، جسب تو خود اٹھو۔"

"میرے فون پر اٹھ جاؤ گے۔"

"رہنے دو میں خود ہی اللہ م پر اٹھنے کی عادت ڈال لوں گا، آخر تم بھی مجھے کب تک اٹھاؤ گی۔"

"جب تک تمہاری پڑھائی جاری رہے گی۔"

"میری پڑھائی تو ختم کی جائے گی، ابھی سال ہوں پھر اگلے سال باہر پڑھنا پڑے گا۔"

"کہاں جاؤ گے؟ امریکا، یورپ یا آسٹریلیا؟ فون تو ہر جگہ جاسکتا ہے۔"

"میں کرو، لیے لیے دعوے نہ کرو۔" میں اس کے اتنے زیادہ غلو سے کبھی بھی خائف ہو جاتا تھا۔

"کیا ساری زندگی تمہاری پڑھائی جاری رہے گی؟"

"اگرے، مجھی ساری زندگی کی کیا بات؟ تم اس ایک سال کی گارنٹی نہیں دے سکتیں، کیا پتا اگلے مہینے ہی یا ویسے سدھار جاؤ، میں سبے چارہ تو آگرے میں ہی رہ جاؤں گا۔"

"میری بات یہ وہ چپ کی چپ رہ گئی، کوئی جواب ہی نہ دیا، دو منٹ مشکل سے گزرے کہ وہ کھڑی ہوئی۔"

"اچھا میں جاری ہوں۔"

"کیوں کوئی کام یاد آ گیا کیا؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں اور چلی گئی۔ میں

تھوڑی دیر بیٹھا اس کے رویے پر غور کرتا رہا اور پھر اپنی عادت کے مطابق ساری بات بحال کر لیا۔

☆ ☆ ☆

اسے خود خبر تھی کہ ان دنوں گھر میں اس کے رشتے کے لیے بہت تک دو ہو رہی تھی۔ خالہ اور امی تو جنرل مل ٹیمیں اسی موضوع پر سرگھاری ہو تیں۔ اس نے اپنے رویے سے گھر والوں کے سامنے اس ذکر پر بھی تار اسی یا چڑا کا اٹھانہ کیا تھا، لیکن کبھی دلچسپی بھی نہ دکھائی تھی۔

دوسری بار بھی باتوں باتوں میں جب میں نے اس ذکر کو چھیڑا تھا تو مجھے یاد ہے اس نے بڑی خود اکتوی سے جواب دیا تھا، اس دن ہم سب کزنز مل کر بیٹھے ہوئے تھے، شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں ان بہنوں کا ہمارے گھر آنا زیادہ رہتا تھا۔

"اب سارے فنکشنز میں چار چار لڑکی کی اہلی تو نہیں پڑھوں گی، میرے پاؤں دکھ جائیں گے،" ٹانے کی بات کے جواب میں تجزی سے کہہ۔

"تمہارا وہ ٹونا ایسا ضرورت سے زیادہ لمبا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور؟" نائلہ کہہ رہی تھی۔

"تمہارے لیے چھوٹے قد کا بندہ ڈھونڈیں گے،" ٹھیکے سے؟ ٹانے فوری جواب دیا۔

"کیوں میرے لیے لڑکا ڈھونڈنے تم جاری ہو کیا؟"

"ڈھونڈوں گی نہیں، لیکن اوکے تو میں ہی کروں گی،" آخر تمہاری بہترین دوست ہوں۔" ٹانے کے جواب پر میں خاموش نہ رہا۔

"پاگل لفظ اس کا بہت فریڈ تو میں ہوں، لہذا اس طرح کے تمام اختیارات میرے پر دے کر دے دے جاؤں گی۔"

"آپ تو رہنے ہی ہیں عدیل بھائی، آپ کی چوائس تو ہماری ایسا کو ذرہ بھر پسند نہیں ہے۔" میرا لے لے۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے، ان معاملات میں تو نائلہ ضرور مجھ پر بھروسہ کرے گی۔"

"مجھی یہ کوئی ایسا عجیبہ مسئلہ بھی نہیں ہے۔" رسمی اختیارات تو میں ہر کسی کو دینے کے لیے تیار ہوں۔

"ہو شیاری دیکھیں محترمہ کی کمرہ ہی میں رسمی اختیارات یعنی اصل کی یہ خوبیاں کب ہیں۔"

"تف کو برس ۲ اصل اختیارات تو ہر بندے کے اپنے ہی ہوتے ہیں۔"

پھر جس طرح استحقاقوں کے لیے رات تین اور چار بجے مجھے اٹھانے کے لیے اس نے خوار ہی اٹھائی وہ غلیظت میرے لیے ضرور ناقابل فراموش تھی، کیونکہ میں اس کی خدمت گزار یوں کا قطعاً کوئی بدلہ چکانے والا نہیں تھا۔

اسے خود صبح کالج کے لیے ساڑھے چھ بجے اٹھنا پڑتا تھا، اور سنا اپنی کی عادت کے برعکس اس کی اپنی نیند بڑی وحیث تھی، مجھی مشکل سے آلی تھی اتنی ہی آسانی سے اڑ جا یا کرتی تھی۔

شروع شروع میں تو میں اس کے فون پر پاگل نہ اٹھتا تھا بلکہ بار بار فون کٹ دیتا، اس نے بہت زیادہ کٹیں، بجائیں تو پہلے دن تو فون بند کر کے ہی سو گیا۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ عاجز ہو کر اٹھنا چھوڑ دے۔

اسی لیے دوسرے دن بھی میں نے یہ ہی حرکت کی۔ اس دن وہ غصے سے لال چلی میرے پاس آئی۔

"اب اگر تم نے اپنا میاں ل بند کیا تو میں تمہارے لاؤنج میں پڑے اس فون پر رات کے تین بجے کل کروں گی اور صبح کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔" وہ دھم دھم کرتی اسی طرح دلیس چلی گئی اور وہ اپنی بات کی پکی جی یقیناً، کو مئی رات کو کوئی سی ایل پر کل کر کے سارے گھر کو اٹھا سکتی تھی، سنا اپنا نائلہ ایذا دہ کہ تم اپنے ارادے سے باز نہیں آؤ گی۔ لاؤنج کا فون تو میں بند کرنے سے رہا۔ اسی لیے تیسرے دن فون اٹھا کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

"تم نے اللہ کا نام لگا کر شروع کر دیا ہے؟"

"ہاں روزانہ تین بجے سے آگے تو مجھے کھنسنے کے وقت سے اللہ کا کرنا ہوں۔"

"پھر اللہ جانتے ہو نا؟"

"پھر اللہ تمہارے فون کی گھنٹی کو اللہ اللہ کی ناک میں دم کر دینے والی آوازیں ساری رات اس شور سے اچھے بھڑکے گزر جاتی ہے۔ صبح بھر کے لیے جب لیا اٹھاتے ہیں تب اٹھ جاتا ہوں۔" میں نے اپنی ناک کی ناک مارجا لے تھوڑا سا ہنسنے لگی۔

آخر مجھے عادت پڑ گئی اس کے فون پر اٹھنے کی۔

"تھینک یو، میں اٹھ گیا ہوں۔" میں نیند میں کہتا۔

"ایسے نہیں بستر سے نکلنا اور جا کے منہ دھوؤ۔" وہ مجھے فون پر بدستیر دیتی۔

"پچھلایا اب یہ دیکھو میں نے بستر چھوڑ دیا، اب تم سو جاؤ۔"

"جھوٹا تم ابھی تک بستر میں ہی پڑے ہو۔"

ایک تو میں اس کی پچھنی جس سے تنگ تھا۔

"۳۰ فون تم جان نہیں چھوڑو گی یہ دیکھو میں نے بستر چھوڑ دیا، چادر پھینک دی ہے اور اب واش روم میں کھڑا ہوں، تمہیں تنگ کی آواز آرہی ہو گی۔" میں اٹھ کر اڑا ہوتا۔

"اوکے گاڑ لک۔" وہ فون بند کر دیتی۔ اور پھر جب فجر تک میری اچھی خاصی پڑھائی ہو جاتی تو میں اسے دعا میں دیتا۔

جس دن میرا آخری پیچہ تھا میں فارغ ہو کر سیدھا اس کے پاس گیا۔ وہ عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی۔

"تم اس عمر میں اتنی لمبی دعائیں کیسے مانگ لیتی ہو؟"

"ارے دعا کا عمر سے کیا تعلق ہے، آرزوئیں اور امنیں تو یوں بھی اسی عمر میں زیادہ ہوتی ہیں، اور ہم تو اللہ کے خود غرض بندے ہیں اس سے دنیا ہی دنیا مانگتے رہتے ہیں۔"

"اچھا اس وقت کیا دعا مانگ رہی ہو، بتاؤ؟" میں نے اس کی کسی گہری یا مشکل بات میں اچھے سے مگر نہ کیا۔

"ابھی تو میں صرف استحقاقوں میں کامیابی کے لیے

دعا میں ہی مانگتی رہتی ہوں۔ اس نے سلامی سے کہا۔
 "اتنی دیر سے یہ ہی ایک دعا مانگ رہی تھیں؟"
 مجھے اندازہ نہیں ہوا کیا بہت زیادہ دیر ہو گئی۔
 اس کا معصوم چہرہ اور معصوم سوال میری نظموں کے
 سامنے سے نہائی نہیں۔
 "نالکہ! ایسے ابھی تو تمہارے امتحان شروع ہونے
 میں بہت دن پڑے ہیں۔ ابھی سے اتنی دعا میں! ابھی
 تم ضرور ناپ کر دے گی۔"

"ارے بدحواس! تمہاری کلیدیالی کے لیے دعا نہیں
 کر رہی ہوں میرے امتحان کی تو ابھی آج بھی نہیں
 آئی۔" اس نے اتنی روانی سے کہا "لیکن میرا دل دھک
 سے رہ گیا۔ وہ کیوں میری ذات میں اتنی شدت سے
 اتلا رہی ہوئی چلی جا رہی ہے؟"
 "کیا آؤس کریم کھلانے کا ارادہ ملتی کر رہا ہے۔"
 پیچھے سے نکلی آئی کواڑنے مجھے چونکا دیا۔ ایسے بھی
 میں اس کی اس بات کا کوئی مناسب جواب دے نہیں
 پا سکتی۔

"جسٹس! نہیں چلو بس یہ تمہاری نالکہ بی بی کو
 اٹھانے میں اتنی دیر لگ گئی۔"
 امتحان ختم ہونے کی خوشی میں میں چوڑے ہنسنے لگی
 بھائیوں کو آؤس کریم کھلانے کے بار بار اٹھاؤ نالکہ! سویرا
 اور سمیرا کو بھی بلایا کیوں ابھی سب سے زیادہ حق نالکہ کا
 تھا۔

شاکی شادی ہو گئی تو میری ای کچھ دنوں کے لیے
 بہت بولانی بولانی پھر بس ہم تینوں بھائی اکثر بڑی بہنوں
 کو یاد کرتے آج بھی پھر باؤس ہو جاتے۔
 "ہی! آپ نے شاکی شادی بہت جلدی کر دی ہم
 بالکل اکیلے ہو گئے ہیں۔" میں ایک دن بول ہی پڑا۔
 "میں اکیس کہتے ہو بیٹا! اچھا ہے ہم اپنے فرائض
 سے سبکدوش ہو گئے۔ اللہ کا بڑا کریم ہے لڑکیاں جتنی
 جلدی اپنے گھر کی ہو جائیں یہی اچھا ہے۔" میری
 ملا کی ایک ہی سوچ تھی۔ میں اس کو بدل نہیں سکتا تھا

اور بدلنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ لیکن بہنوں سے گھر میں
 بڑی رونق تھی ایک فرق یہ بھی پڑا تھا کہ نالکہ اور اس
 کی بہنوں کا بھی ہمارے گھر آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ ورنہ یہ
 تقریباً روزانہ کا ہی معمول تھا کبھی یہ دھڑکتا تھا
 کبھی ہم کوھر طے جاتے میں تو اسے حسب سے ہی
 خالہ کے گھر چلا کر آتا تھا، لیکن میں اگلا آنے جانے کا
 حسب برابر کیسے کر سکتا تھا۔ نالکہ کے امتحان بھی
 ہونے والے تھے اور وہ پڑھائی پر بھی بہت توجہ دے
 رہی تھی۔

"اب تم میرے لیے دعا کرو کہ میرے بہت اچھے
 مارکس آجائیں اور ابھی مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے
 کی اجازت دے دیں۔"
 "جسٹس! تم بھی پڑھاؤ کے اچھے مارکس نہ آئیں
 گے تو کیا ہم جیسے کمکوں کے آئیں گے۔ تم تو نالکے
 ہی لواڑی لگی ہو۔"

ایک تو وہ پڑھائی میں بہت تیز تھی اور سے امتحان
 دے کر ہی مچھتی تھیں کا نتیجہ تو بیٹھ ہی بہت اچھا آتا تھا۔
 "ہر کوشش کے بعد دعا بہت لازمی ہوتی ہے عدل!
 میرا عقیدہ ہے کہ جو کام کسی صورت نہیں ہو پاتے وہ
 دعا سے ہو جاتے ہیں۔"
 "جسٹس! تم جیسے اچھین کامل میرے پاس تو نہیں، لیکن
 دعاؤ کروں گا کیونکہ تم نے میرے لیے بہت دعائیں کی
 ہیں۔"

"تم کیا اس دعا کا بدلہ چکاؤ گے جو میں نے تمہارے
 لیے کی ہے؟"
 "ہرگز نہیں بدلہ تو میں چکا ہی نہیں سکتا، نالکہ! تم
 جانتی ہو کہ میں تمہارے کسی بھی غلوں کا کوئی بدلہ
 نہیں چکا سکتا۔" وہ کچھ بھی نہ بولی، لیکن اس کا پورا
 دھڑکا ہوا سوال تھا کہ آخر کیوں؟ میں نے جانے کیوں
 دھیان نہ دیا۔ اور میں نے تو بھی بھی دھیان نہ دیا تھا
 اگر دیتا تو اس کمائی کو کسی اور ہی طرف سے بیان کر دیا
 ہوتا۔
 "وہیے تم چاہے ٹاپ ہی کر لو، میڈیکل میں داخلہ
 جیسے امتحان اٹھانے نہ دلوانا میں گے۔"

"کیوں بھلا اس طرح کیوں کہ رہے ہو یہ میری
 زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔"
 "ارے خالہ! اور میری اہل تو تمہاری شادی کے
 ورے ہیں کہ ابھی رشتے لے ابھی نکاح پر رضا دیں اور تم
 ایسے انوکھے خواب کو دے رہی ہو۔"
 "جسٹس! تمہیں کیا اعتراض ہے میں تو صرف جنہیں
 دعا کرنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ
 جب میرا بہت اچھا نتیجہ آئے گا تو اب ضرور میرا ساتھ
 دیں گے۔"

"خیر اعتراض تو مجھے بھی ہے مجھے خود بھی نہیں
 پسند لڑکیوں کا یوں کاجوں اور پونڈر سٹیوں میں مارے
 مارے پھرتا، جب تک کہ انتہائی مجبوری نہ ہو۔" میں
 نے اکر کر یہ بات کہہ دی، لیکن وہ میری بات کو ٹیلے سے
 ہٹانے لگی اس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔
 پھر سب نے نہ کہا کہ اس نے دل لگا کر بھلا محنت
 سے کبھی جی نہ چرانے والی نالکہ امتحان کا نتیجہ بھی بہت
 اچھا آیا۔ لیکن اس نے خود سے بکھن نہ کیا کہ آگے
 کیا کرنا چاہتی ہے۔

خالہ نے تو صاف کہہ دیا کہ بس اب آگے بڑھنے کی
 کوئی ضرورت نہیں، گھر میں بیٹھ کر سلامی کرنا چاہی اور
 کھانا پکانا وغیرہ سیکھ لے۔ حالانکہ خالہ ابھی طرح
 جانتی تھیں کہ وہ یہ سب کام پڑھائی کے ساتھ ساتھ
 بھی کر رہی تھی اور اچھے خالص کر رہی تھی۔ امتحان
 اٹھانے والی تھی طور پر بیٹی کی مرضی اور شوق کو مار دینے
 کے حق میں نہ ہو گے۔

"میں جانتا ہوں کہ جس آگے بڑھنے کا شوق ہے
 اور تم واکٹر بننا چاہتی ہو، لیکن تم جانتی ہو مٹا کہ لڑکوں
 کے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھنا ہماری جیلی میں کچھ
 اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔"
 امتحان اٹھانے کے لیے جیران رو گئے، جب
 اس نے بہت معذرت مندی سے "جی! ہو کہہ۔"
 "لیکن اگر تم چاہو تو کر لڑ کالج سے گریجویشن
 کر لو۔"
 "اب اگر مناسب سمجھتے ہیں تو یہی ٹھیک ہے۔"

اس کی وہ فیل ہوا دی مجھے ہلانے میں ملتی۔
 "تم نے اٹھل سے بات ہی نہیں کی۔" جب ساری
 بات میں نے سنی تو حیرت سے اس سے پوچھا۔
 "کیا بات کروں؟ جب انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا
 ہی نہیں۔"
 "لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ اچھا رزلٹ کیا تو تم
 اٹھل کو ملادگی۔"
 "جب کسی کی بھی مرضی نہیں تو ایسی بات پر میں کیا
 اچھوں؟"

مجھے اس کا وہی اس وقت قطعی سمجھ میں نہ
 آیا تھا۔ اور اپنی طبیعت کی بے پروائی کے سبب میں
 نے معاملے کو زیادہ کھینچنے کی کوشش بھی نہ کی۔

ان ہی دنوں میرا رزلٹ بھی آیا تھا اور میرے چار
 مضامین میں اے گریڈ آئے تھے، خوشی سے میرا حال
 بیان سے باہر تھا۔ مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر آسان لگ
 رہی تھی۔

"یار احسان! میں دن رات وہ ساتھ جانے کے لیے
 راضی نہیں ہے۔"
 "پہلے تو تم نے بتایا تھا کہ وہ پڑھائی کے لیے باہر
 جانے میں تم سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے، بلکہ تم تو اس
 معاملے میں اسے جذباتی اور جذباتی تک کہتے رہے ہو،
 کہ نہیں۔"

"ارے ایسا ویسا بہننی! امتحان کے دنوں میں مجھ
 سے فون پر بات تک نہیں کرتا تھا۔ کتنا تھا وقت ضائع
 نہ ہو جائے، کن دنوں ایسا اتنی کیڑا لڑا کہ اللہ کی پناہ کھانا
 کھائے تو تک سناٹے ہو سونے کے لیے بستر میں
 پڑے تو تک تھکے پر رکھی ہو، جاگ کر ٹیک پر تک
 لے کر دوڑا تھا، سچی کہ کالج آنے جانے کے راستے میں
 بھی تک اس کے ساتھ میں ہی ہو گئی۔"
 "اس طرح کوئی کیسے پڑھ سکتا ہے؟"
 "لیکن وہ اسی طرح پڑھتا تھا۔"
 میں حسب عادت اپنے مسائل نالکہ سے شیر

کر رہا تھا احسان کے رویے پر مجھے پہلے تو شدید ناراضی اور پھر جرتی ہوئی تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ ہر نہیں جاسکے گا۔

"تم اس سے وجہ تو پوچھو آخر ہر بات کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح میرے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھ کر بیٹھ گئی تھی۔"

"میں نے بتایا ہی نہیں۔"

"تم نے دھمک سے پوچھا ہی نہیں ہو گا۔"

"ہاں یہ تو ہے، پہلے تو مجھے اس کی بات سن کر تو جی آگیا، میں نے اسے دو چار کھری کھری سنا ڈالیں، پھر اس کا موڈ خراب ہو گیا، اس نے زیادہ بات نہ کی اور چلا ہی گیا۔" میں ذرا چپ ہوں۔ "پھر رات کو بھی میں نے اسے نین پار فون کیا۔ وہ مجھے ڈانٹتی رہا، وجہ نہ بتائی۔"

میں نے آگے بات بتائی۔

"ہر غصے اور دکھ کا فوراً اظہار نہیں کرنا چاہیے، صبر! بعض دفعہ روئیں کا فوری اظہار دوستوں اور چاہنے والوں کو لذت میں مبتلا کر دیتا ہے وہ نہیں جا رہا یا نہیں جاسکتا، اس کا دکھ نہیں تو ہو گا لیکن اسے خود کتنا ہو گا، تم نے غصوں کرنے کی کوشش نہ کی۔" وہ سچ کہہ رہی تھی۔ میں تو یہ ہی سوچ سوچ کر آئے سے باہر ہوا جا رہا تھا کہ اس نے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا اور اب نہیں جا رہا، یعنی وعدہ خلافی کر رہا ہے، اس کی مجبوری اس کا دکھ اس کی پریشانی یہ سب معاملے تو میں نے زیادہ سوچے بھی نہیں۔ میں ایسا ہی تھا خود پسند اور خود غرض سا بندہ، جذموں اور محبتوں کی کچی پروانچھے نصیب ہی نہ ہوتی تھی۔

پھر کئی دنوں احسان مجھ سے کھڑا، کھڑا رہا اور میں افسردہ، افسردہ پھر رہا۔ جب کہ اپنے اپنے اچھے رزلٹ کی خوشی تکمیل سے اتنی جاری تھی رزلٹ، داخلہ، جانے کی تیاریاں، میرے سارے معاملے آسانی سے منٹ رہے تھے، لیکن قرار نہ آ رہا تھا۔ ہاں مگر قرار اس وقت آیا جب نالکہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔

"میں احسان کے لیے دعا کروں گی کہ اس کے

سارے مسئلے حل ہو جائیں۔"

"تم احسان کے لیے کیوں دعا کرو گی؟"

"صرف تمہاری خاطر۔" اس نے کانٹے اچکائے۔

وہ اپنے خواب، اپنی تمنا میں بھول چکی تھی، ڈاکٹر بننے کی آرزو، اپنے نیک کان میں پڑھنے کا جنون جانے سب شوق کیا ہوئے اس کے چہرے پر ابوی کی کوئی لکیر بھی نظر نہ آئی، ایک میں بے وقوف تھا، ذرا سے رنج کو داستان غم بنا کر چہرے پر اشتیاری لگایا تھا کہ سب گھروالے پلٹ پلٹ کر پوچھتے۔

"گلیا ہوا عدیل احسان کے جانے کا کچھ ارادہ نظر آیا۔" جیسے احسان کی انگلی پکڑ کر ہی مجھے کراچی پر پورٹ سے لندن تک پہنچا تھا، اس کے کندھے پر سوار ہو کر وہاں کانچ میں داخل ہوا تھا، اور اسی کی کوئی میں سر رکھ کر مجھے وہاں دو سال گزارتے تھے۔ تف ہے مود ہو کر سارے کی اس قدر آس میں نے اپنے اوپر لعنت ملا مت کی اور اپنے مزاج کی اچھی خاصی خبر لی۔

جب میں سوچ کا اندازہ لاتا تو میں نے احسان کو بھی جالیا اور اس سے پوچھ ہی نہ سکا کہ ایسی کیا مجبوری آڑے آئی ہے کہ وہ جانے سے گریزاں ہے۔ اور اس نے بتا بھی دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے پہلے اس طرح اس سے پوچھا ہی نہ تھا، بے غرض ہو کر وہی مسئلہ کہ اس کی بہن کی شادی طے ہو گئی تھی اور اخراجات کی طویل فہرست تھی، جو ختم ہونے میں نہ آ رہی تھی، ان حالات میں اس کے والدین اس کی پریشانی کا کوئی خرچہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔

"تمہاری تو فون اسکا رشیپ ہے یا ر! ایسا کوئی خاص خرچہ تو نہیں آئے گا۔"

"ایک ایک ایک ہی رٹ سے کہ میں پورے ایک سال تک نہیں کچھ نہیں دے سکوں گا، خود کچھ کر سکتے ہو تو کرو اور طے جاؤ۔"

"لوہ خدا یا! اتنی سی بات تھی جس کو تم نے ہوا بنایا ہو ا تھا۔ تم جانے کی تیاری کرو، ہم دونوں مل کر خرچے

کا کچھ نہ کچھ انتظام کر لیں گے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے میرے جیک اور میں ہمیں سمجھا نہیں سکا، کیا کو مطمئن کرنا پڑے دل کر دے کا کام ہے، تمہارا کیا خیال ہے میں اسے دونوں سے کچھ نہیں کر رہا، محض ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوں۔"

"میں نے سوچا کہ کیا لیکن یہ ضرور کہہ رہا ہوں کہ ہم دونوں مل کر کچھ کریں گے تو بات ضرور بن جائے گی۔"

احسان کا تعلق کرنا چاہیے کہ اوسط درجے کے گھرانے سے تھا۔ جیل پر اکثر ضروریات کو میاں کی کہہ کر ترک کرنا پڑتا اور کبھی بھی تو حقیقی ضروریات کے بھی خانے بنانے پڑتے کہ ضروری، بہت ضروری اور اتنی ضروری کہ جن کے بغیر گزارا ممکن نہیں۔

"تم جو ٹیوشن پڑھاتے ہو اس کی آمدنی کچھ بڑھ نہیں سکتی؟"

"وہ کچھ اولیوں کے امتحان میں دو مہینے رہ گئے ہیں اور ہمارے پاس بھی دو دو حالتی مہینے تو ہیں ہی میرے اپنے علاقے کے کوچنگ سینٹر کے ہیڈ سے بات ہوئی ہے۔

"میں انکو مشن کے لیے ٹیوشن کی ضرورت پڑے گی۔"

کوئی نہ آخر میں آئے والے بچوں کو یہ لوگ منع کر دیتے ہیں کہ اب ہمارے پاس کتنی مشن نہیں، میں نے کہا اگر کتنی مشن کر لیں تو وہ مہینے تک ایک کلاس کو میں پڑھاؤں گا۔"

"ہاں اس طرح کافی میس جمع ہو جائیں گے، ہمیں کیا لگتا ہے کام بن جائے گا؟"

"ان کے پاس جگہ کا مسئلہ ہو شاید، کیونکہ ساری کلاس رات گزارنے تک بالکل سیک ہوئی ہیں۔ پھر انتظامیہ منع بھی کر سکتی ہے۔"

"یاد رکھو کوچنگ سینٹر کو چھوڑنا، ان سارے بچوں کو جمع کر کے تم خود ہی ایک کلاس بناؤ، اس طرح ساری فیس ہمیں ہی مل جائے گی، تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے، لیکن چینیس، تیس لڑکوں کو میں کلاس بنھاؤں گا؟"

اپنے گھر میں اپنے گھر میں پہلی قسم کی کمی تھی، ضرورت تو پڑے گی، یہی کہہ رہا تھا۔

"میں نے سوچا کہ کیا لیکن یہ ضرور کہہ رہا ہوں کہ ہم دونوں مل کر کچھ کریں گے تو بات ضرور بن جائے گی۔"

احسان کا تعلق کرنا چاہیے کہ اوسط درجے کے گھرانے سے تھا۔ جیل پر اکثر ضروریات کو میاں کی کہہ کر ترک کرنا پڑتا اور کبھی بھی تو حقیقی ضروریات کے بھی خانے بنانے پڑتے کہ ضروری، بہت ضروری اور اتنی ضروری کہ جن کے بغیر گزارا ممکن نہیں۔

"تم جو ٹیوشن پڑھاتے ہو اس کی آمدنی کچھ بڑھ نہیں سکتی؟"

"وہ کچھ اولیوں کے امتحان میں دو مہینے رہ گئے ہیں اور ہمارے پاس بھی دو دو حالتی مہینے تو ہیں ہی میرے اپنے علاقے کے کوچنگ سینٹر کے ہیڈ سے بات ہوئی ہے۔

"میں انکو مشن کے لیے ٹیوشن کی ضرورت پڑے گی۔"

کوئی نہ آخر میں آئے والے بچوں کو یہ لوگ منع کر دیتے ہیں کہ اب ہمارے پاس کتنی مشن نہیں، میں نے کہا اگر کتنی مشن کر لیں تو وہ مہینے تک ایک کلاس کو میں پڑھاؤں گا۔"

"ہاں اس طرح کافی میس جمع ہو جائیں گے، ہمیں کیا لگتا ہے کام بن جائے گا؟"

"ان کے پاس جگہ کا مسئلہ ہو شاید، کیونکہ ساری کلاس رات گزارنے تک بالکل سیک ہوئی ہیں۔ پھر انتظامیہ منع بھی کر سکتی ہے۔"

"یاد رکھو کوچنگ سینٹر کو چھوڑنا، ان سارے بچوں کو جمع کر کے تم خود ہی ایک کلاس بناؤ، اس طرح ساری فیس ہمیں ہی مل جائے گی، تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے، لیکن چینیس، تیس لڑکوں کو میں کلاس بنھاؤں گا؟"

ہو۔ میں اس کی ہر کوشش ناکام کرتا تھا اور اس کے بعد اس کی دعائیں کتنی طویل ہوتی جاری تھیں یہ مجھے ہی خبر تھی۔ جب وہ سرائی گری میں شغل دیکھنے لگا تو میں نے مزید کہا۔

”والدین کی دعا تمہارے ساتھ ہے نا“
 ”وہ تو ہے لیکن۔“
 ”دشش اگر ان کی دعا اور اپنی محنت پر یقین ہے تو یقین کیوں؟“

پھر اگلے آٹھ دن میں انیس کرسیاں اور پھر گئیں صرف ایک خالی رہ گئی یہ دعا کافی اثر تھا اور اس کی جی کھری محنت کا کہ چند دنوں میں اس کا چرچا ہونے لگا تھا۔ آخری ایک لڑکا بالکل ایک مہینے پہلے آیا تھا اور اس کے ساتھ وہ لڑکے اور تھے۔ وہ بھی ضرورت مند تھے سارا سال یوشن کی فیس نہیں لاسکتے تھے۔ سارا سال نہیں تو کم سے کم امتحان کے تین مہینے پہلے تو رہائی شروع کر دینی چاہیے نا۔

”آپ بے فکر رہیں ہم سارا سال پریشان ہونے لے دیں گے۔“
 ”ایک مہینے میں کیا ہو سکتا ہے، دو مہینے ہی آپ آجاتے تو۔“

”سرا آپ جو کچھ کرا سکیں، کرا لیں، چند مشکل ٹاپک ہیں وہ ضرور ایک مہینے میں ہو جائیں گے۔“
 احسان اس لیے ٹال رہا تھا کہ اپنی طبیعت کے مطابق وہ انہیں اوروں سے کام پر چھوڑ نہیں سکتا تھا اور پورا کام کروانے کا مطلب تھا ذلیل محنت وہ بے چارہ دست تھک جاتا تھا۔

جلانے کی تیاری کے ساتھ اس کی بہن کی شادی بھی ہو رہی تھی۔ وہ چونکہ بڑا بھائی تھا اس لیے اس ذمہ داری میں بھی اس کا ہوا ساتھ وہ تلازی تھا اس کے نیا تھوڑے زیادہ ہی سخت مزاج تھے لیکن اسی کی طرح جی دار اور محنتی تھے دل ہی دل میں بیٹے کی بڑی قدر کرتے اور اس کا بہت خیال رکھنے کی کوشش بھی

کرتے لیکن ان کا اپنا نظریہ تھا۔
 ”فری اور محنت کو اتنا ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ مو کو کمزور کر دے۔“ ابھی تو اس کی زندگی میں آگے بہت کچھ راستے ہیں۔“ ایک دن وہ پونہ کی کسی بات پر مجھ سے کہہ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کچھ زندگی کی سختی اور بے رحمی تو اور نمایاں ہے مجھ جیسے نرم بستر میں سو کر اور چند جماعتیں اچھے نمبروں سے پاس کر کے سمجھتے ہیں ہم نے خود پر اپنے والدین پر اور دنیا پر بڑا احسان کیا۔

یہ ساری بات میں نے ناکام سے کہی۔
 ”احسان اچھا دوست اور ساتھی ہے، اسے کبھی چھوڑنا نہیں۔“
 ”میں کیا اسے چھوڑوں وہ خود اب تو مجھے کبھی نہ چھوڑے گا۔“ میں ہنسنا تو میرا لہجہ ناکام کو ناگوار لگا۔
 ”بڑے وقت میں ذرا اس اس کا ساتھ کیوں نہ تمہارے دل میں غور نے جنم لے لیا۔“ اس کے نوکسنے پر میں چونک گیا۔

”ہاں واقعی، ہمسا تو میں نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا کہ مفروضہ ہو جاؤں۔“
 بڑا خیر ناکام کی دعائیں احسان کی کوشش میں کے والدین کی حوصلہ افزائی سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن قائد اعظم انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر احسان میرے ساتھ لندن جانے کے لیے کھڑا تھا۔ ہم دونوں دوست جانتے تھے کہ یہ دن بڑی تنگ دھوکے بعد آیا ہے اور آگے سفر بہت محنت طلب اور دشمن ہے لیکن کامیابی کا پختہ ارادہ ہم نے دل میں کر ہی لیا تھا۔

دو سال وہی چیزوں کے سارے گزارے ناکام کے خللوں اور احسان کی بے لوث دوستی دنیا کا خوب صورت ترین شہر جہاں تمام جدید سہولیات موجود تھیں نہ قانون شکنی تھی نہ ہزاروں تعلیم کی بے قدری لیکن ہم پاکستانی مروجہ خاص کر مجھ جیہوں کی پسندیدہ روایات کی یہاں ذرا بھر نگاہ نہ تھی پہلی بار مغربی

جائزہ چائے کی طلب تو چائے مل گئی بھوکا کھنے پہلے کھانا مل گیا اور وہ بھی اپنی پسند اسنے مطلب کا کبھی بھولے سے اپنے کپڑے اسٹری نہ کیے تھے دھونا تو دور کی بات ہے اور کسی کی یہ جرأت کہ مجھ سے کہہ دے کہ اپنی بنیان، بڑائیں خود حوصلوں میں کھنکھنے والے کا منہ ہی نہ لگاؤں۔

یہاں پہلی بار کپڑے ڈرائی کلین کرنے کے لیے دے آیا ابھی پلٹ کر واپس کر کے میں پتھاپوں گا کہ پیچھے سے دستک ہوگی۔

”میری سرائی آپ خود حوصلے۔“ یہ انگریزوں کا بڑا مکمل ہے۔

کہ سوری سرا اور یس مڑ کر چاہے آپ کو آگے سے چلیاں ہی سنا ڈالیں۔ شروع شروع میں تو جواب میں لوگوں کے سوا ہمیں بھی کچھ یاد نہ آتا تھا۔

”تم نے کپڑے ڈرائی کلین کے لیے دے دیے تھے؟“
 ابھی تو میں جراب اور بنیان کا نام سنا رہا تھا کہ اگلے دن احسان میرے دھلے کپڑے لیے مجھے آنکھیں دکھانا میرے سامنے کھڑا تھا۔

”ہاں یاد دہل گئے؟“ وہ ابھی یہ تو بہترین دھلے پڑے۔

”آپ ان کپڑوں کو نہ دیکھیں میرے جگر اس بل کو دیکھ لیں۔“ اس نے کپڑوں کا یکٹ پیچھے کر لیا اور بل سامنے کر دیا۔

”بارہ پونڈ۔“

”میں اس نے صرف کپڑے دھوئے ہیں انہوں نے غلطی سے نئے تو نہیں بیچ دیے۔“ میں دیکھنے لگا۔

میرے ہی کپڑے تھے۔
 ”بھائی! تم یہاں پر مٹے آئے ہو یا اپنی مون منانے بلکہ یہاں اپنی مون منانے کے لیے آئے والے بھی کوئی گولی ہی اتنی عیاشی کر سکتے ہیں۔“

”میری تو یہ“ میں تو بھی یہاں اپنی مون منانے نہ آؤں، کو نہ بیٹھ کر کپڑے خود حوصلے! اپنے مری سوات گلخانہ کاران، گلگت ہنزہ و ہرے ہیں کیا؟“

”آپ بھول جاؤ اپنا پاکستان اور پاپا پاکستان یہاں

تم نے پاکستانی بن رہے کی کوشش کی تو وہاں سب کا مزہ دیکھنے میں ہی پورا کر ڈالو گے۔“
 ”اسندہ اپنے کپڑے خود دھوئے اور خود ہی اسٹری کرنے ہیں مستعد مل!“

”یہ زیادتی ہے۔“ مجھے خبر تھی کہ یہاں سب کلم اپنے ہاتھ سے کرتے پڑتے ہیں لیکن ان سب کاموں کی تفصیلات پر میں نے بھی غور نہیں کیا تھا۔ خیر میرے جیسے اسپون فیڈر اور مٹی ڈیڈی بچوں کو ان انگریزوں نے خوب سیدھا کرنے کی کھلی ہوئی تھی۔

ایک آئندہ کھانے کا پی چاہے تو خود دوا مل کر دیا فری کر دینا چاہیے تو خود اسٹور جا کر لے کر سر دوسے پیٹے یا آپ تھک کر چور ہو گئے ہوں کوئی آپ کو ایک چائے کی بنائی بنا کر ملانے والا نہیں ملے گا پاکستان کی ان نعمتوں کی صحیح معنوں میں آپ قدر ہو رہی تھی جنہیں میرے جیسے لوگ استغناء حقیر سمجھتے تھے۔

پہلے چار پانچ دن تو بہت ذیول حالی میں گزرے میں تو ان چار دنوں میں کپڑے اور ہاتھ رو دھونے کے دیکھ سے ہی نہ ٹھکا۔ احسان جی دار رہتا تھا کسی کام سے نہ گھبراتا تھا بلکہ میرے کام بھی کرنے کو تیار رہتا لیکن میری غیرت اس بات پر چلی گئی تھی کہ جو کام مشکل ہے وہ احسان کرے اور میں صورت نکلا رہوں۔

پہلی بار کپڑے دھونے میں جو مشکل ہوئی اسے دیکھ کر وہ سری بار احسان نے پیچھے سے میرے کپڑے بھی دھو دیے۔ لیکن میں بہت براہم ہوا۔

”تم مجھے سچا مل کا مٹا سمجھ رہے ہو یا اپنا باک جن کی خدمت تم پر فرض ہو۔“

میں اپنے مزاج کے مطابق جلد ہی چلنے لگا تھا۔ لیکن احسان کے ساتھ کی دعا ناکام نے یونہی نہیں کی تھی۔

میں نے جو قہوڑی بہت مدت اس کی یہاں آنے سے پہلے کی تھی اس بندے نے اس کا بڑھ چڑھ کر بدلہ چکایا قدم قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا میری چڑ اور غصے کو برداشت کیا۔

دستی کے اس اصول کو تو جانتا تھا کہ میرے کام کو دینے سے نہیں میرا حوصلہ بڑھانے سے وہ میری مشکل آسان کر سکتا تھا۔ گھبرا ہوا وہ خود تھا چونکہ یہاں آنے سے پہلے ہم دونوں ہی احسان کی مشکل حل کرنے کے چکر میں آئے مصروف تھے کہ اور کسی طرف دھیان نہ کیا۔

ورنہ یہاں آنے والے اکثر لوگ تو لڑکیاں تھوڑی بہت سمجھ بوجھ حاصل کر کے اپنا ذہن بنا کر آیا کرتے تھے۔ سب سے پہلی ہوشیاری تو یہ تھی کہ یہاں پہرے کس طرح بچا کر اور معقول طریقے سے خرچ کرنا چاہیے۔ دوسرا تھوڑا بہت کھانا پینے کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے آنے چاہئیں۔ گو ہمارے اور ان کے کھانا پینے کے طریقوں میں نشن آہن کا فرق ہے لیکن اگر بنیادی اصول پتا ہوں تو بڑی آسانی رہتی ہے میرے جیسے نہیں کہ ایک چائے پانی بھی نہ سیکھی اور جہاز میں بیٹھ کر لندن چل پڑے۔

”یار! ہم تو یہاں پڑھنے آئے تھے یہ کن چٹکیوں میں پڑ گئے ہیں؟“
 ”گاہک یہ ہوا کہ کھانا پانا اور گھر کے کام کافی کرنا یہاں پورے رشتے میں پڑھنے سے زیادہ مشکل کام ہے جو ہمارے ہاں کی خواتین انتہائی مہارت سے کر سکتی ہیں اس کا مطلب وہ ہم سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین ہیں۔“

”جی ہے یاد رکھو وہ ڈکٹیٹ آف ورک جس پر ہم دوسری گلاس میں مضمون لکھا کرتے تھے اس کا اصل مفہوم یہاں آکر سمجھ آیا ہے عظیم کی عظمت کو یہ لوگ پہچانتے ہیں۔“ یہی بات میں نے نامک کو لکھ کر بھیجی تو اس کا جواب بڑا سخت تھا۔

”عظیم کی عظمت نہیں یہ لوگ پیسے کی عظمت مانتے ہیں کوئی کسی کو بلاوجہ اور بغیر اجرت کے پانی کا گلاس بھر کر بھی نہ پلائے دو منٹ ٹوک کر کسی سے نرمی سے بات بھی نہ کرے یہاں اگر تم وہ پانچ سو پانچوٹے ملے کرو گے جنہیں پھر کھٹے ایک پانی کا گلاس بھر کر پیش کرے ہر خدمت کو یہ لوگ کیش کرا لیتے ہیں۔ لیکن

ایک جذبہ ہے محبت جس کی عظمت کو یہ لوگ قلعی نہیں جانتے مگر ہمارے ہاں لوگ اسی جذبے میں مبتلا ہو کر صرف ایک پانی کے گلاس کے لیے پھاڑ کود کر حاضر نکل سکتے ہیں۔“

”تم تو جانتی ہو کہیں دوست! میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اچھالی کو صرف اس لیے نہیں رہی بھٹک کر رہنا چاہیے کہ وہ دوسرے کی ملکیت میں جلی گئی ہے۔ کام کی عظمت کو بھی ہمارے ہاں بھی بہت مقدم جانا جاتا تھا لیکن اب اس کی کیسی پتھری ہوئی ہے۔ عورت ہو یا مرد جسے پہلا ہوا اپنی خدمت کو لانے کے خاتمے میں فٹ کر دیں میں وہ اسی خانے میں دیا پار ہے۔

یہ کیا کہ ایک بندہ مل کر پانی بھی نہ پیے اور چار عورتیں جو گھر میں رہتی ہیں ماں ہو بیٹی ہو بیوی ہو کہ بہن اس کی بی بی حضوری میں سارا وقت اور سہ لوجھ دوڑتی پھریں آج پوچھو تو مجھے یہاں آکر پتا چلا کہ کپڑے اور ہاتھ روم دھونا دینا کے مشکل ترین کام ہیں جو ہمارے ہاں کی عورتیں ہلا چوں چہ آگئی رہتی ہیں۔“

”دیکھو یہ ساری خدمتیں عورتیں ہی کر رہی ہیں تو ظلم ہے لیکن اپنی خوشی سے کریں تو محبت سے اور ہمارے ہاں اکثر عورتیں اپنے گھر کے کاموں کی خدمت محبت میں ہی کرتی ہیں اس لیے کہ یہ عورتوں کے لیے رفق کمانے کا وسیلہ ہیں ان کو تحفظ اور اعتبار دیتے ہیں۔“

”کچھ نہیں دیتے بلکہ انہی کی ہوتی جھٹکتے ہیں۔ یہاں دیکھو عورت اتنی بالاعتبار ہے خود کمانی ہے خود کھاتی ہے بھال ہے جو کسی کے دباؤ میں آئے۔“
 ہماری بحث رکنے میں نہ آئی لیکن میں اچانک بہت مصروف ہو گیا۔ راجحالی کا بوجہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس نے جو جواب لکھا تھا وہ ڈھنگ سے پڑھنے کی بھی مجھے کوئی دن تک فرصت نہ ملی تھی۔

لیکن جب میں نے دھیان سے پڑھا تو پتا لگا بھٹ ختم کرنے کی بات اس نے خود ہی کر دی۔
 ”اس مسئلے پر ہماری بحث یہی ہو جائے گی بہتر یہ ہے کہ دو سال بعد جب تم کو تو اچھی طرح پھر غور کر لیتا کہ بہتری کی حالت میں وہاں کی عورت ہے یا اپنے

ملک میں ملنا اچھا ہے۔“
 آہستہ آہستہ مشکلوں کے ساتھ جینے کی عادت ہو گئی۔ جن کاموں کو سرور سوار کر لیا تھا وہ اب ہم چٹکیوں میں کر لیتے تھے غلطی جو ہو گئے پھر وہ مسٹر گزار کر ہی ہمیں اندازہ ہوا کہ پڑھائی کے ساتھ وہاں کوئی نہ کوئی کام کرنا بھی بہت ضروری ہے کھانے پینے اور رہائش کے اخراجات ہمارے اندازوں اور خیالات سے کہیں زیادہ تھے تقریباً ”تمام ہی لوگ لڑکیاں کام کرتے تھے۔“

آرام کرنے اور وقت ضائع کرنے کا کوئی نظریہ ہی نہیں تھا۔ یہ عالم تھا کہ لوگ حساب لگاتے اگر دن میں ایک گھنٹہ بھی روز کسی کو قاصر ملتا تو سوچتے کہ کس طرح اس وقت کو کیش کر لیا جائے۔ بہت سے ہمارے ساتھ آنے والوں کو ہم نے کچھ کھانک حالات کی سختی سے گھر آکر اوجھڑے سمجھ چھوڑ کر چلے گئے وہ لڑکے جنہوں نے بھی مل کر پانی نہیں پیا تھا یہاں کی اپنی مدد آپ کے اصول پر گزارا کر جانے والی زندگی سے حکومت نہ کر سکتے۔ پڑھائی کا معیار اور انداز بھی بہت مختلف اور سخت تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ وقت تھا۔ جس کی ہمارے ہاں ہر لمحے پتھری کی جاتی ہے اور یہاں ایک منٹ کے لیے یہ لوگ اچھے بھلے بندے کو رہی بھٹک کر دیا کرتے تھے۔



ایک سال گزر گیا تو کافی چٹکیاں ملی تھیں۔ ہم آسانی سے پاکستان جاسکتے تھے اور میں نے یہی پلان کیا تھا بلکہ حسب عادت اعلان بھی کر دیا تھا کہ سب گھر والوں نے انتظار میں دن گنا شروع کر دیے تھے میں خود بھی ایسی سخت رویوں میں لائن سے آگیا تھا۔ اپنا بستر اپنا کھانا اپنا گھر بہت یاد آ رہا تھا۔ لیکن اچانک احسان نے منع کر دیا کہ وہ نہیں جاسکتا۔
 ”میرے بہت مشاغل ہو جائیں گے یار!“
 ”پھر جمع کر لیں گے“ چلو تھوڑا کر۔“ میں اسے منانے لگا۔

”جی تو میرا بھی بہت چاہتا ہے دوست! لیکن میں سوچتا ہوں یہ پیسے لیا کو دے دے تو وہ خوش ہو جائیں گے۔ ان کے بہت کام آئیں گے۔ کیا کی شادی پر قرض اتار اٹھا لیا تھا ابھی تک کچھ باقی ہے۔“ اس کی بات کے جواب میں میں چپ سی رہ گیا۔

اب احسان کے بغیر جانے کا کیا مزہ۔ میں بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ پھر اس نے مجھے بہت کہا جوش دلایا کہ مجھے ضرور جانا چاہیے سب گھر والے اس لگائے بیٹھے ہوں گے یہ بات میرے ہی کو بھی گئی لیکن احسان کا خیال آیا تو میں نے حتی فیصلہ کر لیا اور کراچی فون کر کے بتا دیا۔ کیا ہوا! پاکستان نہ گئے دونوں دوست لندن گھوم پھر کر دیکھ لیں گے۔

لیکن لندن میں سیو نفرز بھی سستی نہ تھی۔ مگر ہم نے یہاں یا بھی بھلا کر زمین میں بیٹھ کر لندن کا بہت سا حصہ دیکھ لیا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں، ٹیگورز، میوزیم اور پارک باہر سے دیکھ کر ہی ایسا اظہار کیا انداز جانے والوں کو آیا ہوگا۔

پاکستان نہ جانے کاب ایسا مال بھی نہ رہا تھا چند دن ہی تو تھے زور بھی گئے لیکن آخر جو خاک کی سیل ملی اس نے مجھے پورے دو دن تک ڈسٹرب رکھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار میں اس کی بات راپ سیٹ ہوا تھا اس کی باتوں پر غور کیا تھا اور اپنے فعل پر تادم ہوا تھا۔

”حق تلفی کرنا تو کوئی تم سے سیکھے تمہارے جن رات دن پر تمہارے گھر والوں اور تمہارے پاکستانی رشتہ داروں کا حق تھا وہ تم نے لندن شہر کی نذر کر دیے۔ ہم سے وعدہ کیا کہ پاکستان آ رہا ہوں اور پھر نہ آئے۔ وجہ کیا بتائی کہ لندن دیکھنے کا پھر کب موقع ملے گا؟ شکوہ صرف یہ ہے کہ لندن دیکھنے کا خیال پہلے کیوں نہ آیا ہمیں اپنے آنے کی خوشی اور انتظار میں کیوں جھکا کر نہ آتا تھا تو اس کیوں دلایا تم نہ کہتے تو ہم خود سے نہیں سمجھتی نہ پلائے ممبر کر کے بیٹھے ہی تو ہوئے تھے میوں کسی کے ضبط کو نہیں آنا مانا چاہیے۔“
 ”وعدہ خوشی“ انتظار اور جھکا پھر مبرو ضبط۔“

سارے الفاظ میرے ذہن میں گنڈے ہو رہے تھے۔ عجیب سی چھری پک رہی تھی وہ خطہ ہوشیار بہت مجبوری اور سب سے کسی کے عالم میں لکھا تھا مجھے تو ایک لمحے کے لیے خیال نہ آیا تھا کہ نائلہ میرا انتظار یوں کرے گی۔

میں نے خود بھی کبھی رات کی سیاہی اور خلی میں نائلہ کو ایسے یاد نہیں کیا تھا۔ یوں تو مجھے پل میں اس کا خیال آتا رہتا تھا، لیکن ایسے یاد کرتا؟ جذلوں کی پہچان میں کچھ گڑبڑی لگ رہی تھی۔

جی جی مجھے کسی کو اس نہیں دلائی چاہیے تھی۔ جب میں نے انہیں سنایا احسان کی مجبوری بتائی اور پھر سمجھایا کہ میں اسے اکیلا چھوڑ کر بسے آجاؤں گا تو باغیر میں جتنا اس نے میرا ساتھ دیا ایسا کون کر سکتا ہے۔ میری بات سمجھ کر وہ اپنی ناراضی بھول گئے اور جی بڑا کر کے کہہ دیا کہ

”بیٹا! جی رہو خوش رہو“ اب دھائی ختم کر کے فوراً چلے آئے۔ ”نائلہ سے جلنے کیوں یہ بات نہ ہو سکی؟ وہ ناراض ہو کر بیٹھ گئی یا دل چھوڑ کر کے میں احسان کا مسئلہ اسے اتنا تو وہ بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ گئی۔

”نائلہ! مجھے لگتی تو اس کے دل کی یہ کیفیت میں کیسے جان سکتا؟ بس وہ دونوں گزر گئے پھر وہی دھائی کاٹم“ رو میں لائف کی سختی میں سب کچھ بھول چل گیا۔

اور وہ دو سراسر اتنی سرعت سے گزرا دھائی کی دھن میں ہم ہر دھیان سے گئے ایک ہی ٹکڑ میں رہے تھے کہ نتیجہ اچھا آئے مصروفیت کی انتظار زدگی تو یقین نہیں آ رہا تھا ایک دوسرے کو چھو کر پھر گئے گا کہ وہ کھا، نہیں خواب تو نہیں۔

”یاد مبارک ہو! امتحان ختم ہو گئے“ احسان خوشی سے کہہ رہا تھا اور میں دل کھول کر ہنس رہا۔

پاکستان جانے کی ہماری خوشی دینی تھی۔ دو سال گزر گئے دو دن نہ گزر رہے تھے ایک دن تو پورا ہم

نے شہر میں دو دنوں میں گزرا، کچھ خاص محض گزرا والوں کے لیے خرید بھی لیں۔ دو سرائوں کچھ دوستوں سے ملنے ملانے اور سالن پیک کرنے میں گزارا۔ پھر بھی وقت ختم کیا، کچھ ماحول کا اثر تھا، کچھ جی کی گھبراہٹ، فائنو بیٹا نہ جا رہا تھا اس شہر میں اتنے مصروف کیا م گزارے تھے ان کی جھلک ہی متحرک کر دینے کو کافی تھی۔

”چلو ایر پورٹ چلے ہیں“ دنیا کا سب سے بڑا ایر پورٹ حوم پھر دیکھیں گے۔ ”احسان نے کہا۔

”ہاں یہ آئیڈیا اچھا ہے۔“ ہم اطمینان سے تیار ہو کر سنٹرل منصوبہ کی طرف چلے پڑے اور پھر کھڑی بھی آئی کہ ہم جاز میں بیٹھے اور پاکستان پہنچ گئے۔

ای، ”ایا، بھائی! بس سب جی کھول کر ملے، وہ بھی میری طرح بے چینی سے میری آمد کے منتظر تھے۔ اسی تو کتنی دیر تک روٹی ہی رہیں۔ اتنے عرصے بعد میری صورت دیکھی تھی پیار اور محبت سے مٹی بھر آیا تھا۔ میں خود اتنے دنوں بعد اپنے وطن، اپنے لوگوں، اپنے گھر کو دیکھ کر جذباتی سا ہو گیا تھا۔

”ای ایس خاندان سے مل کر آنا ہوں۔“ ”ہاں ضرور مل تو“ وہ سب بھی ہمدردی سے انتظار کر رہے ہیں۔

”خالہ! آپ گھر کیوں نہیں آئیں؟“ میں فوراً اسی خالہ کے پاس پہنچا۔

”کیوں تم جھگ گئے تھے یا تمہیں آنے میں تکلیف ہوئی؟“

”کیا ہو گیا ہے خالہ! دو سال میں ہی آپ بدل گئیں، میں جی بے باقی کرنے لگی ہیں۔“

”خدا نہ کرے کہ تمہیں غیر معمولی بس صبح کا وقت سے نامب کے اسکول“ کالج“ تمہارے خالو کو وقت پر کام پر جانا ہوتا ہے۔“

”ہوں پاکستان والے بھی بہت مصروف ہو گئے ہیں کسی نے میرے لیے ایکس کن کی چھٹی نہ کی۔“

”ایسی بات نہیں بیٹا! نائلہ کا جی کوئی استحقاق تھا، وہ چھٹی نہ کر سکتی تھی۔ سو راکا بھی پرینٹیکل تھا اور یہ تیسری شیطان تو تمہارے پیچھے کھڑی ہے۔“

”میں نے بہت بھر پور بیٹے ہی اعلان کر دیا تھا کہ جس دن آپ آئیں گے میں چھٹی کروں گی۔“ میرا نے کہا۔

”اسے کہتے ہیں جی محبت! باقی سب تو دکھاوا ہے۔“ میں نے اسے خوش ہو کر دکھایا، جی جی کی خوشی ختم ہی ہو گئی تھی، نائلہ امتحان نے مدلل کو کسی امتیازی سلوک کے قائل نہ سمجھا۔ پھر خالہ نے بہت روکا میں نہ رکا۔ خالو سے تو ایر پورٹ پر ملاقات ہو چکی تھی۔

”نہیں خالہ! بیٹا! تو سب گھر والوں کے ساتھ ہی کروں گا۔ سب انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”ناشتے کے لیے نہیں روک رہی، صرف یہ حلوہ گرم کر رہی تھی؟“ نائلہ تمہارے لیے بڑی محنت سے بنا کر گئی ہے۔“

”اب میں کوئی کچھ تو نہیں کہہ اس کے بنائے حلویوں پر جان دلیا گا۔“ میں نے چڑ کر کہا۔ ”خود تھاب ہو گئی“ بس یہ ہی سمجھتی ہے کہ اس کی خدمتوں، عزتوں کا بھوکا ہوں۔“ ایسی بیکار باتیں سوچ کر میرا دل غم خراب ہونے لگا۔

”چلو وہ پیر کے کھانے پر آجا۔“ خالہ نے پیچھے سے گوازدی۔

”ہرگز نہیں۔ آپ لوگ آج اپنے راکا۔“ لیکن سارا دن گزر گیا وہ نہ آئی۔ میں اپنے گھر پر اور اس کے مدینے پر حیران تھا۔

کمالی ایک بار پھر گنڈے ہونے لگی تھی۔ زیادہ تبدیلی شاید میری سوچ میں آئی تھی، بھلا میں نے کب پروا کی تھی کہ وہ قلائد وقت ملی یا نہ ملی۔ وہ نہ ملی نہ آ سکی میں چلا جانا، میرا مزاج تو ایسا ہی تھا، مگر میں دو سال بعد واپس سے لوٹ کر آیا تھا۔ اتنی آس بھی نہ رکھتا کہ میرے دوست احباب خود آکر مجھ سے ملیں اور اگر میں ہی ملنے جاؤں تو مجھے تنہا تو ملیں۔ اب وہ

لالہ لیلٰی بن کی عمر تو نہیں تھی کہ بار بار دوڑا ہوا خالہ کے گھر جا رہا تھا۔ ”کیسے ہو؟ رات کے کھانے پر امی نے خالہ اور ان کے گھر والوں کو بلایا تھا۔“

”تم سلاؤ بہت مصروف ہو گئی ہو؟“ ”ہاں کیپوٹرو میں ماسٹر کر رہی ہوں، آج آخری روجیک تھا، شام سات بجے فارغ ہوئی ہوں میں نے تین گھنٹے سلاؤ نہ سہاے ہیں۔ بہت محنت کی ہے تم دیکھا ضرور کامیاب ہوں گے۔“

وہ کسی ہی تھی۔ نہ دوپہے میں جھجک نہ بات میں رکاوٹ۔ میں نے ہی ان چند منٹوں میں جانے کیا کچھ سوچ لیا۔ بس اس ایک غور میں جھٹکا تھا کہ اپنی ساری ترجیحات چھوڑ کر نائلہ امتحان کو میرا تنہا ہونا چاہیے تھا۔ کیا میری دوستی بے غرض اور بے لوث تھی۔ رات کا کھانا ہم سب نے بہت اچھے ماحول میں کھایا، پھر دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ امی اور خالہ وغیرہ اٹھ گئے تب بھی ہم گززدہ بجے تک بیٹھے کہیں لڑاتے رہے۔

وہ کسی ہی تھی اسی طرح میری ہر بات میں ان لوگوں میرے ہر انداز پر حیرت، میں بھی عادت کے مطابق چند منٹوں پہلے سوچتی باتیں اندازے سب بھول گیا۔

”یاروہ لاسٹ ایر تمہارے لیے ڈاکٹر ریاض کا رشتہ آیا تھا اس کا کیا ہوا؟“ اس دن خالہ کے گھر میں رات کھانے کے لیے گھر گیا تھا۔

”تمہیں ایک سال بعد پوچھنا یاد آیا؟“ ”میں نے یاد کیا تھا تو سرسری امی نے مجھے بتایا تھا، لیکن تفصیل پوچھنے کا ہوش ہی نہیں تھا، اس وقت شاید میرے سمسٹر ہو رہے تھے۔“

”جب منع کر دیا تو تفصیل کیسی؟“ ”سارا احوال امی نے مجھے اتنی خوشی سے سنایا تھا کہ میں سمجھا قاضی بلوانے اور نکاح پر دھوانے کی دیر ہے۔“

”تمہاری بھی کسی تھی تم نہ ہوتے تو قاضی نکاح کیسے رہ جاتا۔“
 ”ہاں خیر میرے بغیر تم شادی تو نہیں کر سکتی تھیں۔“
 ”خاکہ رہے یہ قطعی نامکن بات ہے۔“ ہماری گفتگو ہنسی مذاق میں ہو رہی تھی لیکن اس کے لیے میں بڑا اسرار تھا۔

وہی سال بھر پہلے لکھا اس کا خط مجھے یاد آیا۔ مجھے یاد آیا وہ میل اسی وقت لکھا گیا تھا جب ڈاکٹر ریاض کے ساتھ رشتے کی بات چل رہی تھی۔
 مجھے یاد آیا وہ وعدہ خوشی انتشار اور جتنا پھر مبرور ضبط مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اس رشتے سے سب گھر والے راضی تھے تاہم نہ یہی کوئی بڑا چرانہ کی تھی پھر اچانک بہت ختم ہو گئی۔
 ”پلیز پتا نہ لگنا ڈاکٹر ریاض سے رشتے کی بات ختم کیوں ہو گئی؟“
 ”کیا تمہیں بہت صدمہ ہوا ہے اس بات کا؟“

”اگر وہ وجہ جانتا تو میرا بھی حق ہے کہ نہیں جب سب کچھ ٹھیک خاتم بھی رہتی تھیں پھر۔“
 ”انسان بدلے سے تو کچھ نہیں مانگ سکتا لیکن اپنے اللہ سے تو سب کچھ مانگ سکتا ہے تاہم نے دعا کی تھی کہ یہ رشتہ ٹل جائے۔“ اس نے صاف کہہ دیا اور میں اس کی صورت ہنسا دیا۔
 ”جب میں خود ڈاکٹر نہیں بن سکتی تو مجھے کسی ڈاکٹر سے شادی بھی نہیں کرنی پڑی۔“
 ”شروع ہوا تھا اور مجھے آگے بھی اس فیصلہ میں بہت کچھ کرتا ہے۔“ اس نے مجھے مطمئن کر دیا اور شاید میں مطمئن بھی ہو گیا اور پھر اپنے رزلٹ اور جاب کے چکر میں مصروف بھی ہو گیا۔

”کیا بات ہے امی آپ اتنی پریشان اور آپ میٹ ہیں۔“ اس دن کھر آیا تو امی لاؤنج میں صوفے پر سر لگائے بیٹھی تھیں۔

”سویرا کے لیے کوئی بہت اچھا رشتہ آیا ہے ابھی تمہاری خالہ آئی تھیں۔“
 ”سویرا کے لیے؟ اور نائلہ کو چھوڑ دیں گے۔“
 اپنے خاندان کی روایات سے میں بھی واقف تھا۔ چھوٹی بہن کا رشتہ ہو گیا تو بڑی بہن کے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔

”یہ ہی تو میں بھی سوچتی ہوں لیکن کیسے کہوں؟ سویرا کو تو میں خود پسند کر چکی ہوں لیکن نائلہ کی وجہ سے بول نہیں پاتی۔“
 ”آپ کچھ نہ ہی بولیں تو اچھا ہے میں سویرا کو پسند نہیں کرتا۔“
 ”تم نے تو بات ہی ختم کر دی۔“ وہ مایوس ہی ہو گئیں۔
 ”اور آپ اس معاملے میں کچھ نہ بولیں بہتر فیصلہ خدا پر چھوڑ دیں اور خالہ کو بھی سمجھا دیں کہ اچھے رشتے اللہ کی نعمت ہوتے ہیں نائلہ کی فکر ایک طرف رکھ کر فیصلہ کریں۔“

”میں اٹھ بیچے بڑی ہیں یاد رکھنا شادی کروں تب میں بھی سوچ رہا ہوں کہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔“
 ”واہ ابھی یہ بڑی اچھی خبر ہے کسی طرح یہ اونٹ بھی پہاڑ کے نیچے آئے۔“
 ”میں تم زیادہ نہ پھیل جاؤ۔ ابھی کوئی اچھی لڑکی ملی نہیں ہے۔“
 ”تمہیں لڑکیاں ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے وہ ہے نہ نائلہ امتیاز تمہاری کزن! تمہاری جگر کی دوست۔“

”میں بھائی ایسی باتیں کر رہے ہوں تو لڑکی تو دل جانے کی کہاں وہ ہر بات پر چنان چھڑکنے والی ہندی کہاں میں لالہ لالی سا کہی پوچھا تو پوچھا نہ پوچھا تو دس دن گزر جائیں بات بھی نہ کروں۔ تمہیں تو پتا ہے میری خصلتوں کا وہ تو میرے رویوں پر مکمل عمل کر رہا ہے۔“

”اگرے بھائی ابھی تک مری ہے جو اب مر جائے گی۔“
 ”تمہیں یاد رہے میں نے تمہیں سنا دیا ہے۔“
 ”میں یاد رہتی ہوں ایک بڑے غرض سارشتہ ہے انسان توقعات نہیں رکھتا شادی تو الگ ہی سلسلہ ہے رشتہ بندہ جائے تو بندہ توقعات کے عمل تعمیر کر لیتا ہے۔“
 ”کچھ لوگ ہر حال میں بے غرض ہی رہتے ہیں۔“

”آلہ پر نوٹنگ اینڈ کیرنگ۔“
 ”میں جناب اس کی بے غرضی سے ہی تو ذرا ہوں۔“
 میں بھلا کہاں اس کے نازک جذبات کو سہارا دے سکتا ہوں میں اس قاتل نہیں۔ اس کے لیے تو کوئی شان دار ساقط سا آدمی ڈھونڈوں گا تم دیکھنا تو سنی میں نے خالہ سے بھی وعدہ کر رکھا ہے۔“
 ”میلے یہ تو جا بجا کہ وہ خود تمہیں کتنا قاتل سمجھتی ہے۔“
 ”بہت احتیاط پسند اور بااخلاق لڑکی ہے، ابھی دوستی کی حد سے آگے نہیں بڑھی۔“

”اور وہ دو تو تمہیں دیا کرتے ہو کہ میری طرح اور لیلی اور سنی دیکھو سب کیلئے۔“
 ”وہ تو بوسے اس کے انداز تو مجھ پر کرنا رہا ہوں۔ اس نے تو بھولے سے یا اشارتاً یہی بھی ایسی بات نہیں کی۔“
 ”جو بات دیکھی جائے اور کسی نہ جائے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی کیا؟“
 ”میں اندازوں پر تو کسی بات کی بنیاد نہیں رکھی جاتی اور چھوڑ دو میں اس طرح کی بات میں الجھتا بھی نہیں چاہتا۔“ وہ میرا پیشہ سے تردد کرنے سے بچنے والا رویہ تھا یا کوئی جج کا احساس کستی۔

”معدیل صاحب کو بڑی طرح آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت بدل نہیں جاتی یوں بھی لڑکیاں کبھی اپنے جذباتوں کا اظہار اپنی زبان سے نہیں کیا کرتیں۔“
 ”یار! یہ کیا ہمارے معاشرے کی دنیا بوسی سوچ ہے جہاں کسی لڑکا لڑکی کو ساتھ دیکھ لیا، اس ایک ہی خیال ذہن میں آیا کہ ضرور ان کے درمیان کچھ ہے۔“

”جناب یہ دنیا بوسی میں انتہائی یاد اور بوجھ ہے لڑکا لڑکی کے درمیان کچھ نہ ہو تو ان کے ساتھ نظر آنے کا کیا مقصد؟“
 ”بھائی امی میری بہترین دوست ہی نہیں میری سگی کزن بھی ہے۔ ہمارا آپس میں خون کا رشتہ ہے۔“
 ”نائلہ کی دو بہنیں اور بھی ہیں ان کے ساتھ بھی تمہارا خون کا رشتہ ہے کیا ان سے تمہاری دوستی ہوئی؟“

”میں تو کہہ رہا ہوں کہ دوستی ہر کسی سے نہیں ہو سکتی۔ اس سے ہو گئی اور وہ خوش قسمتی سے میری کزن ہے اس لیے ہماری دوستی بیش قائم بھی رہ سکتی ہے۔“
 ”میں عدیل! شادی کے بعد ایسی دوستیاں قائم نہیں رہتیں۔ تمہاری شادی ہو جائے تو تمہاری بیوی شاید یہ دوستی پروا نہ کرے لیکن اس کی شادی ہو تو کیا اس کا میں اس کے تم سے یوں دوستی قائم رکھنے پر اعتراض نہ کرے گا۔“

”یار احسان! ہماری دوستی میں ایسی کون سی قاتل اعتراض بات تمہیں نظر آتی ہے؟“
 ”بھائی میرے بہت سی باتیں قاتل اعتراض نہیں ہوتیں لیکن اس کے باوجود قاتل پروا نہ کرے گی میں ہوں تم۔ اب بتاؤ تمہیں اچھا لگے گا کہ تمہاری بیوی اپنے کسی دوست کو پانچ کلو وزن کم کرنے کے لیے ڈانٹ پالان لگھے، لگھے کر جیسے اس کے دوست کے کسی کزن کے لٹال بچے کی سالگرہ ہو تو تحفہ خریدنے کے لیے مشورہ دے وہ جیت کے درد کی کوئی بھی تمہاری بیوی کی مرضی کی کھائے اور وراثت ٹھکانے کے لیے ڈاکٹر بھی تمہاری بیوی کی پسند کا چنے یہ سب کچھ اس باتیں ہیں جو شادی شدہ زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں اور نہ ہوں تو شادی شدہ زندگی کے ختم ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔“

”مگر ان یاد رکھو کہ تم تو مخلص اور مروت کا یوں مذاق نہ اڑاؤ ہمارے درمیان دوستی قربت واری وفاداری سب کچھ ہے لیکن وہ کچھ نہیں جو تم سمجھ

کے ہاتھوں دل ہی دل کی بات نہ کہہ دی تھی نہ میرے لیے حیرانی کی بات تھی۔
میں خود جس کہانی کا مرکزی کردار تھا اس کہانی کو کچھ نہ پایا تھا اپنی جگہ اپنے مقام کا تعین ہی نہ کر سکا کچھ یوں ہوا کہ شاید ساری کہانی ہی غلط ہو گئی وہ سواچھ بے کئی، ٹھکی ہاری کلچ میں خوار ہو گئی، بسوں کے دھکے کھاتی اس کا چہرہ ممکن سے سر جھلکا ہوا تھا اور آنکھیں بند اور شاید کسی انتظار کے پوچھ سے عجیب و غریب ان ہی لگ رہی تھیں۔
”اتنی دیر؟“

”کلچ میں تو دیر ہو ہی جاتی ہے۔“
”مجھے قطعی پسند نہیں لڑکیوں کا یوں سڑکوں پر کالوں اور یوتورسی کے لیے خوار ہونا۔“ میں نے اپنی کبھی کی کبھی بات دہرائی۔

”اپنی پسند چاند کیا تم مجھ پر مسلط کر سکتے ہو؟“
”اب کوں؟“
وہ مجھے دیکھنے لگی۔

”کہہ تو رہا ہوں کہ اب کوں کہ۔“ وہ اتنی بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہی تھی کہ میں بے چین ہو گیا۔
”تمہارے جملہ حقوق اگر میرے نام ہو جائیں تو میں اپنی مرضی تم پر مسلط کر سکتا ہوں نا؟“
”لیکن اب میں اپنا ماسٹرز اور حورائیں نہیں چھوڑ سکتی۔“

”تو جاؤ جا کر پھر اپنے خدا سے دعا کرو کہ یہ رشتہ بھی ٹل جائے۔“ وہ چپٹ مٹی وہ زیادہ دیر میرے سامنے کھڑے رہنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھی۔
”کہاں جا رہی ہو؟“

”اس رات کے حضور شکرگزاری کے لیے جو دیووں کے ہیڈ میٹر جاتا ہے۔“
اور میں بے حد خوش تھا کہ بروقت جہازوں کی اصل صورت پہچان لی۔

☆

”دوست! مشورہ دیتا ہوں کہ کام تھا مانتا نہ مانتا تمہارا مسئلہ یہ ظاہر ہے جس لڑکی کو تم چین سے جانتے ہو اس کو تم سے بہتر کوئی سمجھنے والا بھی نہیں ہو گا۔“ وہ مجھے ایک مسلسل کشش میں ڈال کر چلا گیا سو سے تو میرے دل میں ایک ”دو“ تین بار سر اٹھاتی چکے تھے اس کی باتوں نے اور پاؤں ڈالا کر دیا۔

اور آج اپنی اس پوری کہانی کو میں اس رخ سے دیکھ رہا تھا جس رخ سے ابھی نہ دیکھا تھا۔
تاکہ امتیاز کو اب میں اپنے دل میں ایک بدلے ہوئے مقام پر دیکھ رہا تھا۔ اس کا انتظار اس کا انتظار اس کا ضبط اور پھر اس کی دعا۔ لیکن جو کچھ میں نے احسان سے کہا تھا وہ ساری باتیں مجھے تاکہ امتیاز کے بدلے ہوئے مقام پر غور کرنے کی اجازت نہ دے رہی تھیں۔

خللہ کے گھر میں ڈیرہ کھنسنے سے بیٹھا تھا۔ تاکہ ہی کے انتظار میں تھا یوں بظاہر میں سو رہا اور میرا سے باتوں میں کم تھا پھر اٹھل آگئے تو ان سے کپ شپ لگنے لگا۔ شام پانچ بج رہے تھے تاکہ ابھی تک نہ آئی تھی۔

”وہ اتنی دیر یہ آتی ہے کلچ ہے؟“ سوچا کچھ میں چائے پاری تھی جب میں نے اس سے پوچھا۔
”ہاں بھی کبھی تو سات بج ہی جاتے ہیں۔“
”یا کل ہے اتنا خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے گھر میں بیٹھے۔“

”ارے پردھائی چھوڑ دوں کیا! یہ تو اس کا مقصد حیات ہے۔“
”بھئی کیا کرے گی اتنا پڑھ کر وہی شادی کر کے گھر میں بیٹھ جائے گی۔“

”شادی تو جانے ان کی کب ہوگی کیا خبر نہ ہی ہو۔“
”ارے خدا نہ کرے! یہاں کیوں کہہ رہی ہو؟“
”بھئی صبح شام ایک ہی دعا تو کرتی ہیں۔“
”اتنا جنون ہے اسے پردھائی کا؟“
”جنون تو جانے کیا ہے لیکن میری بہن اس جنون

سنگھار

دین محمدؐ سے محبت کرنے والا جن کا شکر مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون بکھرے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے جو وہ اپنے چھ مربیع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا ہو کر چھاپے اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اودماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ بھرا بند ہے۔ دین محمدؐ کا رواں دواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مخترم و عابین چکا ہے۔ اس کی دماغیں مستعجاب ٹھہرتی ہیں ادا اس کے یہاں ایک خوبصورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی جنت کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے دوز و شب نوکری کی کچی میں بستے گر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دو دن اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ بہتر مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا ملگلو اس کی دنیا آباد کھتا ہے۔ ہونٹ اس کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے جنت فیقی حراست میں ہے جس کا دعوایہ کر اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ عام جہان پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور موت دکھاتا ہے کہ جنت فیقی تیز رفتاری میں بھاگ رہی ہے جس کی شادی ابھی ہوئی تھی۔ جنت کی حالت جلال الدین کو افسانہ جہان کا کارکنہ ملتی ہے جس نے نوکروں کے سہارے ملیدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

خمیسہ 14 سال بعد اپنی بیٹی مادی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آتی ہیں تو انہیں تو قریح صاحب کے بتائے گئے بیٹے کو تلاش میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ بیٹے کے دوست نو قریح صاحب کے توسل سے وائیاں کی ایکس میں ٹھہرتی ہیں رشتہ ٹائیٹل ملندہ اور بھی قانون ہیں۔ ولی ولید اور انیہاں کے بیٹے ہیں۔ مادی کی پہلی ملاقات میں انیہا سے دوستی ہو جاتی ہے۔



شہید العباس طبعاً سخت گروہ ورتو جانتے تھے۔ جسے صنف نازک کا جزو ضروری بنتا بھی تاگواد گزرتا ہے۔ وہ بھی ناؤ تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند طبیعت سے نکلا ہے۔ شہید تنوی کو کالج چھوڑنے کا سبب تو سببیاں عیسو اور غرہ تنوی کے سر ہوجاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شہید تنوی کا سنگین تر ہے۔ وہ اس کی قسمت بردار شک کرتی ہیں تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ درج کو اس کی بات کا علم نہ ہو۔

شہید بچہ، ثروت وانیال کی اولاد ہے جسے انہیں وانیال جن سے شادی سے پہلے تھوڑا سا ملا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور فیصلہ پاندا بنا دیا۔ وہ انشا اور ولید سے بہت ترقی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بیعت بہن بھائی غلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انبا پر بڑی نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو بیعت ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بہار نے بڑے بچہ وانیال، شہید کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے تو غصہ ان کے اخلاق سے خارج ہونے بغیر نہیں رہتی۔ انہیں بچہ وانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ بچپن سے مل چکی ہیں۔

بچپن کی لڑائی میں جنت کو جرح لگتی ہے تو وہ محمد امینی بہن زمرہ کے بیٹے فادوق کا حلیہ لگا دیتا ہے۔ ساتھ ہی زمرہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلقی کر لیتا ہے۔ زمرہ اس کی جنت سے طرفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد زمرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو ماہ کر دو سب کچھ نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کے شوہر کو کھڑا دینے کا اہتمام مادی کا لگاؤ شہید سے ہوتا ہے جس سے مادی کا بہرہ زخمی ہوجاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جہنم ابھرتی ہے شہید مادی کو بڑی طرح سے ڈالتا ہے تو مادی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ شہید سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ (اب آگے پڑھیے)

سیکھتوں قندیں

عروش مرزا۔ ایک الجھا ہوا کردار۔ موانہ حلیہ بنا کر اوٹ ٹانگ حرکتیں کرنے کی شوقین، اخلاقی اعتبار سے حتیٰ کا شکار۔ اس کے بارے میں کئی افواہیں اڑتی پھرتی ہیں جو کچھ میں اپنے پیش پتے کے ساتھ ہی ان تینوں کے کانوں تک بھی پہنچیں، لیکن عموماً ایسی باتوں کی تصدیق یا تردید نہیں ہوتی یہ صرف افواہیں ہوتی ہیں۔ عروش جیسی لڑکیوں کے متعلق عموماً "تین لالہ بنی ہوئی ہیں" ایک تمنا کی لڑکیاں اسے پسند کرتی ہیں ایک تمنا ان کی مدد سرا دکھائی دیتی ہے جبکہ باقی مانہ کو عروش جیسے لوگوں سے فرق نہیں پڑتا۔ سوئے اتفاق ان کے گروپ میں بھی عروش کے متعلق تین آراء موجود ہیں۔ نمونہ عروش کو بے حد پسند کرتی تھی تنوی کو وہ سخت بری لگتی تھی، جبکہ عیسو بالکل غیر جانبدار تھی وہ بہت کم اس بارے میں بات کرتی، لیکن آج جو ہوا اس نے تنوی کے ساتھ ساتھ عیسو کو بھی دم بخود کر دیا تھا اور ان دونوں کے منہ سے "خط" کا نام سن کر چیخ نکلی تھی۔ نمونے بے ساختہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"کو فکس میرے کانوں کے پروے کیوں بھاڑ رہی ہو۔ مجھے کیا پتہ ہر لفظ میں کیا ہے مجھے تو عروش نے کہا تھا" تم تک پہنچاؤں سو پہنچاؤ۔ "ایک آن میں تیزی نے لفظ چاک کیا اندر خوشبو سے نمٹا لیٹ رہی تھا عیسو نے اس کے ساتھ ساتھ بڑھتا شروع کیا، لیکن جوں جوں تنوی کی نظریں خط کی سطروں پر دوڑ رہی تھیں تو اس کا فشار خون بلند ہو رہا تھا اور یہ خون جیسے آنکھوں سے چھیلنے کو بہہ نکلتا تھا۔

"مجھے آپ کا سب سے اچھا دوست بننا ہے اور مجھے یہ بھی پتا ہے مجھ سے دوستی کر کے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ پلیز میرے خط کا جواب ضرور دیں۔"

صرف اور صرف آپ کا۔ عروش۔

تنوی کی بے تحاشانہ آنکھیں دھیسے پھرانی کا دھواں سا پھیل گیا۔

"نمونا تم کو کد رہی تھیں یہ عروش نے پہنچا دیا ہے جبکہ اس پر تو کسی سروش کا نام لکھا ہے۔"

"غور سے دیکھو جلدی میں "ع" "س" "ن" کیا ہوگا۔" اس نے خود آگے ہو کر دیکھا اور حیران ہو کر بولی۔ "اس

پر تو واقعی سروش لکھا ہے۔ لیکن تنوی ایسے ہی کہہ رہی ہوں یہ مجھے عروش نے ہی دیا ہے۔"

"ممکن ہے عروش نے سوچا ہو کہ میں تم سے میں اگر پر جیل سے شکایت نہ کروں اس صورت میں تمہارے

پاس کوئی ثبوت نہیں ہونا چاہیے تب ہی اس نے اپنا نام لکھ لکھ دیا۔" عیسو نے خیال ظاہر کر دیا۔

"تو اس کا کیا خیال ہے وہ اپنا نام لکھ لکھنے کی تو میں شکایت نہیں لگاؤں گی۔" تنوی نے کانڈ کھی میں ایسے بھینچا

جیسے وہ کانڈ نہیں عروش کی گردن ہو۔

"شکایت تو میں ضرور لگاؤں گی عروش نے مجھے سمجھا کیا ہے جو ایسا اوہیات خط لکھا۔" وہ غصے سے کھول رہی تھی۔

"ایک منٹ۔ ایک منٹ۔ اگر ایسی بات ہوتی تب بھی عروش کو کم سے کم خط میں منٹ کا صیغہ استعمال کرنا

چاہیے تھا۔" عیسو کا انداز سوجھا۔ "مجھے لگتا ہے میں نے سروش کا نام سن رکھا ہے۔ نمونہ عروش کا وہی

گرن جن میں سے جو پچھلے ہفتے حج سے شام تک کالج کے باہر آکر کھڑا ہوا تھا ہے؟"

"مجھے کیا پتا۔" نمونہ پکلی پھر کد مہاجرت سے بولی۔

"تنوی! تمہیں پتا تو ہے عروش تمہیں پسند کرتی ہے اور تم سے دوستی کرنا چاہتی ہے کل بھی یہی کہنے کے لیے

تمہیں بلوایا تھا۔ لیکن تم نہیں کہیں تو اس نے خط لکھ دیا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے یا راگہ تم شکایت لگانے

چلی جاؤ کلنگ اسکول میں اسٹریڈ لڑکیاں ایک دوسرے کو خط لکھتی ہی ہیں۔"

"لکھتی ہوں گی مگر مجھے یہ سب باتیں پسند نہیں ہیں۔" تنوی نے سنجیدگی و سختی سے کہا۔

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں میں دوستی نہیں کرنا چاہتی پھر یہ اوٹ ٹانگ حرکتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

اس بار نمونہ خاموش رہی، لیکن اس کے تاثرات دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا وہ متفق نہیں ہے۔

"ویسے میرا بھی یہی خیال ہے ایک بار پرنسپل تکسبات پہنچا دینا چاہیے۔" عیسو کا دل غریب دور کی آوازاں بھر

رہا تھا۔

"عروش! جس مزاح کی لڑکی ہے اگر پہلی بار میں اسے نوکانہ گیا تو دوبارہ بار یہ حرکت کرے گی۔"

عیسو نے بھی سنجیدگی سے اپنی رائے دی۔

"یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے جتنا تم لوگ اسے بڑھا رہے ہو۔"

"یہ بڑی بات ہی ہے۔" عیسو نے زور دے کر کہا۔ "عروش کے بارے میں جو باتیں کالج میں پھیلی ہوئی ہیں کیا

تم نے بھی نہیں سیں؟ وہ کس رپورٹیشن کی لڑکی ہے کیا ہم سب کو نہیں پتا؟ انسان اپنی محبت سے پہچانا جاتا

ہے۔ تنوی اگر اس سے دوستی کرتی ہے تب بھی بدنام ہوگی اور اگر دوستی نہیں کرتی تو بھی عروش اسے تنگ کرتی

رہے گی۔ اس صورت حال سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہی ہے کہ پرنسپل تک معاملہ پہنچا دیا جائے۔"

نمونے کل سے عیسو کی بات سنی۔ اگلے ہی تنوی کے ہاتھ سے خط چھینا اور سرعت سے اس کو پر زوں میں

تبدیل کر کے عیسو کے بھر کانڈوں کو دوڑا اچھا دیا۔ کانڈ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ہوائے آن کی آن ان کی

دسترس سے دور کر دیا تھا۔

یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ عیبور اور تنوی کو چھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا وہ دونوں حتیٰ حدی سفیدے کے درختوں کے درمیان ہوا سے اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھیں۔
نہرو نے ہاتھ جھاڑ کر ان دونوں کو دیکھا۔

"اب تم دونوں کو جو کرتا ہے کرو عبور کے بغیر پہلے تم لوگوں کی کسی بات پر یقین نہیں کریں گی۔ مجھے گواہی کے لیے بلایا تو میں مگر جاؤں گی کہ عروش نے مجھے کوئی خط دیا تھا۔ تم دونوں بلاشبہ عروش سے لیا وہ ابھی فریڈ زہو میری۔ لیکن کسی ایک کے لیے میں اپنی دوسری فریڈ کو مشکل میں نہیں ڈال سکتی۔" نہرو ہلکی اور تیز جیتہ قدم اٹھاتی بلڈنگ کے کونے پر غائب ہو گئی۔ وہ دونوں چند منٹ چران پریشان اسے جا نہ دیتی رہیں پھر عیبور نے کہا۔
"نہرو کا دل بالکل خراب ہو چکا ہے۔ عروش کی محبت میں رہتی ہے تو زبان بھی اسی کی بولنے لگی ہے۔ اسے یہ تک احساس نہیں کہ اس کے اور عروش کے بارے میں لڑکیاں کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں۔" عیبور نے پریشانی سے کہا۔ تنوی کی طرح وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والی لڑکی نہیں تھی وہ مست فعال تھی ہر معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہو مگر معلومات ہمیشہ سو فیصد درست ہوتی تھیں۔
"کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں؟" تنوی نے چونک کر پوچھا۔

"یار! اگر بزرگ کہتے ہیں انسان اپنی صحبت سے بچنا نا جاتا ہے تو ٹھیک ہی کہتے ہیں، نہرو آج کل عروش کے ساتھ اتنا وقت گزار رہی ہے۔ اکثر لڑکیوں کا خیال ہے وہ بھی عروش کی طرح بیمار ذہنیت کی مالک نہیں چکی ہے۔" عیبور نے پائیداری کے انداز میں اور نے حد تک اواز میں بتایا۔ "اور تم پریشان مت ہو عروش کا خط دیکھ کر جو تمہارا رد عمل تھا وہ یقیناً نہرو اسے بتا دے گی، مجھے امید ہے وہ دوبارہ تمہیں خط نہیں لکھے گی لیکن اگر دوبارہ ایسا کیا تو ہم نہرو کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر پہلے کپاس چلے جائیں گے۔"
"کیسے پریشان نہ ہوں۔" تنوی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"مجھے لگ رہا ہے تمہارے میرا ہاتھ دیکھ کر جو بھی بتایا تھا وہ اسی بات کی طرف اشارہ تھا۔ اوہو کیا شروع میری زندگی کا اور۔" اس نے ٹکڑی مندی سے سر ہاتھوں میں کر لیا تھا جبکہ عیبور نے سر ہٹ لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی سینا رہا ل کی لالی سے باہر آتی پھر سلطانہ کو دیکھ لیا وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلا رہی تھیں۔



"سنئے کیا آپ ساوی ہیں؟"

دونوں لڑکیوں کے قدم اس کے قریب ٹھک کر روکے تھے، ماوی نے چونک کر انہیں دیکھا وہ تنوی اور عیبور تھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہمیں میڈم سلطانہ نے بھیجا ہے وہ کہہ رہی ہیں ہم آپ کو ان کے کویٹل تک پہنچا دیں۔" ماوی ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا کر ان کے ساتھ ہوئی انکی کلاس روم کے سامنے سے گزرنے کے بعد ایک وسیع عریض کراؤنڈ عبور کرنا جس کے دو سرے کنارے پر ہاشل کی عمارت تھی۔

ماوی تو لگا جیسے رونق تو بس سینا رہا ل کے قریب ہی تھی باقی تو پورا کیسپس سٹائے میں ڈوبا ہوا تھا۔ چا چلا سینا رہا کی وجہ سے دیگر طالبات کو چھٹی دی گئی ہے۔ سلطانہ آنٹی باہری ٹیوشی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ تنوی اور عیبور اسے میڈم سلطانہ کے سپرد کر کے واپس چلی گئیں۔

"بھئی۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا۔" وہ اسے اپنے ساتھ اندر لے آئیں۔
"انتظار کا تو کوئی مسئلہ نہیں، بس ادا تہیت، تو اظلاطونیت، مانت پندی، جیسے الفاظ سن سن کر دماغ پک گیا

میرا۔" ماوی نے سب عداوت صاف کر لی تھی کہ انہوں نے اس کی بات سن کر مڑا دیں۔
"لگتا ہے سنا یا کوئی سے بالکل دلچسپی نہیں ہے جہیں؟"
"ایک فیصد بھی نہیں۔" ماوی نے سرعت سے کہا تھا۔
سلطانہ آنٹی کے کویٹل میں پہلے سے کچھ لڑکیاں موجود تھیں۔

"ارے۔ تم لوگ یہاں نیسی ہوئی ہو، مجھے پتا ہوتا تم لوگ ادھر ہو تو اس بچی کو پہلے ہی یہاں چھوڑ جاتی۔ خوا خواہ بے چاری کا اتنا وقت ضائع ہوا۔ میں نے سوچا انجان جگہ پر کیا اکیلی چھوڑ کر جاؤں۔" سلطانہ آنٹی نے کہا۔ پھر ان سب کو ماوی سے متعارف کروانے لگیں۔ وہ تینوں سلطانہ آنٹی کی کوئیگز تھیں، لیکن ان کے پارٹنٹ مختلف تھے۔ عاشرہ متھس پر عاشری تھیں، زرتاشہ اسلامیات کی لیکچرار تھیں، جبکہ عمارہ ارو و پارٹنٹ کی ہیڈ اور سلطانہ آنٹی کی روم میٹ تھیں۔

"آپ بڑے صحیح وقت پر آئی ہیں میڈم! ایک زبردست بحث چھڑی ہوئی ہے۔" پ بھی اپنا حصہ ڈال لیجئے کچھ آپ کی رائے سے ہماری معلومات میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔" عاشرہ نے کہا۔
"بحث کا موضوع کیا ہے؟" سلطانہ آنٹی نے ماوی کو بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "فرانیڈ کا نظریہ۔ یہ کہ انسانی فطرت ناقابل تغیر ہے۔" عمارہ نے کہا۔

"ارے یہ تو بڑا اتفاقی موضوع چھیڑ کر بیٹھی ہوئی ہو تم لوگ اس بحث میں تو بڑے بڑے اسکالر، مفکر کسی منطقی رائے تک نہ پہنچ سکے، ہم لوگ کیا کہیں گے۔"

"میڈم! ہم میں سے کوئی اسکالر ہے نہ مفکر۔ ہم تو بس یونی اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں، سوچا آپ سے بھی رائے لے لیں۔" زرتاشہ نے کہا تھا۔

"ہم سب ذرا ماوی کو بکس اور نوٹس دکھا دیں پھر بات کرتے ہیں عمارہ بے شک ذرا اچھی سی چائے تو پلاؤ۔" وہ ماوی کو ساتھ والے کمرے میں لے آئیں، یہاں ایک یو آر گیر الماری اوپر سے نیچے تک کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔

"تو بھئی۔ یہ دیکھیں طرف ساری کتابیں تمہارے ریسرچ ورک سے متعلق ہیں۔ جو تمہیں پسند ہوں وہ نکال لو۔ یہ کچھ نوٹس اور یہ میرا تحسیس۔" وہ اسے سب کچھ دکھا کر اور فری ہینڈ دے کر دوسری الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگیں، پھر واش روم میں گھس گئیں۔ ماوی کے ہاتھ تو جیسے خزان آگاہ تھا، ایک سے ایک بہترین کتاب موجود تھی یہاں۔ سلطانہ آنٹی واش روم سے باہر آ کر اس کے پاس بیٹھ گئیں اور اس کا ریسرچ ورک ڈسکس کرتی رہیں پھر عمارہ انہیں چائے کے لیے بلانے آ گئیں۔

"آج ماوی پہلے چائے پی لیتے ہیں، پھر تم باقی چیزیں دیکھ لیتا۔" سلطانہ آنٹی کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ اسی کمرے میں آئی، یہاں باقی خواتین موجود تھیں۔ چائے کے ساتھ گرما گرم چیکن ہیشز اور چاکلیٹ پیسٹریز کا اہتمام تھا، ماوی کو بھوک تو پہلے ہی محسوس ہو رہی تھی، یار تکلف بیٹھ کر ان چیزوں سے انصاف کرنے لگی۔ عاشرہ نے پھر وہی موضوع چھیڑ دیا جس پر سلطانہ آنٹی کی رائے چاہ رہی تھیں۔

"آپ نے پروفیسر مرقی کی باتیں سنیں؟"
"پروفیسر مرقی کو تو تم رہتے ہی دو وہ فرانیڈ کے اتنے بڑے معتقد ہیں کہ اس کی کسی سے ایک انج بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے، جن دنوں میں یونیورسٹی میں تھی میری اور میرے گروپ کی پروفیسر مرقی سے اسی موضوع پر لمبی لمبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ نفی صاحب کہتے تھے جو جناب فرانیڈ فرما گئے تو ہی حرف آخر ہے اور ہمیں ان کی بات ماننے میں تامل ہوا تھا۔" سلطانہ آنٹی نے کہا۔

”اچھا اب اس بار سے میں لیا خیال ہے“ ”ذرا ناشیہ نہ پوچھا۔“

”جی ہاں، بحث ہے یعنی پرانی بات ہے کہ فطرت انسانی ناقابل تغیر ہے، مگر پیش اسٹے ہی پر اسے وہ دلائل ہیں جو اس نظریے کی مخالفت میں دیے جا رہی ہیں لیکن اگر تم صرف میری رائے پوچھ رہی ہو تو میں اس بات کو نہیں مانتی۔ انسانی فطرت کیوں تبدیل نہیں ہو سکتی؟“ ”بالکل ہو سکتی ہے اگر انسانی فطرت تبدیل نہ ہو سکتی تو آج بھی انسان پتھر کے زمانے میں ہی رہا ہوتا۔ غاروں میں رہتا، واسطوں سے کٹ کاٹ کر کچا گوشت کھاتا۔ جہاں تک میری معلومات ہیں تمہاری زندگی کے آغاز کو صرف آٹھ یا دس ہزار برس ہوئے ہیں۔ ان دس ہزار برس کے آغاز کا انسان کیسی زندگی گزار رہا تھا کیا تم لوگ اندازہ لگا سکتی ہو؟ وہ انسان وحشی تھا اور اس وحشت کو اپنی فطرت کا حصہ سمجھتا تھا، وہ فطرت جو بدلی نہیں جاسکتی لیکن ہم گواہ ہیں اس بات کے کہ فطرت بدلی جاسکتی ہے کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کس طرح انسان کے آقا و اجداد کے شعور نے نشوونما پائی اور اسی کے ذریعہ وہ حیوانات کی صف سے الگ ہوا۔ دراصل تبدیلی کا عمل اتنی سست روی سے وقوع پذیر ہوتا ہے کہ ہم محسوس بھی نہیں کیا کرتے۔ احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہر حال تبدیلی ایک واضح شکل میں ہمیں دکھائی دینے لگتی ہے ایک وقت آئے گا کہ کئی ہزار برس آگے کا انسان آج کے دور کو پتھر کا زمانہ کہہ رہا ہو گا اور ایسا کیوں ہو گا صرف اس لیے کیونکہ ہر لمحہ تبدیلی آ رہی ہے اور فطرت نے سانچوں میں داخل رہی ہے۔“

”واقعی“ ”ذرا ناشیہ نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔“

”اگر ہم اس بات کو درست مان لیں تب تو تبدیلی بستی اور ترقی کا عمل ہی رک جائے گا۔ آخر کوئی نہ کوئی وجہ تو ہے تاکہ ہم تعلیم حاصل کرتے اپنے بچوں کو اسکول، کالج، جموں میں، ہاں باپ بچوں کی تربیت کی فکر کرنا ہی چھوڑ دیں۔ اگر اس نظریے کو درست مان لیں، یعنی انسان کو اشرف المخلوقات بتایا ہے خدا نے اور نہ جانور ہیں، پھر پوچھتے ہیں کیا ہیں خدا نے ان سب کو اشرف المخلوقات کا درجہ کیوں نہیں دیا؟ کوئی وجہ تو کسی جو خدا نے انسان کو اس درجہ پر فائز کیا اور وجہ انسان کا عقل و شعور ہے جو کسی اور مخلوق کو نہیں ملا۔ اب اگر انسان اپنی فطرت پر ہی قابو نہیں پاسکتا تو کیا خدا ہے اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا؟“

”واقعی زری اٹھنے پر بڑی اچھی بات کی ہے۔“ ”ہمارے فوراً سراپا۔“

”فریڈ چاہے کچھ بھی کہتا رہے ہمیں بحیثیت مسلمان یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ صرف تقدیر ہے جو بدلی نہیں جاسکتی۔ فطرت کی کیا حیثیت ہے تقدیر کے مقابلے میں؟“

”اور جہاں تقدیر کی بات آجائے وہاں تو ہر بحث ہی ختم ہو جاتی ہے۔“ ”سلطانہ آئی نے کہا۔“ ”لیکن اگر کچھ دیر کے لیے تقدیر کی بحث کو ایک طرف رکھ دیں تو میں کوئی تعلیم و تربیت والا پوائنٹ بھی بہت خوب اٹھایا ہے تم لوگوں نے“ ”یو سی ماہر خصوصیات تعلیمات لوفس نے اس نے Conditioned refiler کے نام سے ایک تصوری دی تھی اور تصوری کچھ یوں تھی کہ اگر کتے کو خوراک کھلاتے وقت کھنٹی بجائی جائے تو کتا کھنٹی کی آواز سے ایسا Condition ہو جاتا ہے کہ جب کبھی کھنٹی بجائی جائے اور خوراک نہ بھی دی جائے تو بھی اس کے منہ سے رال نکلنے لگے گی۔ اس نظریے کی روشنی میں ایک اور مفکر نام اب مجھے یاد نہیں آ رہا۔ شاید ڈاکٹر وائسن نے کہا تھا کہ اس تصوری کی روشنی میں تعلیم و تربیت کے اصولوں کو مرتب کرنا چاہیے جب حیوانات میں عادات راسخ کی جاسکتی ہیں تو انسان میں کیوں نہیں؟ بلکہ انسان عقل و شعور سے نوازا گیا ہے۔“

”اچھا میڈم ایک بات بتائیے۔“ ”عائشہ نے کہا۔ سلطانہ آئی چونکہ سب میں سینئر تھیں اس لیے سب ہی کو اپنے دلوں میں چلنے والوں کے جواب ان ہی سے چاہیے تھے۔“

”کیا انسان خود اپنی فطرت تبدیل کر سکتا ہے؟“ ”میں عمارہ کی بات دہراؤں گی صرف تقدیر نہیں بدلی جاسکتی باقی سب کچھ بدلا جاسکتا ہے۔“ سلطانہ آئی نے زور سے کہا۔

”یہ تو بحث میرے ذہن میں اٹک رہا ہے۔ پلیز ذرا وضاحت سے سمجھا دیجئے۔“ عائشہ نے اصرار بھرے انداز میں کہا تھا۔

”میں سمجھ نہیں پا رہی کہ انسان خود کو کیسے تبدیل کر سکتا ہے؟“ ”ذرا غور بھی۔ بڑی سیدھی سی بات ہے۔“ سلطانہ آئی نے بولنا شروع کیا۔ ”مشرقی معاشرے کی ایک بہت بڑی خصوصیت اس کا خاندانی نظام تھا جو بد قسمتی سے اب کس کس ہوجا رہا ہے۔ لیکن جب سب مل جل کر رہتے تھے تو کمزور کے بچے کی تربیت کی ذمہ داری تمام بزرگوں کے سر جمی۔ ماں باپ سے کوئی ناپی ہو بھی جاتی تو تربیت کی ذمہ داری دادا، دادی، چچا بزرگ سنبھال لیتے تھے۔ وہ اسلامی احکامات بچے کو سکھاتے تھے وہ تمام اچھی باتیں بھی سکھاتے جو بچے کو معاشرے کا بہترین فرد بنا سکے۔ جو بچے کی عادات میں کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھتے تھے بچے کو سمجھا بچھا کر یہ احسن طریقے سے اس کی نفسیات میں کوئی گڑبڑ نہ پڑنے سے پہلے ہی اسے کھول لیا جاتا تھا۔ بڑائی بڑھنے سے بھی رکتی تھی لیکن جوں ہی خاندانی نظام دور، ہم بزرگ ہوا سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔“

”بات تو پچھو یہ رہ گئی تاکہ انسان خود کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ خاندانی نظام کی جن خصوصیات کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ یوں ہی عناصر ہو گئے۔ جو انسانی سوچ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔“ عائشہ نے پھر سوال اٹھایا۔

”تم عقل و شعور والی بات پھر فراموش کر رہی ہو۔“ سلطانہ آئی نے کہا۔ ”بات مختصر لفظوں میں کچھ یوں ہے عائشہ کہ عقل تو انسان کو پیدا ہوتی ہی خدا کی طرف سے مل جاتی ہے۔ یعنی جیسے ناک، کان، آنکھیں، ہاتھ وغیرہ ملتے ہیں عقل بھی ویسے ہی مل جاتی ہے لیکن شعور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے عقل کی رفتار سب سے زیادہ ہم شعور کہہ سکتے ہیں یوں سمجھو کہ عقل سونا ہے اور زندگی وہ عقل جس میں یک طرفہ عقل کا سونا شعور کے نکلنے میں ڈھلکا ہے۔ اسی دوران یعنی عقل کے شعور میں ڈھلنے کے دوران ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب خدا ہماری نفسیات کی اور اس ہمارے اپنے ہاتھوں میں دے دیتا ہے کوئی میری بات سے اتفاق کرے یا نہ کرے میرا اس بات پر پورا اعتقاد ہے کہ بیرونی عوامل کے ساتھ ساتھ بلکہ پچھتر فیصد انسان خود اپنی نفسیات کو تبدیل کر رہا ہوتا ہے تو جب آدھے سے زیادہ کنٹرول ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے تو ہم اپنا آپ کیسے تبدیل نہیں کر سکتے؟ ہم چاہیں تو خود کو سیدھے راستے پر ڈال لیں۔ چاہیں تو غلط راستے کا انتخاب کر لیں۔“

”اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ صحیح راستہ کون سا ہے اور غلط کون سا ہے؟“ ”ذرا ناشیہ نے سوال اٹھایا۔“

”یہ فیصلہ بھی انسان خود ہی کرنا ہے عقل و شعور کے ساتھ ساتھ دل کی مشاورت سے۔ پھر کچھ راستے تو بڑے واضح ہوتے ہیں جن کے چناؤ کے لیے کسی مشورے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ مثلاً۔ میں جانتی ہوں آگ مجھے جھلسا سکتی ہے تو میں ڈر کے اس کے قریب نہیں جاتی لیکن کسی اور کو اس آگ کے قریب جانے سے بھی نہیں روکتی بلکہ جان بوجھ کر وہیں دھکیل دیتی ہوں تو یہ میرا نفسیاتی الجھاؤ ہے جو مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن کسی دوسرے کو چاہا کہ سکتا ہے جب میں گالچ میں بڑھتی تھی تو ہماری ایک بچہ کمارتی تھیں نفسیاتی مریض کہی کیا نہیں ہوتا؟ اسے اور گرد رہنے والے ہر فرد کو ایک مختلف نفسیاتی الجھاؤ مکمل کر رہا ہوتا ہے یعنی ایک سے دس افراد متاثر ہوئے تو سمجھو معاشرے کے دس خاندان پر ہوا ہوئے اگر انسان کو احساس ہو جائے کہ اس کی معمولی عادات اتنی تباہی لاسکتی ہیں تو اس عادت کو بھی کیوں نہ بدل لیا جائے۔ اس لیے ہم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ کم سے کم مینے میں ایک بار اپنی شخصیت کا جائزہ ضرور لیں۔ بالکل غیر جانبداری سے پھر اپنی غلطیاں

سدا ہمارے ہی کو کر رہی تھی۔ اس کو جس سے ہی دراصل فطرت کی تبدیلی کا عمل شروع ہو گا۔" سائل نے آئی پوری گفتگو کو یاد آ کر ایک منطقی انجام تک لے لی تھی۔
 "زری! ہم بھی یہ طریقہ آزما کر دیکھتے ہیں، پھر ایک مہینے کے بعد ہی دیکھیں گے ہماری شخصیت میں کیا تبدیلی آئی ہے۔" عائشہ نے کہا۔
 بالکل میں راضی ہوں، ویسے بھی شوہنار کتنا ہے ارادہ زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ ارادہ آقا ہے اور عقل لونڈی ہے۔"

"یہ ویسے شوہنار ہے نہ کہ جو کتنا تھا عقل اپنی فطرت میں عورت کی طرح ہے۔ یہ اسی وقت کچھ دیتی ہے جب یہ کچھ لے لیتی ہے۔ اپنی ذات میں یہ شخص کو کھلے جھلکے کی مانند ہے۔" عائشہ نے پوچھا۔ سو ہی جو بڑی دیر سے چائے کا خالی کپ ساتھ میں پکڑے مگر فکر سب کو دیکھ رہی تھی یکدم بولی۔
 "تنتابہ تیز ہے یہ شوہنار۔ کسی نے اسے عورت کے بارے میں بات کرنے کی تیز نہیں سکھائی؟" اس کی بات پر ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا تھا۔

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟" ماوی نے شرمندہ ہو کر پوچھا۔
 "نہیں غلط بات تو نہیں کی۔ شوہنار کو واقعی کسی نے تیز نہیں سکھائی تھی۔ ہمیں جو کتابیں چاہیے تھیں مل گئیں؟" عائشہ نے پوچھا۔
 "میں۔ میں ابھی دیکھ رہی تھی۔" وہ مک رکھ کر واپس اسی کمرے میں آ گئی۔
 "مید! آپ نے عمر ذرا کی عروس مرزا کا قصہ سنا؟" زرناسہ نے کوئی اگلا قصہ پھینچ دیا تھا۔



اور یہ جنت کی زندگی کا انھوں سال تھا۔
 اپنے ارادے کے مطابق زہرہ اس کی تربیت پر خاص توجہ دے رہی تھی۔ نہ ہی احکامات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ اسے وہ تمام اصول بھی سکھانے کی کوشش کرتی جو معاشرے میں ایک اچھے انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے لیے ضروری اور مددگار ہو سکتے ہیں اپنی توجہ اور محنت کے ثبات اثرات دکھائی دینے لگے تھے۔ اتنی ہی عمر میں بھی جنت کا سلیقہ تیز و تند سب نے لوگوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بے حد سلیقے ہوئے مزاج کی لڑکی کی طرح یہاں چڑھ رہی تھی۔ وہ زہرہ اور وادی کی ہر بات مانتی تھی۔ اچھے مزاج کے ساتھ ساتھ وہ بہت خوبصورت بھی ہو گئی تھی۔ خالص ماحول، تواناہ خوراک اور بہترین تربیت نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اچھے قد کاٹھ کی بنا پر وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے بڑی دکھائی دیتی تھی اور اس چہرے اس کے انداز میں کچھ جھجک پیدا کر دی تھی۔ سوہنچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کو دتے شہابی اور زیادہ تر ماں کے آئینے میں چھپی رہتی۔
 زہرہ اس صورت حال سے خوش تھی اور مطمئن بھی کیونکہ اس کے خیال میں شرم و جھجک لڑکیوں کا گناہ ہوتا ہے۔ جب بیاہیے بچے کھیل رہے ہوتے اور جنت اس کے پتلے سے چھپی رہتی سب زہرہ خوشی سے پھولنے لگتی۔ سنا۔ زہرہ کو جنت کے معاملے میں صرف اس وقت وقت کا سامنا کرنا پڑا جب وین محمد گھر میں موجود ہوا تو یونہی وین محمد کی موجودگی میں جنت اس کی باتوں پر کان دھرتا بند کر دی تھی نہ صرف یہ بلکہ اس کے سکھانے پر بھائے سارے اسباق بھول جاتی تھی۔

"پاپ کی شہکار وہاں اور وادی سے زبان درازی کرتی۔ ضد کر کے اپنی باتیں منواتی اور جب زہرہ اس سے سختی سے پیش آنے کی کوشش کرتی تو وین محمد کہتا۔

"جنت کو ٹالنا نہ کر زہرہ! جنت میں یہ سارا نیو نیو باتیں مانی نہیں جانتیں۔" اپنی ہی بات سن کر جنت اور میر ہو جاتی اور زہرہ کو کھٹے پیٹھ جاتی۔ جنت ابھی بھی کسی اسے اچھائی برائی کی اور کچھ بھائی جاسکتی تھی مگر وہ دین محمد کا کیا کرتی؟ جسے اولاد کی تربیت کے سہری اصولوں سے کوئی غرض نہیں تھی بلکہ وہ سمجھتا تھا اولاد کی تربیت کا یہی بہترین طریقہ ہے جو اس نے اختیار کر رکھا ہے۔

کم گو زہرہ کبھی بھار دین محمد کی اس روش پر کڑھتی تھی لیکن پہلے کی طرح اس نے فکر مند رہنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے مالی حالت پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو گئے تھے۔ زمین، جائیداد میں اضافہ ہو چکا تھا اور مسلسل ہو رہا تھا۔ وین محمد شوہنار سے جنت کی برکت قرار دیتا۔ گھر میں ملازمین کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ زہرہ جنت کو ملازمین سے بھی اونچی آواز میں بات کرنے سے روکتی لیکن وین محمد کو اس کا ٹوٹنا برا لگتا۔ "تو کر کو اس کی اوقات بتا ہونی چاہیے۔ میری بیٹی کو اپنی باتیں نہ سکھایا کر۔ آج ان کینوں سے رعب کے ساتھ بات کر کے کی تو آگے کی زندگی میں حکمرانی کرنا سیکھے گی۔" وہ جنت کو سامنے بٹھا کر زہرہ سے کہتا۔

"میری جنت حکمرانی کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔"
 زہرہ کا دل چاہتا وین محمد کو سمجھانے مگر سخت مزاج شوہر کے سامنے زبان کھولنا کتنا بھی آسان نہ تھا۔ یہ ایک ایسا ہی دن تھا وہ وین محمد کی بات پر کڑھ کر گھر سے نکلی تھی اس کے ساتھ جنت اور دو ملازمین تھیں وہ لوگ قریبی شہر کے بازار آئی تھیں تاکہ آنے والے موسم کے لیے کچھ پکڑے خریدے جاسکیں۔ خریداری کرتے ہوئے ایک دم اس کا سامنا زہرہ باجی سے ہو گیا ان کے ساتھ فارق تھا۔
 جنت کی وجہ سے ہونے والے جھگڑے کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی چار سال بعد ایک ملاقات۔ اس جھگڑے کے بعد خاندان کے کچھ بزرگوں نے مصالحت کے لیے کچھ کوششیں بھی کیں جو وین محمد کی تندگی طبع کی نذر ہو گئیں۔

طلوع عرس بعد دو دنوں عورتوں کا سامنا ہوا تھا۔ زہرہ کا دل بھائی کی اکلوتی بیٹی کو دیکھ کر گداز ہو گیا۔ ایک معمولی سی بات کے پیچھے اس کے بھائی نے من موڑ لیا تھا۔ اس نے جنت کو خوب بارگاہ اور بھادج سے خیریت معلوم کرتی رہی۔ فارق بھی کافی لمبا ترنگا ہو گیا تھا اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سی داڑھی موچھ دکھائی دے رہی تھی۔
 "وین محمد چاہتا تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا تھا۔ جھگڑے کمال میں ہوتے لیکن یوں بس بھائیوں سے منہ تو نہیں موڑا جاتا۔ بس تھوڑی سی عقل مندی کی ضرورت تھی جو ہم میں سے کوئی بھی نہیں دھکاسکا۔ ورنہ بچوں کے جھگڑوں کی بھی کوئی اہمیت ہے۔ ان دونوں سے پوچھ کر دیکھو جس بات کو بنیاد بنا کر وین محمد مجھ سے منہ موڑے بیٹھا ہے وہ ان بچوں کو یاد بھی نہیں ہوگی۔"

زہرہ بھائی نے دھکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ زہرہ کو بھی ان کی باتوں سے دکھ پہنچا لیکن گھر آگرو بھول بھال گئی۔ وین محمد کا کوئی حل ہی نہ نکلا ہوا، انہیں سوچنے کا فائدہ؟ وہ یہی سوچتی ہوئی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ صحن میں کھیلنے سے ایک مونا سا بچہ آیا تھا، وہ تیزی سے اس کے پیر کے قریب سے گزرا۔ زہرہ اپنی دھن میں بھی گھبرا کر پیچھے ہٹی اسی دوران اس کا پیر مڑ گیا۔ سمجھنے کی کوشش کے باوجود وہ سر کے بل زمین پر گری۔ اس طرح کہ اس کے سر کا پچھلا حصہ پوری قوت سے دروازے کی دہلیز سے ٹکرایا تھا۔ اپنی بیٹی کے لیے بڑے بڑے خواب دیکھنے اور بھائے کی کوشش کرتی بشرطیکہ زندگی نے اس کا ساتھ دیا ہوگا۔ شخص چند لمحوں میں اس نے زندگی ہار دی تھی۔



"وہو بھی۔ آج تو بہت ہی حسمن ہو گئی۔" ماوی آتے ہی بیٹھ کر گئی لیکن گرنے سے قبل اپنا وہ پٹے فائل

پس سوزا پر وہی سے دوسرا دوسرا چھٹنا میں مہولی کی۔
 "جس کام کے لیے مہولی ہو گا کہ نہیں۔" "میں نے اپنی دختر تک اکثر کوری طرح گھورا ساتھ ہی بکھرا ہوا بھی سمیٹنے لگیں۔

"سیدنی پر سنٹ تو ہو ہی گیا۔" "ماوی نے کہا۔" لیکن ابھی کچھ کام باقی ہیں۔ یہ سینار کا جھنجھٹ نہ ہوتا تو وہ بھی نہٹ جاتے۔"

"سینار کیسا؟" "میں نے پوچھا تو ماوی انہیں بے زاری بھرے انداز میں تفصیلات بتانے لگی۔
 "موضوع تو بہت دلچسپ تھا۔ یہ ہاؤس میری ذہن و فطین میں اترنے بھی کچھ سیکھا ہے کہ نہیں؟" "میں نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا سر ہاتھ سے سلانے لگیں کہ وہ شکل سے ہی بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

"آپ کو بتاتا ہے مجھے اس ناپک میں بالکل دلچسپی نہیں ہے۔ اوپر سے سارے میں تھکے تھکے شان اسٹاپ ایسی ایسی سائیکالوجی ٹرمز کے بارے میں سن کر آ رہی ہوں کہ مجھے اپنے دماغ کی پچھنی بنی محسوس ہو رہی ہے۔ اور گاڈا پتا نہیں لوگ اتنی مشکل باتیں کیسے کر لیتے ہیں۔ اوپر سے سلطانہ آئی اور ان کی کوئیکز کی فلاسفی سن لیں۔ یہ عقل ان کے ہم میں سے ہر انسان خود ذرا بہت نفسیاتی مریض ہوتا ہے۔"
 "کیا؟" "میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ہمارے روز مرہ کے معمولی رویے جیسے غصہ، حاکمیت پسندی، خود پسندی، غم، خوشی وغیرہ وغیرہ یہ ہر انسان کے فطری رویے اور جذبے ہیں جو انسان اپنے رویوں اور جذبول پر قابو رکھتا ہے وہ تو نادر مل ہے لیکن جن کے یہ معمولی رویے اور جذبے آؤٹ آف کنٹرول ہو جائیں وہ دراصل نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں یہ نفسیاتی امراض بظاہر دکھائی نہیں دیتے لیکن اندر ہی اندر مریض کی پوری شخصیت کو جس جس کر کے دکھ دیتے ہیں۔ ایسا مریض تشا نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے ارد گرد رہنے والے کوں افراد کو نفسیاتی طور پر متاثر کر رہا ہوتا ہے۔ وہیں خاندان جاتے ہیں ہوں ایک ایک نفسیاتی مریض کی بدولت اس خاندانوں کی بنیاد میں وہ نفسیاتی مرض پھیلتا ہے۔ ایک معمولی نفسیاتی امراض کا شکار انسان اپنے ارد گرد رہنے والوں میں سے کسی فرد کو بہت شدید نفسیاتی امراض بھی منتقل کر رہا ہو سکتا ہے اس لیے ہم میں سے ہر انسان کو چاہیے اپنا شمار اس ضرور کرنا ہے کہ کہیں ہمارا کوئی معمولی رویہ کسی دوسرے کی پوری زندگی تباہ کرنے کا سبب نہیں بن رہا۔ وہ جو کہتے ہیں وہ سے دیا جلتا۔ تو ایسا بول نفسیاتی امراض کے ایک بڑے دوسرا دیا جلتے جلتے کسی کی زندگی کا ہر اہمرا جگہ ہی جلا کر رکھ دے پلیز می ڈیونٹ لائے ٹوی۔ سچ بتائیے کیا آپ کو ایک بھی بات سمجھ میں آئی؟"

تقریر کرنے کے انداز میں بولتے بولتے اس نے گردن موڑ کر شینہ کی جانب دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے اس کی بات سن رہی تھیں۔

"کیس کپ متاثر تو نہیں ہو گئیں؟" اس نے غیر سنجیدگی سے پوچھا۔
 "بات میں وزن تو ہے ماوی! "میں نے نے سوچ انداز میں کہا۔

"کو کم کن۔" اسے اچھا خاصا اختلاف تھا۔ "انسان کی دل پاور قوت ارادی اتنی اسٹرونک ہوتی تو آج دنیا میں اتنے ری ایجن اور میٹل انسانیت ہوتے۔ ہر انسان اپنا پلان خود ہی کر رہا ہوتا۔"

"میں تو بات ہے بہتر انسان کو شش ہی نہیں کرتے۔ سوزن مرض کی تشخیص ابتدا میں ہی ہو جائے تو مرض بڑھنے سے روکا جاسکتا ہے۔" "میں نے خیال ظاہر کیا پھر اس کی بے توجہی دیکھ کر بولیں۔

"اچھا خیر۔ اب لینے کی ضرورت نہیں ہے اچھ کر فریش ہو لو۔ ہمیں انیسا کی طرف ڈنر پہ جانا ہے۔ فیضی نے بتایا نہیں تھا کہ نہیں۔" "میں فیضان فون پر مہلک کر چکے تھے۔

"بیٹا تھا لیکن میں بہت تھک گئی ہوں می اور یاؤں کے ذمہ میں بھی بہت دوسرے لگ رہا ہے کس پڑ گئی ہے۔"
 "میں نے پسے ہی کا تھا زخم گرا ہے اس کا خیال رکھو مگر تم کسی کی سنجی کہاں ہو۔" "میں نے غر مندی سے کہا۔

"مجھے تھوڑا سا لینے دیں۔ آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔
 "کوئی ضرورت نہیں سونے کی چلو ابھی ڈاکٹر سے ڈرننگ کرا آتے ہیں یاؤں کی پھر انیسا کی طرف سے واپس آکر سولیا۔" اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"تم سے تو فیضان ہی تھے گا۔ لیکن وہ خود کہاں رہ گیا ابھی تک اندر کیوں نہیں آیا۔" "میں نے جانتی تھیں جب تک فیضان سے ڈائننگ نہ کی جائے پر اتنا نہ ہوگی۔

"شاید ڈراؤن کو فارغ کر رہے ہوں گے۔" "ماوی نے کہا شینہ سنی ان سنی کر کے یا ہر کھل گئیں۔ ماوی انہیں شہو کی کال کے متعلق بتانا چاہتی تھیں لیکن انہیں یا ہر نکلتے دیکھ کر کسی اور وقت پر ٹال کر آنکھیں موند لیں وہ حقیقتاً بہت تھک گئی تھی اور جب تک فیضان نے آکر کمرے میں جھانکا وہ کمری نیند سو چکی تھی۔



کہا تا ہے حد لذت تھا ہے حد خوش گوار ماحول میں کھایا گیا لیکن جب تو قیر صاحب ہاتھ دھونے کے لیے اٹھے تو وانیال حسن چپکے چپکے تھکے ان کی پاس آگئے۔

"تم تو کہہ رہے تھے فیضان مددی بہت تجربہ کار آدمی ہے۔ دلوں میں ہمارے کاروبار کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا۔" "آواز بے حد صمیمی لہجہ متذہب۔ تو قیر صاحب نے کسی قدر حیرانی سے انہیں دیکھا۔

"جس فیضان پر شک ہے؟"

"مجھے فیضان پر نہیں اس کے تجربہ پر شک ہے۔ جب تم فیضان فیضان کرتے رہتے تھے میں نے سوچا کوئی ہماری مڑا آدمی ہو گا لیکن۔ تو اتنا تک لگ رہا۔ بہت زیادہ کسی اس کی عمر کا اندازہ لگاؤں تو چھٹیں یا سبب تیس سال کا ہو گا۔ اپنی سی عمر میں کتنا تجربہ ہو سکتا ہے اس کی پاس۔"

"فیضان جو تیس سال کا ہے۔ لیکن جتنے تمہارے سر میں سفید بال ہیں کو پیش اتنی ہی اس کا تجربہ ہے۔ تو قیر صاحب نے سہمکراتے ہوئے کہا پھر سبب نہ کر کے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولے۔

"فیضان کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کا شکار مت ہو۔ میں گارنٹی دے رہا ہوں تو کچھ سوچ سمجھ کر۔ فیضان کو بہت چھوٹی عمر سے جانتا ہوں میں! ماشاء اللہ بہت ذہین اور قابل بچہ ہے۔ بہت کم عمری میں پریکٹیکل فیلڈ میں آیا تھا سو تجربہ کار تو ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ قسمت کا بہت مدد تھی ہے۔ مٹی کا ہاتھ لگا کر سونا بنا دیتا ہے تو دیکھ لیتا اس کی سنجیت میں ہمارا کاروبار کتنی ترقی کرے گا۔ اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس بھی اس نے صفر سے شروع کیا تھا اگر کو تو اب میں اس کے اعداد و شمار گنواؤں؟ تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ تو قیر صاحب فیضان کے کچھ زیادہ ہی مداح تھے۔

وانیال حسن چند لمحے سوچتے رہے پھر کمری سانس بھر کر بولے۔

"میں نے اپنی جمع پونجی صرف تم پر بھروسہ کر کے اس شخص کو سونپی ہے۔ اگر نقصان ہوا تو یاد رکھنا میں صدے سے ہارٹ اٹیک کے ہاتھوں مرنے سے پہلے تمہیں قتل کروں گا۔" تو قیر صاحب ان کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"یہ مت بھولو کہ میرا بھی برابر کا پیسہ لگا ہے۔ خدا انخواستہ ڈوبیں گے تو انٹھے ڈوبیں گے لیکن ایسا ہو گا ہی نہیں

”مجھے خدا اور فیضان پر بہت محبوب ہے۔“
 ”ہاں! انشاء اللہ ویسے میرے خدشات ایک طرف۔ یہ لڑکا اپنی باتوں سے تو ہوا ہی لگ رہا ہے۔“ انہوں نے چاکی سے کہا۔

”تو بھگ۔“ وہ دونوں ہنستے ہوئے ہال کی طرف آگئے۔ یہاں ایک دائرے میں رکھے صوفوں پر منیوہ، ٹینس، ٹروت، براجہن، ٹھیں۔ میںیں فیضان ولید سے باتیں کر رہے تھے۔ جبکہ کچھ فاصلے پر کشتی پر بیٹھی انیہا پری اور پریوش کی زوردار بحث میں مصروف تھیں۔ تو قیر اور وانیال حسن آئے تو ولید جا کر لڑکیوں کے ٹولے میں گھس گیا۔ وانیال حسن فیضان سے خام لوہے کی بڑھتی اور ٹھنکی ہوئی قیمت پر بات کرنے لگے۔ فیضان نے کئی بار لاشعوری طور پر انیہا کی طرف دیکھا۔ اس سے معذرت کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھے ورنہ کل بھر انہیں ماوی کی باتیں سننا پڑتیں۔

”آپ کسی روز میرے ساتھ چلے گا۔ میں نے اور میری کچھ فریڈز نے مل کر ایک چھوٹی سی سوسائٹی بنا رکھی ہے، تھوڑی بہت چیزیں کر لیتے ہیں جیسے میم، بیچوں کی شادیاں، کوٹنگ، باقی تو بچی بات ہے مل بیٹھنے کا مہمانہ ہی ہے۔ میں آپ کو سب سے طواؤں کی اسی برائے آپ کی بورت بھی دور ہو جائے گی۔“ ٹروت ٹینس سے کہہ رہی تھیں۔ منیوہ نے بھی ان کی ہال میں ہال ملائی۔

”واقعی ٹینس کیا! آپ ضرور ٹروت کے ساتھ جائے گا؟ اس کی سوسائٹی ممبر سب کی سب بہت اچھی ہیں۔ میں ایک بار مل چکی ہوں۔ سو بارہ اس لیے نہیں مل سکی کہ ایسی کسی ایکسٹری کے لیے ٹائم ہی نہیں ملا۔ ارے ٹروت! تم نے کافی میں جتنی نہیں ڈالی؟“ منیوہ نے ایک سب سے لے کر پوچھا۔

”وہ مجھے لگتا ہے ہمارے مکہ بدل گئے ہیں۔ میں نے اپنے لیے بغیر جتنی کے کافی بتائی تھی۔ اصل میں مجھے بغیر جتنی کے کافی پسند ہے۔ ایک دان بھی ڈال جائے میری کافی میں تو ایسا لگتا ہے ساڈی بو آ رہی ہے۔“ ٹروت کہہ رہی تھیں۔ ٹینس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ تیلی سا ڈمی میں لمبوں ناک چڑھا کر بولتی ٹروت۔ سارا منظر جیسے فلیش بک میں چلا گیا تھا۔

”ارے تم ٹروت ہو۔ ملن والی ٹروت۔ مستقیم بھٹی کی بیوی۔“
 ٹینس کے لیے یہ چند لمبے پچوان کا ایسا شدید انکشاف لے کر آئے تھے کہ وہ بے ساختہ کہہ بیٹھیں۔ ٹروت کے ہاتھ سے مکہ جھوٹ کر نیچے جا کر ان کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ منظر پر ایسا ناگہا گھبراہٹوں کی کیفیت سے مشروط تھا۔ وسیع عریض ہال میں بیچوں کی توازیں گھنٹیوں کی جھنجھٹا ہٹ کی طرح محسوس ہو رہی تھیں جو کچھ فاصلے پر بیٹھی اس دائرے میں اچانک آتے دھچکتے والے ماضی کے اس حوالے سے قطعی لاعلم تھیں۔

”مجھے میں ہزار روپے چاہئیں۔“ وحید نے سر ہاتھوں میں گرا کر کہا تھا۔ نیل چائے پی رہا تھا اسے بری طرح اچھو لگ گیا۔
 ”کیا کم از کم ادب پارہ کتا۔“ کھانسی رکھتی ہی اس نے سانس بحال کرتے ہوئے پوچھا اور ایسے پوچھا جیسے وحید کی عقل پر شک گزرا ہو۔
 ”مجھے۔ میں۔ ہزار۔ روپے چاہئیں۔“ ستام نے ”میں ہزار۔“ وحید نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ہااا۔ برا دلچپ لطیف تھا۔“

”نیل! میں تیرا سر بھاڑوں گا! او! ار! میں جج کہہ رہا ہوں، مجھے واقعی میں ہزار کی اشد ضرورت ہے۔“ وحید نے روٹا ہوا ہوک کہا۔

”اگر ضرورت ہے بھی تو میرے پاس کیوں آئے ہو؟ میں اسے فی ایم مشین ہوں۔“
 ”نیل! میں سخت مشکل میں ہوں۔ اس مشکل وقت میں تم میری مدد نہیں کرو گے؟“ وحید نے بے حد مسکینی سے پوچھا، ”میں تک کہ نیل جیسے شخص کا دل بھی پھل گیا۔“

”مسئلہ کیا ہے؟ تم میرا بندہ تو سو روپے سوچ سوچ کر خرچ کرتا ہے میں ہزار کی ضرورت کیسے پڑ سکتی۔“

”یار! وہ عشاء نہیں ہے؟“

”کیا مطلب نہیں ہے؟“

”اوہ۔ خود سے کوئی بات نہ سمجھتا۔“ وحید نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

”یار! وہ جو عشاء ہے نا وہ جان کو آگئی ہے۔ لٹلی میری ہے۔ پہلے اسے پچوان ہی نہیں رکھا۔ وہ۔۔۔ وہ نمبر مجھے لگا ہے اس سے۔“ لیکن میں ہزار مانگ رہی ہے رقم لے بغیر جان بھی نہیں چھوڑے گی۔“

”میں نے پہلے ہی مجھے وارن کیا تھا ایسی لڑکیوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔“ نیل نے اسے بری طرح تانا ڈا۔

”اب ہو گئی لٹلی ہو گیا کروں؟ خود کشی؟“ وحید بھاڑ کھانے کو دوڑا۔

”کری لو تو اچھا ہے، کیونکہ میں ہزار کا انتظام تم سے ہو نہیں سکتا اور عشاء لی لی رقم لے بغیر تمہارا چچا چھوڑنے والی ہے نہیں چند روز بعد بھی تو اس صورت حال سے نکل آکر تم نے خود کشی کرنا ہے تو ابھی کیوں نہیں؟“ نیل نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ وحید کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”تو میری مدد نہیں کرے گا نیل؟“

”اوہ۔۔۔ ایسا تو سوچنا بھی مت مجھے میرے آبا مینے کے پانچ ہزار دیتے ہیں، جنہیں اگر میں سو گتھ سو گتھ کر استعمال نہ کروں تو بندہ مارے تک ہی ختم ہو جائیں، میں ہزار کے لیے تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے سادہ بھٹی بول دیا۔

”نیل پلیز ہزار تو میرا دوست نہیں ہے۔“ وحید نے منت بھرے انداز میں کہا۔

”پھر وہی بات دوست ہوں اسے فی ایم مشین نہیں۔“

”پھر میں کیا کروں؟ میرے ابا کو اس معاملے کی خبر ہو گئی تو وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے عشاء نہ دھکی دی ہے۔“

”میری ماں! جھڈی سے مدد مانگ۔“ نیل نے راہ دکھائی۔

”ایم۔“

”ہاں۔ صرف جھڈی سے جو تیری مدد کر سکتا ہے، میں ہزار تو اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے یا۔۔۔ بس تھوڑی بڑک سے کام کرنا پڑے گا۔“

”جھڈی عقل اور مشکل دونوں سے چند ضرور ہے، لیکن جذبات اس میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہیں۔“ وحید نے جھنجھلا کر کہا۔

باتی ریتو شامیوس



تاوٹ

روٹیل کے لیے باپ کی اچانک موت کسی عارٹے سے کم نہیں ہے۔ وہ زیاداری کے لیے باپ کے جنازے میں شریک ہوتا ہے۔ لغت (سوتیلی ماں) کا بدلہ ہوا روٹیل سے حیران کرنا ہے۔ جب وہ باپ کی دکان سنبھالنے کی ذمہ داری روٹیل کو سونپتی ہے تو وہ ششدر رہ جاتا ہے۔ اسے لغت کی کسی بات کا یقین نہیں آتا۔ تاہم پچھو پچھو خدیجہ کے بھانے پر وہ چھوٹے بسن بھائی اور لغت کی سرپرستی اور دکان چلانے کی ذمہ داری اٹھالیتا ہے۔

بالا کی اچانک آمد زندگی کے سارے بالان پر پانی پھیر دیتی ہے۔ وہ میڈم فقیدہ کے سامنے ٹائیہ اور روٹیل کو روٹے باغوں پر لٹا دیتا ہے۔ تھی کار سب کا ٹک ٹک ٹک ٹک میں بدل جائے لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے۔ ٹائیہ اور بالا دوبارہ ایک دوسرے کے نزدیک آجاتے ہیں۔ بالا ٹائیہ کو ایک ماگ کے اندر اپنے ساتھ لے کر جانے کا مشورہ دیاں شاتا ہے تو سکون کا سانس لیتی ہے۔ اس کی یہ لطف منی بھی دور ہو جاتی ہے کہ جسے میں بالا بلیمہ کی کے متعلق بہت کم گزر آ تھا۔ روٹیل کے لیے یہ سب براشت کرنا بہت مشکل ہے۔

۱۳

تین سو بیڑا قسطنطنیہ



اس کا پھر سے زندگی سے بے جا چلتا ہو گیا تھا۔
 نصرت کی اس رات کی گفتگو نے اسے بدل کر دیا
 تھا ہر چیز سے جتنی کہ خود سے بھی۔
 آخر اس کے بچے کا مقصد کیا ہے یہ چند سال جس
 میں اسے گڈو کو دیکھ کر بٹھانے کے قابل کرنا ہے
 وہ نولہ سولہ کی شاکیاں اور بس۔۔۔
 اس کے بعد وہ خود کہاں ہو گا؟ اس کے لیے اسے
 بہت نہیں سوچنا پڑا تھا۔
 اور اس سوچ سے آگے وہی سیاہ اندھیری راتوں
 میں لمبی لمبی نہ ختم ہونے والی سڑکیں جن پر وہ بلا مقصد
 چلتا چلتا جاتا تھا اور شب بیری کے لیے ایک ٹھکانے کی
 تلاش میں اکثر گلی کے کتوں کے آس پاس اسے جگہ
 ڈھونڈنی پڑی تھی۔
 اور اب یہ تصور اور اس تصور میں جا کر سانس لینا
 ناقابل برداشت تھا۔
 "کاش میں اس عورت کی اور پیچھے کی بات نہ ہی
 بانتا جیسا تیرا اپنا کوئی ٹھکانا بتائی لیتا۔" سوچیں
 کہ اگر وہ گڈو کا کون کے ہوتے ہوئے رش سے بھی
 بے نیاز لڑکی بنی آری تھیں۔ شور سے اسے اپنی فحلت کا
 احساس ہوا۔
 کسی گاہک کا اس کے ملازم سے جھگڑا ہو گیا تھا
 بھٹکل اس نے محلہ سنبالا۔ پھر سے ان ہی سوچوں
 کی طرح اپنے آگے بھاگ کر ٹھکانا شروع کر دیا۔
 "مجھے اپنے لیے الگ سے تھوڑی بہت رقم پس
 انداز کرنا چاہیے دکان سے" نصرت اپنی بیٹیوں کے
 مستقبل کے لیے کمیشنیں ڈال سکتی ہے تو اپنی محنت کا
 معاوضہ لینا میرا بھی حق ہے۔" اس کی سوچوں نے
 اسے ایک نیا راستہ دکھایا۔
 "دوری دوری نہیں ہوگی میری محنت کا معاوضہ
 ہو گا۔" اس نے خود کو پکلی دیکھ لی۔
 "اور جو پھت لی ہے" تین وقت کا کھانا صاف
 دھلے استری شدہ کپڑے وہ سب میرا حق ہے؟ اس
 نے خود ہی غمی کرتے ہوئے سر جھٹکا۔
 "تو جو حقوق کی بات کرتے ہیں" فرض کے بارے

میں سوچنا کیوں بھول جاتے ہیں باپ کے مرنے کے
 بعد یہ سب بڑے بھائی ہونے کے باعث اس کا فرض
 ہے اور جہاں تک نصرت کی خود غرضی ہے تو یہ
 خود غرضی تو دنیا کے ہر رشتے میں ہے ایک دوسرے
 سے جڑی تانزیر۔ "ایک دم اس کا دل جیسے مطمئن سا
 ہو گیا۔
 "ٹھیک ہے" بے شک یہ لوگ مجھے دو چار سال بعد
 لات مار کر الگ کر دیں میں کوئی بے ایمانی نہیں کروں
 گا چاہے مجھے پھر سے فتنہ پہنچے۔ کیونکہ تانزیر۔"
 وہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔ اسی وقت سیل فون بجتے
 لگا۔
 زونیر کا فون تھا وہ سوچ میں پڑ گیا۔
 مجھے اس ٹھیک کو حکم کرنا چاہیے اس میں
 سوائے اذیت کے اور کچھ بھی نہیں اس نے کال نہ
 رہے سو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
 مگر ظاہر ہے اس کا یہ فیصلہ یک طرفہ تھا۔ زونیر کا
 موڈ تو ابھی ٹھیک جاری رکھنے کا تھا۔ گانا نمکس پہ پہنچ کر
 یوں بھی ٹھیک کون حکم کرتا ہے جبکہ اسے اپنی جیت کا
 فیصلہ بھی ہو۔
 سو زونیر کی کار و قفے وقفے سے مسلسل آتے
 نکلیں۔ کچھ دیر کو اس نے سیل آف بھی کر دیا۔
 "مگر یہ مسئلے کا حل نہیں ہے ایک بار تو مجھے اس
 کی بات سن کر صاف جواب دینی ہو گا کہ وہ میری
 زندگی سے نکل چکی ہے۔" پلا آخر اس نے مسلسل
 بچنے پر سیل کن سے لگایا۔
 "تم خود کو سمجھتے کیا ہو" ہو کیا تم؟" وہ جیسے پھٹ
 پڑی۔
 "میں جو ہوں مجھے خود پتا ہے تم صرف یہ بتاؤ اس
 طرح مسلسل کسی کو ڈسٹرب کرنے کا مطلب؟" وہ
 ایک دم سے روکھا ہو گیا۔
 (جب دل کو کوئی آس ہی نہیں رہی تو پھر یہ ملی
 چوہے کا ٹھیک کیوں؟) وہ سوچ رہا تھا۔
 "مطلب تو تمہیں اچھی طرح سے پتا ہے۔" وہ طنز
 سے بولی۔

"فون کس لیے کر رہی تھیں؟" وہ اس کا طنز نظر انداز
 کر کے بولا۔
 "تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔" وہ اسی لیے میں
 بولی۔ وہ خاموش سا ہو گیا۔
 یہ سب بھی تو کم دینا آسان نہیں تھا کہ اسے لب
 لانیہ سے کچھ بھی کہی نہیں۔
 "تمہارا کیا خیال ہے مجھے بہت شوق ہے تمہیں
 یوں بار بار فون کرنے کا۔" وہ ذرا احتیاط سے بولی
 "صرف لانیہ کا خیال نہ ہونا شاید میں کہی۔" وہ کچھ
 سخت الفاظ کہنے سے روک گئی۔
 "اب کیا مسئلہ ہے؟" وہ خود بھی وہ سخت الفاظ سمجھ
 چکا تھا مبادا وہ بول نہ دے فحلت کا احساس ملانے کو
 جلدی سے بولا۔
 "تمہیں ابھی لانیہ سے ملنے کے لیے آنا ہے"
 آدھے گھنٹے میں۔" وہ جتنی لمبے میں بولی۔
 "اس سارے معاملے کو آج آریا پار کرنا ہو گا جو تم
 چاہتے ہو جو لانیہ چاہتی ہے میرے خیال میں آج یا
 کل بلال بھائی بھی اپنا فیصلہ سنانے والے ہیں۔" عمامے
 لاکھ مچ کرنے اور سمجھانے کے باوجود وہ لانیہ کو ساتھ
 لے کر جانے پر تیار نہیں ہوئے وہ شاید اس ہفتے
 واپس چلے جائیں۔" وہ ٹرک روک کر افسردگی سے بول
 رہی تھی۔ روئیل سے تو کچھ بولا ہی نہیں گیا۔
 بہر حال وہ ایسا نہیں چاہتا تھا کہ لانیہ یوں بنا کسی
 جرم کے سزاوار ٹھہرائی جائے۔
 "کیا مسئلہ ہے تمہارا بھائی کے ساتھ۔" وہ قدرے
 سختی سے بولا۔
 "یہ تو انہیں ہی پتا ہو گا جنہوں نے یہ چند ماہ اس کے
 ساتھ گزارے ہیں انہوں نے اس میں ایسی کون سی
 خرابی دیکھی ہے کہ وہ کسی بھی طرح سے اس کے
 ساتھ نباہ کرے رہتا رہتا نہیں ہو رہے۔"
 روئیل اس کی بات پر خاموش ہو گیا۔ اس کی
 خاموشی میں بہت سے سوال تھے مگر وہ ان میں سے
 کسی بھی سوال کو زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا۔
 "تو پھر تم آ رہے ہو نا ابھی کچھ دیر میں؟" اس کی

بارے میں آگہ کرنا ضروری نہیں سمجھا اب بھی میرے اتنی بار کال کرنے پر تیار نہ ہوں گے۔ مجھ سے رابطہ کرنے کی زحمت میں کی تو اب جو کچھ بھی ہونا ہوگا میرا اس میں شامل ہونا ضروری نہیں۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے جی پی ٹی پر توجہ کیا۔

”مجھے کہیں نہیں جانے۔“ وہ پوری دہلیزی سے اسٹور کی طرف دھیان دیتے انگلی ٹون اس نے دوا بیزینس پہ لگا دیا۔

راز نہیں۔ سب کچھ بتا دے تو ان کے بارے میں سوچا واقعی پریشان ہو گئی۔

”کیا تمہارا جیل نے تم سے انکار محبت؟“ وہ اس سے کھلنا چاہتی تھی۔

”نہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”وہ تو اگر یہ سب کچھ نہ کہتا تو شاید اپنے اندر اتنے جذبول کے خلاف خیر سیلاب میں خود بھی کہیں رہ جاتا۔“

مجھے بھی اپنے ان جذبات کو تھوڑا سا راستہ دینا ہوگا باہر نکلنے کا۔ اس تک پہنچنے کا جس کی وجہ سے یہ سب۔۔۔

”وہ شاید آسودہ کر دی تھی۔“

”یہ سب مجھے سناؤ رہا ہے۔“ وہ منہ پھیر کر جذباتی بن سے بولی۔

”اگر میں نے یہ جذبات باہر نہ نکالے تھانے باتیں مریاؤں کی۔“ وہ رو پڑی۔

”پلیز۔“ تھانیہ کو سمجھ میں نہ آیا کہ اسے قہری دے یا ان جذبات پر بند باندھنے کے لیے کوئی نصیحت کرے۔

مگر یہ اس کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ کمرے سے وہ دونوں نکل ہی نہ سکیں۔

”تم سے میرے دل میں غم بھر کے لیے شک تو نہیں رہے گی جس کو میری سانسوں نے ایک ایک لمحہ سوچا چاہا ایسا لوٹ کر چاہا کہ مجھے جیسی بات پرست لڑکی کے ذہن سے کلاس ڈیٹریس بھی اٹھ گیا اسے تو اس جذبات کی کچھ خبر ہونی چاہیے کچھ تو انکار۔ کوئی معمولی سا بے توقیر جملہ ہمدردی بھرا سی۔ تسلی بھرا سی۔ زندگی کے لیے سفر میں میرے لیے بھی تو زاورا رہا ہو۔“

اور تھانیہ آنکھیں پھاڑے دفتر کے منہ سے یہ سب سن رہی تھی۔

وہ دفتر اچھے اس نے بہت عام سی مغرور خود غرض غصیلی ہنگڑا لور اور جانے کیا کیا سمجھا تھا نہیں سوچا تھا تو یہ وہ جو وہ اب اس کا کچھ رہی تھی۔

”تنہا شدت سے چاہتی ہوں؟“ وہ شدید روی بولی۔

”لیکن نفی! مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا جب تم شہباز کے پر پول کے لیے اٹھ رہی تھی تو پھر رو جیل سے ملنے کا فائدہ۔“ نفی بہت انصاف سے ڈرائیو کر رہی تھی جب متغذب سی تھانیہ نے پوچھا۔

”تم اس وقت سے نہیں گزرتی اس لیے انہیں سمجھ سکتیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کرب سے بولی۔

”میں سمجھی نہیں۔“ تھانیہ کچھ دیر بعد بولی۔

”رو جیل تم سے محبت کرتا تھا۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی تو تھانیہ غصے سے جھڑپ کر رہی تھی۔

”اور پائل بھائی کا پر پول آیا بلا کسی ایسی سوچ بچار کر کے اردو بھی کر لیا گیا تھا۔“ جانے یہ اس کمر میں کیا بیماری تھی وہ سوں کو نہیں کرنے کا موقع یہ مس کرتی ہی نہیں تھے۔ تھانیہ کو غصہ سا آیا۔

”اس کے باوجود“ جانتے بوجھے کہ تمہارا پر پول بھائی کے لیے قبول کر لیا گیا ہے چند روز میں شادی بھی ہو جائے گی۔“

”پھر بھی۔“ اس کی لمبی خاموشی پر تھانیہ بے چین ہو کر بولی۔

”پھر بھی رو جیل نے تم سے انکار محبت کروا لیا تھا۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”یہ بات اسے کیسے پہنچ گئی؟“ تھانیہ نے کچھ پریشانی سے سوچا۔

تو اس کے اور رو جیل کے چاب کچھ بھی سربست نہ تھی۔

”اس سے بھی کہیں زیادہ بہت زیادہ جو میں الفاظ میں ادا کر سکتی ہوں نہ کسی اور طریقے سے۔ بس ایک بار اس سے ملنے کی پیاس ہے اور اس کی طرف سے محبت بھرا ہی سی ہمدردی بھرا کوئی جملہ کوئی لفظ جو میرے لیے بہت قیمتی ہو۔ پھر جانی میں تم سے بھی نہ اس کے بارے میں بات کروں گی نہ تمہیں مجبور کروں گی کہ تم اس سے میرے بارے میں کچھ کہو۔“

”کیا محبت واقعی کوئی کو ایسا بے توقیر کر دیتی ہے کہ اسے اپنے منصب اپنی کا اس اپنے اسٹیشن کسی بھی بات کا خیال نہیں رہتا؟ جن کے لیے وہ لڑنے مرنے پر اتر آتا ہے۔“ تھانیہ کو حقیقی معنوں میں دفتر سے ہمدردی ہو گئی۔

”اور اگر وہ نہ کیا تو۔“ ایک لمبی چپ کے بعد تھانیہ نے ہنسنے سے کہا۔

”وہ ضرور آئے گا اس نے مجھ سے وعدہ نہیں کیا مگر تھانیہ! میرے جذبات کی طاقت اس کو کھینچ کر لائے گی میرے دل کو یقین ہے اور محبت کا تو جادو یہی ہے وہ آدمی کو یقین کی دولت سے مالا مال کر دیتی ہے۔ میرے دل کو بھی اس بات کا یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔“

تھانیہ ایک تک اس کو دیکھتی رہ گئی۔

”اور مجھے کیوں لے کر جا رہی ہو۔“ بہت دیر بعد ستانے والا یہ سوال جو بار بار تیار ہونے کے دوران بھی اسے جھجکا پھر سے زبان پہ آیا۔

”تم خود مل چکی اس سے جا کر۔“ وہ نرمی سے بولی۔

”میں گاڑی میں بیٹھ کر روٹ کر لوں گی۔“ وہ رو جیل کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پہلے تو اس نے ہی سوچا تھا کہ مل کر اسے سختی سے منع کرے کہ وہ اسے کل نہ کیا کرے مگر اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے فون کی بسمیل کے لیے دوسرے ایک دو دنوں میں اس نے چلے تو جانتا تھا پھر رو جیل سے سب بات کرنے کا فائدہ؛ اگر خدا خواستہ بلال کو پناہ مل گیا تو ایک نیا جھڑا شروع ہو جائے گا۔

”تم ایک بار میرے لیے گفت میرے جذبات اس تک پہنچاؤ گی تو پھر مجھے خود سے بات کرنا آسان ہو جائے گا۔“

پھر تم بے شک باہر گاڑی میں آکر بیٹھ جانا میں تھوڑی دیر تو۔“ وہ بات پوری کیے بغیر خاموش ہو گئی۔

”تم اس سے کوئی سی تو پھر میرے کہنے کی کیا جانے کی کیا ضرورت؟“ تھانیہ نے پھر سے مرامت کی۔

”تم میری اتنی سی بھی وعدہ نہیں کرو گی؟“ وہ دست زدو رنج ہو رہی تھی۔ ”دفتر! اس۔“ تھانیہ کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ اب کیسے انکار کرے۔

”میں نے اس سے بھی کچھ کہانی نہیں۔“ وہ ذرا دیر بعد سڑکی سے بولی۔

”جب بھی ہماری بات ہوتی وہ تمہارے متعلق ہی بات کرتا رہا اسے تو صرف تمہارا جنون، تمہاری دوا لگی۔“

وہ پھر سے آنکھوں میں ڈھیر ساری شکایت بھر کر بولی، تھانیہ کو پھر سے غصے سے جھڑپ کر رہا تھا۔

دفتر! اسے تو پھر سے ذرا رو کر دی تھی اور تھانیہ کی بے چینی پر صحت جاری تھی۔ جانے کون سا خوف سا تھا جو اس کو روک رہا تھا کہ وہ رو جیل سے نہ ملے۔

اور ڈیڑھ گھنٹہ بعد پھر وہ جیل سے نہ ملے۔

”میں کیا تھا اس نے بے چینی سے پھر دفتر کی طرف دیکھا۔“

دفتر! اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور نگاہیں سامنے سیاہ سڑک پر جمی ہوئی۔

”تم شاید یہ سوچ رہی ہو کہ ہمیں رو جیل سے نہیں ملنا چاہیے؟“ دفتر! اس کی طرف دیکھے بغیر شاید اس کی سوچوں کو پڑھ رہی تھی۔

”ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔“ وہ اب کے موت میں بھی اقرار نہ کر سکی، دفتر! نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔

تو چلو پھر واپس چلے ہیں۔ وہ ایک دم سے سرو لمبے میں بولی۔

”میں ہیں۔“ میں تو تم چلو مل لینا تم۔“ تھانیہ ڈرا سا ڈر کر ہکلاتے ہوئے بولی۔ دفتر! اتنی بالکل تھی، غصے میں اور جانے کچھ جا کر پھر اس کے ساتھ کیا سلوک کر لئی اس سے کچھ بھی بچھڑا تھا۔

"نہیں مجھے کسی سے نہیں ملتا دفع کرو چلو گھر۔"
 وہ ایک دم سے جذباتی ہو کر گاڑی روک کر بیٹے سے کہنے لگی۔
 "چھانسیہ تو نہیں کرو چلو۔" ثانیہ نے جھپٹ کر کہا۔
 "میں غصہ کر رہی ہوں؟ بالکل بھی نہیں۔" وہ پھر سے بدلے ہوئے انداز میں بولی "ثانیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔"
 "اور تم ٹھیک کہتی ہو جانے کا لئے کا ایک بھلا فائدہ بھی کیا ہے جب ہم دونوں میں نہ کوئی تعلق تھا نہ ہو سکا ہے تو پھر اس فضول کو شش کا فائدہ۔" وہ پھر سے پہلے جیسی ذہنی تازہ بن چکی تھی۔ اور ثانیہ کو ابھی بہر حال کچھ دن تو اس کے ساتھ رہنا تھا۔
 "پلیز ذہنی چلو تاہم چل رہے ہیں تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔" وہ بھی لیجے میں بولی۔
 "نہیں چھوڑو۔" وہ اسی شکل سے بولی۔
 "میں مل لوں گی تا اس سے پہلے جو تم چاہتی ہو یہ گفت بھی اسے دے دوں گی پھر تم اس سے پہلے بات کر لیا تو بہر حال آجائیں گے پلیز اب تو غصہ تھوڑا کر دو۔" وہ ذہنی کے مقابلے میں اب کوئی بھی رسک نہیں لے کر چاہتی تھی۔
 بال بال تو اس سے ذہنی اس کے معاملے میں اب کچھ بھی نہیں کہتا تھا مگر بال کا کیا بھروسہ اگر ذہنی اس سے کچھ کر دے وہ بھی تو اس کی انگوٹھی بھینٹا نا۔
 "چلو بس دیر ہو رہی ہے پھر ہمیں واپس بھی آنا ہے۔" ثانیہ نے ذہنی کے اسٹیرنگ پر رکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔
 "دیکھ لو پھر سوچ لو اگر تمہارا اہل بھائی ہے تو چلو ورنہ رہنے دیتے ہیں۔" وہ پھر سے اسی لیجے میں بولی۔
 "نہیں میں ٹھیک ہے چلو بس زیادہ تاہم نہیں لگانا بلال کا فون بھی نہیں آیا کہ وہ اسلام آباد پہنچ گئے یا نہیں۔" اس کا دھیان بلال کی طرف چلا گیا تو اپنا سیل چیک کرتے ہوئے بولی۔
 "چلو ٹھیک ہے فوادہ دیر نہیں لگائیں گے تو آیا ہوں۔" وہ لگے ہی بل ہونے کی پارکنگ میں گاڑی روک کر کھڑی ہوئی۔ ثانیہ کا دل یکبارگی تیز تیز

دھڑکنے لگا۔
 اس کا پی چاہتا تو ذہنی اسے کے واپس چلو اور اس کی ناراضی کی بھی پروا نہ کرے۔
 "تو نا کھڑی کیوں ہو؟" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔
 "دونوں ہوٹل کے استقبال تک آئیں۔"
 "اندروہ کو نے والی ٹیکس کاس سے اس سے کہا تھا" تم مل لو جا کر بس تھوڑی دیر بعد میں آ جاؤ گی۔" وہ اسے گفت پیک تھا کہ آگے کرتے ہوئے بولی۔ ثانیہ نے لاچارگی سے اس کی طرف دیکھا۔
 "پلیز۔" ذہنی بھی لیجے میں بولی۔
 تو ثانیہ گرا سانس لے کر اندر کی طرف چل پڑی۔
 ذہنی نے مسکرا کر اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ملائے لگی۔
 پھر جانے کیا ہوا بالکل اچانک اس نے فیصلہ کر لیا۔
 وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا مگر ٹھیک آج صبح سے پہلے وہ اسٹور کو اپنے اسٹنٹ کے حوالے کر کے لا کر کو تالے لگا کر باہر نکل پڑا۔ چند دن پہلے منور نے خریدی تھی مونیٹنگ اس ضرورت کے وقت کام آئی وہ بغیر سوچے مجھے اس جانب چل پڑا جس ہوٹل کا ایڈریس ذہنی نے بتایا تھا۔
 "آکر پارکم از کم اس دوزخ سے تو مجھے نکالتا جا ہے۔" اس کا دل ایک ہی بات کی تل پر تیز تیز دھڑکنے جا رہا تھا اور ایک سیار پر اس کا دباؤ دھست جا رہا تھا۔
 اس کی تمام تر حسیات جلد سے جلد انہیں اس ناکام محبت کا انجام جان لینا چاہتی تھیں جسے جانتے ہی جانتے بھی وہ ناکام ہائے کو تیار نہیں تھیں۔
 "محبت کبھی ناکام ہوتی بھی نہیں یہ تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ٹھیک یا کالیالی کا اس سے کیا تعلق یہ نہیں میں جتنا کھڑا تو نہیں بنے لانا جیتنا یا ہرنا ہے یہ تو محبت ہے جس کے نصیب میں لکھ دی جائے۔"
 وہ اب مزید کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا کہ ثانیہ اس سے کیا کہنی ناراض ہوتی یا خوش اسے اس بات کی

بھی پروا نہیں تھی۔ اس وقت تو ایک ہی بات کا شدت سے انتظار تھا کہ اگر وہاں پہنچے اور ایک بار چاہے آخری بار کسی اسد کچھ تو لے اور اس نے اسد کچھ لیا۔
 جیسے نظروں کی صدیوں کی پیاس بھی تھی وہ ہوٹل کی انٹریس سے اندر داخل ہو رہی تھی۔
 "ہی! میں نے کہا نا آپ سے مجھے شادی والوی نہیں کرنی تو پھر کیوں اس لاچارگی میں خود کو جتلا کیے ہوئے ہیں۔" ہنسہ ایک دم سے ہاتھ میں پکڑنے برتن سنگ میں پھینک کر بولی۔
 ذکیہ نے تو اس سے یہی کہا تھا کہ وہ آج رو جیل کی طرف جانے کی اور ہمسہ کو یہ سنتے ہی جیسے پتنگ لگ گئے تھے بھر کو تو ذکیہ بھی ششدر رہ گئی۔
 "مگر ہمسہ! میں نے تمہاری شادی کا ذکر کب کیا۔" بہت دیر بعد وہ نرمی سے بولیں تو ہمسہ کو بھی اپنے اتنی شدت سے بچت رہنے والے رد عمل سے بہت کچھ متحیر ہو جانے کا احساس ہوا۔ وہ خاموش ہی تو رہ گئی۔ جانے اس نے تصور میں تھی ہزار بار یہ سوچ لیا تھا کہ مجسم دیکھ بھی لیا تھا کہ وہ رو جیل کی ہوئے جا رہی ہے۔
 اور جب بھی ذکیہ اس کی شادی کا ذکر کرتی تو ہمسہ کو لگتا وہ جھولی پھیلا کر رو جیل سے اس کے لیے بھیک مانگ رہی ہے۔ بھیک میں باغی محبت اور رشتہ دونوں ہی کتنے کسے کسے ہوتے ہیں انکھیں نہ ہوتے ہوئے بھی ہمسہ اس بات کو بہت گہرائی تک محسوس کرتی تھی۔
 "رو جیل کی طرف کیوں روز روز جاتی ہیں آپ؟" اپنے رد عمل کو باورزن کرنے کے لیے اس نے دھیمی آواز میں کہا۔
 "اس نے سود کی نوکری کے لیے کہا تھا کہ اسے اسٹور پر بھیج دوں کل لے کر گئی تو وہ ملا ہی نہیں۔ پر سون چھی سو جو نہیں تھا میں نے کہا ایک بار کھر جا کر

پھر سے اسے یاد دہانی کرنا اور پھر کافی دنوں سے اس نے اوپر کا چکر بھی نہیں لگایا۔" وہ کچھ دل گرفتہ سی رک رک کر بولی رہی تھیں۔ وہ خود کو رو جیل کی طرف جانا چاہتی تھیں۔
 نصرت کا لایا ہوا انداز اور اس میں چھپی بہت سی آن کھی طعنے باتیں جنہیں صرف ذکیہ کی حسیت محسوس کرتی تھیں مگر اس کے بلخود محض رو جیل سے ملنے کی خاطر وہ یہ سب دوبارہ سے سننے خود کو راضی کر لیتی تھیں۔
 "ان کے سر پر اب پورے گھر کی ذمہ داری ہے وہ کوئی قانع تھوڑی ہیں جو پہلے کی طرح بار بار اوپر چکر لگائیں ہی آپ کو بولیں۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی شاید وہ انہیں بار بار دہاں جانے سے تو لگنا چاہ رہی تھی۔ "پھر سود اگر اسٹور پر جانے لگے گا تو اس کا برصالحی سے ہی اٹھ جائے گا انہی کچھ سال کم از کم میٹرک تک اسے سیکوئی سے پڑھنوں۔"
 اسے رو جیل کی جانب سے کوئی بھی اس طرح کی ہمدردانہ فو نہیں چاہیے تھی بلکہ اس کا اپنا دل اس کے دل سے لگنے سے کتنا بے چین تھا اس کا انداز تو وہ خود سے بھی نہیں کہتی تھی۔
 "بیٹا! تو کتنا راکس طرح ہو سب کچھ تمہارے سامنے تو ہے۔" ذکیہ لاچارگی سے بولیں۔
 "ہمارے پاس تھوڑے پیسے ہوتے تو اوپر والا کمرو ٹھک کر آ کر اسے کرے ر دے دیتے۔" ہمسہ برتن دھو کر ذکیہ کے پاس آئی تھی۔
 "پیسوں کا تو سارا دوتا ہے۔" ذکیہ آدھ بھر کر بولیں۔
 "ہی! جو میرا جینز ہے تھوڑا بہت برتن بستر اور سونے کی بلیاں وہ سچ کر اگر ہم اوپر کا۔" وہ ذرا دیر بعد جھج کر بولی۔
 "خیر ہمارے ہمسہ اس سے آگے ایک لفظ نہیں بولنا۔" وہ فوراً ٹپٹ کر بولیں۔
 "کیا کریں گی ان فضول چیزوں کو چینی میں رکھ رکھ کر؟" وہ کڑھ کر بولی۔
 "یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" ذکیہ جڑے ہوئے

انداز میں کہہ کر انھیں اور اپنی سلائی مشین کے سامنے بیٹھ گئیں۔
 "کیا تھا یوسف کی زندگی کے چند سال اور ہوتے؟
 تھوڑا سا سو لپٹے بیویوں پر کھڑے ہونے کے قابل تو
 ہوتا یا تیرا ہی نہیں؟" وہ مشین چلاتے ہوئے حسرت
 بھرے لہجے میں آہستگی سے بولیں۔
 "جو بات ہو نہیں سکتی ابی اس کے بارے میں
 کیوں اتنا سوچتی ہیں۔ بھائی کی زندگی اتنی بھی انہیں تو
 جانتی تھا۔" وہ راستہ ٹھٹھل کر ذکیہ کیسپاس ہی آئینچی۔
 ذکیہ کا ایک دم سے دل بھر گیا۔
 "کیا بھری جوتلی تھی؟ کیا شیر جوان تھا میرا بیٹا اور
 کیا احساس والا باپ کے گزرتے ہی کسی طرح اس
 نے سب کچھ سنبھالا اور پھر؟" وہ رونے لگیں۔
 "چپ کر جائیں نا" وہ ذکیہ کا کندھا چپک کر
 بولی۔
 "ابھی تو یہ دس منٹ گھر کے خرچ کے میری شادی
 کے" سو دیکر پڑھائی کے "میری جان کو بیٹے ہیں میں
 یوسف کو جان بوجھ کر نہیں سوچتی۔ سوچتی ہوں اگر
 فرصت میں بیٹھ کر اسے سوچنے لگوں ہمسہ تو شاید
 میرا دل ہی پھٹ جائے وہ سسکی لیتے ہوئے بولیں۔
 "جوان بیٹے کی موت کا لمحہ میں کیسے سہہ گئی یہ
 تو کوئی بھی نہیں جان سکتا سوائے اس کے جس پر یقینی
 ہو۔"
 "دع اللہ! کل نہیں برسوں" رو حیل آئے
 تھے "اب جب سیکڑ خالہ کی طرف پکڑے دیتے تھی
 تھیں۔" ذکیہ کا و حیان ہٹانے کو زور اور بعد ہمسہ بولی
 تو ذکیہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔
 "اور تم نے مجھے بتایا نہیں۔"
 "تپ نہ ناراض ہونا تھا۔" وہ آہستگی سے بولی۔
 "کیوں ناراض ہوتی میں۔ رو حیل کے آنے پر
 بھلا۔"
 "میں میں نے ان کو منع کر دیا تھا۔"
 "میں بات سے" میں نے آنے سے تم نے روکا
 اسے؟" وہ چیخا کر بولیں۔

"اس بات سے بھی" اور "سو دیکر اسٹور پر کام
 کرنے سے بھی۔" وہ رک رک کر بولی۔
 "بس۔" ذکیہ مارے صدمے کے کچھ کہہ ہی نہ
 سکیں۔
 "اماں! اچھا نہیں لگتا ہم اپنے مسائل کے حل
 کے لیے دوسروں کے کندھے سہاروں کے لیے
 تھا میں کب تک دوسرے ہمارا سہارا بنیں گے ہمیں
 خود سے اپنا سہارا بنانا چاہیے نہ کہ۔"
 "اور سو دیکر کام ہی کرنا خیرات تو نہ لیتا سیکھ ہی
 لیتا کچھ پڑھتے تھیں تھیں۔ ہاں میں کی تعلیمیں
 کیوں کم ہوں؟ وہ اسی طرح تم کو کوئی کی روٹی کے لیے
 دن رات مشقت کی چٹل میں پستی رہے لوگوں کے سو
 سو روپے کے پکڑے سینے کے لیے فقیر بنی رہے اور
 تیرے سینے میں ٹھنڈ پڑے تو جو اتنا بڑا ہمارا میرے اوپر
 دھرا ہے میرے سارے مسئلے حل ہو بھی جائیں تو۔
 تو ہمسہ! میں کیا کروں کہاں جاؤں اس یوسف کی
 طرح جا کر منوں مٹی تلے سو جاؤں تو نہیں جین آئے
 گا تاہم وہ۔" ذکیہ ایک دم سے چپک چپک کر رونے
 لگیں اور ہمسہ سر ہٹائے ان بیویوں میں سے چھٹی ہوئی
 انہی بات سوچنے کی کوشش کرتی رہی تھی پھر کردہ
 ذکیہ کو چپ کر اس کے گریست و رنج کی لاج حاصل کوشش
 کے پلو جو بھی اسے کچھ نہیں سوجھا تو وہ ہاتھوں سے
 زمین ٹٹاتی اٹھی اور پھر سے کچن میں جا کر بیٹھ گئی۔

254 جنوری 2011

سہارا بنے سوچ رہی تھی۔
 "تم خوش ہو نا بلال کے ساتھ؟" وہ رک کر بولی۔
 "کیوں نہیں کیسا لگا؟" جی تو اس کا چہلا کوئی ٹھیک
 تھا کہ سخت قسم کا جواب دے مگر پھر وہی طبیعت کی
 موت ٹٹا کر گئی۔
 "میں تمہارے منہ سے سنتا چاہتا ہوں۔" وہ بغور
 اسے دیکھ رہا تھا۔
 "رو حیل! تمہیں پتا ہے میں تم سے یہاں کیوں
 ملنے آئی ہوں۔" وہ جلد از جلد اس قفس سے بیکدوش
 ہونا چاہتی تھی جو روزی نے اس کے ذمے لگایا تھا۔
 "کیا مجھ سے ملنے کے لیے تمہیں کسی وجہ کی
 ضرورت ہے؟ بھول رہی ہو تم ہم دونوں گزن بھی ہیں
 کچھ رشتہ تو پہلے سے ہمارے درمیان موجود ہے پھر
 ملنے کے لیے کسی وجہ کا موجود ہونا کیوں ضروری
 ہے؟" وہ جاکر بولی۔
 "ہے ضروری تم جانتے ہو۔" وہ ناگواری سے
 بولی۔
 "کوئی بات نہیں سمجھا۔" وہ سر اٹھا کر بولی۔
 "میں تمہاری اور میری کلاس میں فرق جو آپکا
 ہے تمہارا انٹینس بہت بلند ہو چکا ہے جبکہ میں۔
 وہی رو حیل ہوں ایک معمول کے کار سا تمہارا رشتہ دار
 جسے جسے بھی تم سے۔ بلکہ نہیں ابھی بھی
 شدید محبت۔"
 "پلیز۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے
 پھٹ پڑنے کے انداز میں بول پڑی۔
 "جس طرح تمہیں حق ہے اپنی سوجھوں کے
 مطابق زندگی گزارنے کا کیا مجھے حق نہیں کہ میں جس
 کو پسند کرنا ہوں اس کا اظہار ہی کر سکوں۔" وہ جی
 سے بولا۔ "پلیز" کا فوری رد عمل اسے بہت کچھ سمجھا گیا
 تھا۔
 "پسند تو تمہیں بھی کوئی کرتا ہے اور اسی شدت اور
 گہرائی سے جس طرح تم شاید تم جانتے ہوں
 گے۔" اس نے فوری طور پر موضوع کو تبدیل کرنا
 چاہا۔

255 جنوری 2011

"مجھے صرف اس بات سے دلچسپی ہے کہ جسے میں
 پسند کرنا ہوں وہ مجھے پسند کرے اس کے علاوہ کون
 مجھے پسند کرتا ہے یا نا پسند مجھے روا نہیں اور نہ جاننے
 کی ضرورت۔" وہ تیز تیز بولنا چلا گیا۔
 "جبکہ تم جانتے ہو رو حیل! تم ایسے تو نہ تھے
 تمہیں اتنی خود غرضی سے سوچتے ہوئے میرے بارے
 میں کیا خیال نہیں آیا کہ میں تمہاری ان پچکانہ سوتیلوں
 بلکہ حرکتوں کی وجہ سے کسی بڑی مشکل میں پڑ سکتی
 ہوں۔" وہ دھوکہ سے بولی۔
 "پچکانہ۔" وہ حیرانی سے بولا۔ "تمہارے نزدیک
 میری محبت پچکانہ ہے؟"
 "میں نے یہ نہیں کہا۔" وہ آخری حد تک اس کا
 بلکہ کسی کا بھی دل توڑنے سے گریز کرنا چاہتی تھی۔
 "مجھے تمہارا ہی تو خیال ہے" اس لیے یہاں آیا
 ہوں۔" زور اور بعد وہ رک بولی۔
 "میرے لیے۔ یا۔ کسی اور کے لیے۔" وہ جاکر
 بولی۔
 "تمہارے علاوہ کوئی اور ہے ہی نہیں جس کے
 لیے میں کچھ بھی سوچے بغیر کہیں بھی چل پڑوں یہ تو
 صرف تمہارے لیے۔"
 "پلیز رو حیل! اب اس بات کو ختم کرو۔" وہ ایک
 دم بے زار ہو کر بولی۔
 "میں اس بات کو؟" رو حیل قطعاً نہیں سمجھا۔
 "تم جانتے ہو میری شادی ہو چکی ہے۔" وہ زور
 دے کر بولی۔
 "ہو کہ اب ٹوٹنے والی ہے۔"
 "رو حیل!" وہ اتنے زور سے چیخی کہ ارد گرد آکاؤ کا
 فیلڈ پر بیٹھے لوگ بری طرح سے چونکے۔
 "میرا خیال ہے میں نے یہاں اگر غلطی کی۔" وہ
 لب بھج کر بولی۔ رو حیل خاموش سے دھکا دے گیا۔
 "کیا تم ابھی بھی بلال سے۔" وہ جیسے ٹوٹ سا گیا
 اسی ٹوٹے ہوئے بارے ہوئے لہجے میں بولا۔
 "ابھی بھی بلال سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ
 تنک کر بولی۔ "میں تو پہلے دن سے۔ تمہیں یہ بات

255 جنوری 2011

کیوں سمجھ نہیں آتی۔" وہ شاید اس پر ترس کھا کر لہجے میں نرمی بھر کر بولی۔

"کچھ چیزیں کچھ لوگ ہمارے مقدر میں نہیں ہوتے۔ اور جو چیز مقدر میں نہ ہو روٹیل کو ہمارے جذباتوں کی شدتوں سے بھی ہماری نہیں ہو سکتیں تقدیر کا فیصلہ اسل ہوتا ہے۔" وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"اور مجھے یہی کھیل تو سمجھ میں نہیں آتا جو تقدیر میرے ساتھ کھیل رہی ہے۔ وہ سرجھاکر شکست خوردگی سے بولا۔

"سمجھ تو پیلے مجھے بھی یہ سب نہیں آیا تھا اور بہت مشکل ہوتا ہے تقدیر کے فیصلے صلو ہو جھکنے کے بعد ان پر راضی ہو جانا۔" وہ گہرا سانس لے کر آہستگی سے بولی۔

"تم بھی" روٹیل اس کی آنکھوں میں دیکھ کر خاموشی کی زبان میں بولا۔

"بہت مشکل سے یہ سارے مرحلے طے کر کے آئی ہوں۔" وہ ان لمحوں کی لذت نگاہوں میں بھر کر بولی۔

"تقدیر پر راضی ہونا اسل سے اس کے فیصلے کو مان جانا زندہ رہنے سے بھی مشکل ہے مگر پھر ہولے ہولے مجھے سمجھ آئی کہ اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو اپنی قسمت کے فیصلے کو دل سے قبول کرنا ہوگا۔" وہ شاید خود کو سمجھا رہی تھی یا روٹیل کو مگر انداز سراسر خود کلامی بولا تھا۔

"کیا تم پیلل کے ساتھ خوش نہیں تھیں؟"

"پتا نہیں خوش ہونا کسے کہتے ہیں شاید میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ زندگی میں اس اچانک ہٹنے والی والی خوشی کو اپنی قسمت کا سب سے بڑا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیتی مگر میں۔"

وہ یہ سب روٹیل سے کیوں شیئر کر رہی تھی اس سے تو وہ اور بھی شہپائے گا۔ "نہیں نہیں۔" وہ اگھے ہی لہجے میں بولی۔

"تو میرا سے تم کب ملے؟" وہ لمحہ بھر رک کر بولی۔

اور روٹیل اس اچانک سوال کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔

"ہاں بس۔" وہ کوئی مقول جواب نہیں دے پایا۔

"تم جانتے ہو وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔" ثانیہ اس کے تاثرات دیکھنے کو سر اترنگ لہجے میں بولی۔

"پیلل نے تم سے کیا کہا ہے؟" روٹیل کا سوال بھی ثانیہ کے لیے بالکل اچانک تھا۔

"کیا یہی مطلب؟" وہ چونکی۔

"وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے نہیں آیا بلکہ۔" وہ اس بات کو اپنے منہ سے کیسے ادا کرے جس کا پہلا دوا کر اسے پسند پایا گیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟" وہ اتنے پرہیزگار لہجے میں بولی۔

"معلوم ہے مجھے سب۔" وہ سرجھاکر آہستگی سے بولا۔

ثانیہ اس کے انداز سے لطف کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اسے کیا کچھ معلوم ہے۔

"بہر حال میں پسند اس لیے آئی تھی۔" وہ ذرا توقف سے اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"روٹیل! ہم دونوں ایسے دوست تھے جیسی اور کزن بھی۔ اسی لحاظ سے تم سے درخواست ہی کر سکتی ہوں۔"

"پلیز نہ مت کہو۔" وہ ترپ کر بولا۔

"روٹیل۔" اتم آئندہ مجھے کبھی فون نہیں کرے گا۔ نا بھی سراسر اٹھنے لگے بھی تو دیکھ کر روٹیل کے پاؤں گھمے بلکہ انہیں بن کر گزر جاؤ گے۔" وہ بہت مشکل سے ٹوک رک کر بولی۔ روٹیل چھری نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں پیلل کے ساتھ چند دنوں میں اپنی زندگی کا نیا اور خوشگوار سفر شروع کرنے جا رہی ہوں۔ امید ہے تم اس کے لیے میرے حق میں دعا ہی کرو گے اور کبھی نہیں چاہو گے کہ خدا انخواستہ میری ازدواجی زندگی تمہاری وجہ سے مشکل سے دو چار ہو۔ ہم میں دوستی رشتہ داری یا جو بھی جذبات تمہارے تھے میرے لیے

سب کچھ ختم ہو گیا۔ پلیز تم میری بات کو دل پر نہ لینا۔ اسے میری مجبوری سمجھ کر تم سمجھ رہے ہو نا۔"

وہ اس کی اتنی کڑی چپ ربات اور صوری چھوڑ کر بولی۔ وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔

"تو میرا شاید تمہارے لیے کچھ اچانک فیصلہ ہو رہا ہے۔" وہ اس کا بھی رشتہ طے ہو چکا ہے بلکہ اس کی خوشی اور مرضی سے۔ وہ بھی تم سے ملنے آئی ہے یا پھر ہے ابھی آئی ہے تم میری سب باتوں کو سن چکے ہو نا؟" وہ جانے اس سے کون سی یقین دہانی چاہتی تھی۔

"اور یہ۔" اس نے گفٹ بیک اس کی طرف سے بڑھایا۔

"یہ گفٹ ہے تمہارے لیے۔" وہ پھر سے بولی۔ وہ اسے دھنسا رہا۔

"کھول کر نہیں دیکھو گے ویسے یہ گفٹ ڈنیرانے دیا ہے تو بہتر ہے تم یہ گفٹ اس کے سامنے ہی کھولنا۔" وہ کمر کراٹھ کر جانے لگی۔

"ثانیہ! بیٹھو۔" وہ ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑ کر حکیمانہ انداز میں بولا۔ وہ اس کی اس جسارت پر ہنسنے لگی۔

"پلیز۔" اسے اپنی لٹھی کا احساس ہو تو فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ کر آہستگی سے بولا۔ وہ پھر سے بیٹھ گئی۔

روٹیل نے گفٹ بیک کھولنا شروع کر دیا۔ اندر سے ایک نکلی ڈبیہ نکلی تھی جو دونوں کے لیے حیران کن تھی۔

"تو میرا پہلے روٹیل کو کوئی جیواری کیوں گفٹ کرے گی۔" ثانیہ کے دماغ میں پہلا سوال یہ ہی ابھرا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ خود بھی الجھ سا گیا۔

"مجھے نہیں معلوم اس نے مجھے کیا دیا۔" وہ اس کے ہاتھ میں اسے بھی بلاتی ہوں۔" وہ پھر سے اٹھ کر جانے لگی۔

"ابھی صبر جاؤ ثانیہ! ایک منٹ۔" وہ زیادہ سے زیادہ لحاظ اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ وہ پھر لاپرواہ

ہو گئی۔ روٹیل وہ وہیں کھول چکا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک حیرانہ برسٹل تھا جس پر بڑے نمایاں انداز میں انگریزی حروف کے ساتھ روٹیل لکھا ہوا تھا۔

دونوں ششدر نگاہوں سے اس چند صلیا دینے والے کچھ کو دیکھنے رہ گئے۔

"یہ یہ میرے لیے۔" مگر کون؟" وہ تعجب سے ثانیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ وہ کندھے پر کھڑک کر رہ گئی۔

"شاید ایسے ہی خیر کن جذبات ہیں اس کے تمہارے لیے تو ان کے اظہار کے لیے اسے یہی بہترین طریقہ سمجھ میں آیا۔"

روٹیل اس برسٹل کو نکلی ہاتھ کر دیکھ رہا تھا۔

جب ثانیہ نے آہستگی سے کہا۔

"کیسے جذبات۔" ثانیہ! یہ کیا ہے سب؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"محبت۔ محبت کرتی ہے وہ تم سے۔" ثانیہ مدھم آواز میں بولی۔

"جسوت! ملا۔" مگر اس۔" اسے ایک دم سے غصہ آیا۔

وہ سرے سے دونوں بری طرح سے چونکا اٹھے۔ کوئی آہستگی سے ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

روٹیل کی آنکھوں کے نیچے وہی سنہری برسٹل لٹک رہا تھا۔

"ارے بیگم جلد! آپ فکر کیوں کرتی ہیں! ایسا کچھ بھی نہیں میرے بیٹے کو کبھی اور مجھے بھی مل جائے یہ رشتہ پسند ہے۔" وہ دھم دھم ساری طرف کی بات سننے لگیں۔

"تو آپ مجھے کوئی مثبت جواب کیوں نہیں دے رہیں بھائی جان بھی رات سے آگے ہیں اور وہ لوگ ایک حیران میں آپ کو انوائیٹ کرنے والے ہیں۔"

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں اصل میں زندگی کی رائے بھی ضروری تھی اور دوسرے۔" لخصیہ کچھ

سربراہ نے اس کے کالوں میں آنے لگی۔
 ”جی یہ اٹھائیں تاریخ کا آرڈر تھا اور آپ کے گھر سے آپ کی سسر نے لکھو لیا تھا۔“
 ”گور اسے پک کس نے کیا تھا۔“ اس کے پورے جسم کا خون کپشیدوں کی طرف حرکت کرنے لگا۔
 ”نویزا بغور بلال کے چہرے کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے تاثرات کو دیکھ رہی تھی، نتیجہ اس کے حسبِ منشا آنے ہی والا تھا۔“
 ”جی وہ خود تھیں اور آپ کی والدہ۔“ مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔
 ”جستِ شکر یہ آپ کو زحمت دی، خدا حافظ۔“ کہہ کر بلال نے فون بند کر دیا۔
 ”اب بھی آپ مجھ پر شک کریں گے؟“ اس کے فون بند کرنے پر نویزا نے جفا کر پوچھا۔
 اور بلال کچھ بول ہی نہیں سکا اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔
 ”وہ دونوں پہلے سے ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں، آپ کے جانے کے بعد وہ میرے اور ماما کے کالج جانے گئے بعد گھر سے جلی جاتی تھیں۔ شروع میں تو اسے گھر جاتی رہی، پھر جب میری چوڑی چوری ہوئی اور میرے ہنگامے پر اس نے اپنے کزن سے باہر ملاقاتیں شروع کر دیں۔“
 ”نویزا؟“ بلال جی کر بولا، جیسے اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ جائے گی۔
 ”آپ کے آنے کے بعد وہ دونوں میں صرف فون کا رابطہ تھا۔ شاید آپ کے سامنے وہ ہلت نہ کرتی ہو اور کل جب آپ نے جانے کا کہا اسلام آباد تو آپ اس کے ایک پیرشین تو دیکھ ہی چکے تھے اس لیے میں نے آپ کو روک لیا کہ آپ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس کلاس کی لڑکیوں کتنی قابلِ اعتبار ہوتی ہیں ان کو دنیا بھر کی آسائش اور دولت بھی دے دو پھر جی ان کے اندر کا گھٹیا پن ختم نہیں ہو سکتا۔“ وہ زہر بھرے لہجے میں پھر نکال رہی تھی۔
 ”تم تمہیں روک میں اندر جانا ہوں۔“ بلال اسے

جھٹکے پر بے ہنگامہ اندر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔
 اور نویزا اپنی زندگی کا یہ یادگار اور شاندار سینا بھلا کیوں مٹ ہو جائے دیتی۔
 بلال کے جاتے ہی لمحہ بھر بعد وہ بھی اس کے پیچھے ہوٹل میں داخل ہو گئی جبکہ اس کی پسند اور خواہش کے عین مطابق سین کری ایٹ ہوئے جا رہا تھا۔

 وہ دونوں بھونچکے سے بیٹھے رہ گئے۔ ان کے سامنے بلال کھڑا تھا اور اس کی پشت پر ذرا فاصلے پر لیوں گہری مسکن لے کر بیٹھا۔
 رو جیل کی انگلیوں میں ٹنگا وہ برہسٹ اور اس کے انتہائی قریب بیٹھی ٹانیہ کس قدر حمل منظر تھا۔
 اپنی جامعیت لیے ہوئے کہ شاید نویزا کے تجلیل نے بھی نہیں سوچا تھا۔ ”تو یہ تھا وہ خلیل جو تم دونوں عین میری ناک کے نیچے اتنے میٹروں سے کھیل رہے تھے۔“ وہ گمن گمن کر قدم اٹھاتا، عین ان دونوں کے سامنے آکر ابھولا۔
 ”بلال! بلال! آپ۔ آپ تو اسلام آباد۔“
 ٹانیہ کو پکڑ سائے گا تھا۔
 ”ابھی تم نے سوچا کہ میں اسلام آباد جا رہا ہوں تو تم اپنے اس سابقہ عاشق سے کھل کر ملاقات کر لو گے نا؟“ وہ چپا کر بولا۔ اور ٹانیہ کو لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔
 ”یہ۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ وہ پچھنی ہوئی آواز میں بولی۔
 ”تمہیں کیا سمجھا تھا میں تمہیں ساری دنیا سے لڑکر میں نے تم جیسی بے وقت ہے حیثیت لڑکی کو اپنا لیا۔ لیکن یہ میری بھول تھی، تم جیسی گھٹیا لڑکیوں سارے جہاں کا زور بھی ان کے قدموں میں ڈبو کر دیا جائے تو ان کی حرص اور گندگی ختم نہیں ہوتی، تم ان لڑکیوں میں سے ہو۔“
 اس کا لہجہ نہیں چل رہا تھا وہ ٹانیہ کا گھٹا گھونٹ ڈالے یا اس کو قفل کر کے اس کے گلے سے گلے کر

”بس کریں خدا کے لیے بس کریں“ اپنی گندگی اپنی لذت ہے آپ کے دل میں میرے لیے آپ لیا کچھ ہنس بچھے۔ ”اب خاموش رہنا اپنی موت کو گواہ نہ لیا تھا اب اگر وہ کچھ نہ بولی تو ساری زندگی روئے گی۔ اس نے چل گیا تھا۔“
 ”گندگی میرے دل میں نہیں، تمہارے اندر ہے۔“
 ”اے آپ ایک گندے سڑکے لڑکی سی، تمہیں شرم کئی نہ غیرت کہ تم کیا کرنے جا رہی ہو؟ اس دو کوڑی کی حیثیت والے لڑکے کے ساتھ تم خلیا میں بیٹھ رہے ملات کزارتے کس طرح اپنے شوہر کی عزت اور غیرت کی دھجیاں اڑا رہی ہو تم تو گواہ نک سے بھی اپنی گندگی لگی وہ تو یہ سب کچھ دکھا کر کرتی۔“
 ”بس کریں بلال! خدا کے لیے بس۔“
 ”یہ۔ یہ ختم دینا تھا تم نے اپنے یار کو۔“ اس نے ایک دم سے رو جیل کے ہاتھ سے برہسٹ پھینک کر ٹانیہ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور ساتھ ہی رو جیل کو زور سے برسے دو کا دیا۔
 ”گور کیا شہیت چاہیے تمہیں اپنی بے غیرتی اور بے حیائی کا؟“
 ”یہ میں نے نہیں زور دیا۔“ وہ زور سے سے جھنجکی۔
 ”تمہاری زبان گدڑی سے کھینچ لوں گا اگر تم نے میری بہن کا نام بھی اپنی اس گندھی زبان پر لیا تو۔“ وہ اس کا گاد دیا نے کو لڑکا۔
 ”نہ خدا۔“ تم بولتی کیوں نہیں بتاتی کیوں نہیں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم رو جیل سے محبت کرتی تھیں تم نے۔“ وہ گاپا کر چلی۔
 ”ہمیں۔ میں اس دو ٹکے کے معمولی شکل کے لڑکے سے محبت کروں گی، تمہارا دل تو نہیں چل گیا“ اس جیسے گھیلوں سڑکوں میں رلتے بے حیثیت بے لوقت لڑکے جن پر میں تھوکانا بھی پسند نہیں کروں گی، کجا محبت کروں گی کیا مجھے اتنا کراہا ہوا سمجھ لیا تم نے اپنے جیسا ہیں۔ تمہیں آئیے میں دی نظر آئے گا جو

”تم خود ہو۔“
 ”نویزا کے لیے میں اتنی نفرت اتنی جھارت تھی کہ جانیہ ششدر سی اسے دیکھتی رہ گئی، کچھ بول ہی نہ سکی۔“
 ”اب اگر میں تم جیسی عورت کو اپنے نکاح میں رکھوں گا تو مجھ سے زیادہ بے غیرت اور بے حیا انسان اور کوئی نہیں ہوگا۔“ بلال نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
 ”آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ آپ پہلے ہماری پوری بات تو نہیں لیں۔“ ٹانیہ کے چہرے کا رنگ ہندی کی طرح ہو رہا تھا اور جسم بید کی چھڑی کی طرح کھپ رہا تھا۔ رو جیل اسے دیکھ کر آگے بڑھا۔
 ”تم۔ تم۔“ بلال گالیاں دیتے اس کا گریبان کھینچے ہوئے اسے زور زور سے جھٹک رہے تھے۔
 ”بلال! ٹانیہ نے اسے پیچھے سے کھینچ لیا۔
 ”حق۔ تم گندھی عورت! تم مجھے چھوئے کا حق بھی نہیں رکھتیں۔ تمہیں میں مطلق۔“
 اور ٹانیہ کو لگا اب کچھ ایک لحظے میں کسی خوف ناک ڈرے کی وہیں اگر کس قسم ہو کر رہ گیا ہے۔
 (اب شاء اللہ اعلیٰ قسط آئندہ ملے)

ادارہ خواتین و انجمن کی طرف سے بہنوں کے لیے
 فائرو اتھار کے 4 خوبصورت ٹائول

آئینوں کا شہر	قیمت 500/- روپے
بھول بھلیاں تیری گلیاں	قیمت 500/- روپے
یہ گلیاں یہ نہ بارے	قیمت 300/- روپے
تھلاں دے رنگ ہزار	قیمت 250/- روپے

مدل دکھانے کے لیے کتاب ڈاک خرچ 45/- روپے

کتاب مرثیہ المصنف 37 - 38 - 39 - 40 - 41 - 42 - 43 - 44 - 45 - 46 - 47 - 48 - 49 - 50 - 51 - 52 - 53 - 54 - 55 - 56 - 57 - 58 - 59 - 60 - 61 - 62 - 63 - 64 - 65 - 66 - 67 - 68 - 69 - 70 - 71 - 72 - 73 - 74 - 75 - 76 - 77 - 78 - 79 - 80 - 81 - 82 - 83 - 84 - 85 - 86 - 87 - 88 - 89 - 90 - 91 - 92 - 93 - 94 - 95 - 96 - 97 - 98 - 99 - 100



میں ہر اک موڑ پر دکھ سے لڑی تھی
تین کھلتے نہ تھے، نیندا آتی نہ تھی، رات آہستہ آہستہ دھنی ہی
عجبت کس قدر مہنگی پڑی تھی
سارے اوراق غم منتر ہو گئے، دیر تک دل میں آدھی سی پلتی رہی

وہ مجھ سے جس جگہ رخصت ہوا تھا
گھاس مٹی جگہوں کو چھانے ہوئے، پیڑ پتے ترنگل میں جھلنے ہوئے
میری جوڑی وہیں ٹوٹی پڑی تھی
ایک کمرے میں سر کو جھکانے ہوئے، درد کی شمع افسردہ جلتی رہی

پلٹ کر دیکھ تو لیتا مجھے وہ
پہلا دن تھا عجبت کی برسات کا، وقت بھر تھا تجھ سے ملاقات کا
میں صد لپٹ تک وہیں سہمی کھڑی تھی
قطرہ قطرہ گزرتی رہیں ساعتیں، سائے لیٹے رہے، دھوپ پلتی رہی

میرا بس جرم تھا اتنا عکاشہ
دن بجلی مرست کے بستے تھے ہم، ایک ہی قریہ ہاں میں رہتے تھے ہم
میں اس کی سوچ کے قد سے بڑی تھی
دن ڈھلے یا کسی صبح کے موڑ پر، اپنے ملنے کی صورت نکلتی رہی

عکاشہ حوایمان
ایک دنوں سے بچھری ہوئی رات میں ہم اکیلے تھے خواب ملاقات میں
دونوں ایک دوسرے کی طرف چل پڑے، خواب گھنٹا ہا، رات دھنی ہی

نہ ہوا نصیب قرار ہاں، ہوں قرار بھی اب نہیں
ترا انتظار بہت کیا، ترا انتظار بھی اب نہیں

تجھے کیا خبر مر وصال نے ہمیں کیسے غم دیے یہاں
تری یاد گار مٹی اک غمش، تری یاد گار بھی اب نہیں

نہ گئے رہے نہ گماں رہے، نہ گزشتیں ہیں نہ گفتگو
وہ نشاط و وعدہ وصل کیا، ہمیں اعتبار بھی اب نہیں

کے نذر دیں دل وہاں بہم کہ نہیں وہ کائناتِ غم، غم
کے ہر نفس کا سلب دیں کہ شمیم، یار بھی اب نہیں

وہ، جو دم دل زدگیاں کرتا تھا، تجھے مر وہ ہو کر بھر گیا
ترے آستنے کی خیر ہو، سرورہ غبار بھی اب نہیں

وہ جو اپنی جاں سے گزر گئے، انہیں کیا خبر ہے کہ شہر ہیں
کسی جاں نثار کا ذکر کیا، کوئی سو گوار بھی اب نہیں

ہمیں اب تو اہل جنوں میں ہی وہ چوتھن شہر میں جاگتا
وہ جو رنگ تھا کہی کو، کو سر کوئے یار بھی اب نہیں

جون ایلیا

گہرے پانی کا دکھ

گہرا پانی ...

اور گہرے پانی کا دکھ
ڈوبتی کشتی ...

اور ڈوبتی کشتی کا سپا سہا دل
دریا میں طغیانی

لبر لبر حیرانی
خواب میں بہتا دہشت کا سیلاب

یوں ہو گماں
ڈوب چلے سب خواب

چھا گئی غم کی رات
کس سے کہیں اب

دل کی آخری بات
تھام لو میرا ہاتھ

کوئی نہیں ہے
کوئی نہیں جو سنے لے

گہرے پانی کا دکھ
کشتی کی ڈوبتی دھڑکن

اور تھام لے میرا ہاتھ
زاہد امروہ

حمایت

ڈاکٹر: (مریض ہے) تم اب میرے پاس آئے ہو۔
 اسے پہلے بتائیں کہ ڈاکٹر کو دکھایا ہوگا؟
 مریض: جی نہیں میں تو ایک کیمسٹ کے پاس
 گیا تھا۔
 ڈاکٹر: کھلی جہالت ہے کیمسٹ ڈاکٹر تو نہیں ہوتا
 کہ علاج کر سکے۔ مجھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خیر تاؤ
 اس نے تمہیں کیا احمقانہ مشورہ دیا؟
 مریض: جی اس احمق نے مجھے آپ کے پاس بھیج
 دیا ہے۔

غور! اقرا۔ کراچی

بجائ فرمایا

رہن میں ایک عورت اپنے گھر کو سامنے جا رہی
 تھی اس نے گاڑی سے کہا۔
 "میں نے اس کا ٹکٹ بھی خریدا ہے۔ لہذا اسے بھی
 دوسرے سائزوں کی طرح سیٹ پر بیٹھنے کا حق ہے۔"
 "آپ نے بجائ فرمایا؟ گاڑی بولا۔ "مگر دوسرے
 سائزوں کی طرح اسے بھی سیٹ پر پاؤں رکھنے کی
 اجازت نہیں دی جائے گی۔"
 نندا۔ فقہ۔ فیصل آباد

گدھا

ملک ملازم کو ڈانٹتے ہوئے: تم یہ کام کیوں
 نہیں کر سکتے؟
 ملازم: مالک! میں نے پوری کوشش کی تھی۔
 مالک: غائب پوری کوشش کی تھی۔ اگر مجھے
 معلوم ہوتا کہ میں ایک گدھے کو اس کام کے لیے بھیج

رہا ہوں تو میں خود چلا جاتا۔
 مندا ناصر۔ کراچی

شادی کا کھانا

ایک آدمی اپنے گدھے کو ہسٹلار ہاتھ دیکھ
 کر دوست نے پوچھا۔
 "کیا ہو رہا ہے؟"
 آدمی: آج میرے گدھے کی شادی ہے۔ اس لیے
 ہسٹلار ہا ہوں۔
 دوست: تو اس خوشی میں ہمیں کیا کھلاؤ گے؟
 آدمی: دو دو لہا کھلے گا۔ تم بھی کھا لینا۔
 آسمان۔ کراچی

ثبوت

بیوی نے مانتے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
 "میری توقیر ہی پھوٹ گئی تم سے شادی کے،
 کیسے کیسے قابل امداد ہیں (کہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے
 تھے۔"
 "اس میں کھ شک نہیں کہ وہ قابل امداد ہیں مگر؟
 شوہر نے دانش بستے ہوئے کہا: "اودھ تم سے شادی نہ
 کرے گا تب تو اپنی قابلیت کا ثبوت بھی دے
 دیا تھا۔"

سین۔ کراچی

احساس کسری

نئے نئے دولت مند ہونے والے ایک صاحب کی
 بیگم ایک سرجن کے پاس بیٹھیں اور بولیں۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا آپریشن کرو دیجیے۔"
 "مگر کس چیز کا آپریشن؟" سرجن نے حیران

ہو کر پوچھا۔
 "میں بھی چیز کا!" خاتون نے لاپرواہی سے کہا۔
 "اور اصل میں اس کی مرضی کے سلسلے میں آپریشن نہیں ہوا۔
 اس کی وجہ سے مجھے بیماریا کے درمیان بیٹھ کر بات چیت
 کرنے میں مشکل پیش آتی ہے اور احساس کمتری
 ہونے لگتا ہے۔"

کرن۔ بیش۔ شیخ پورہ

اعتراف

ایک بد مزاج شخص نے قدم سے عذرت خواہانہ لہجے
 میں اپنے ماتحت سے کہا۔
 "عامہ ماہ! میں ایک بلادمجہس ڈائنار ہوں
 مگر جواب میں تم بہت مسکرا کر عذرت کرتے ہو یا اپنی
 کوئی ایسی عقلی ٹھکر لیتے ہو جو دراصل تمہاری نہیں ہوتی
 آج تمہارا ہاتھ ٹھکر لے رہا ہوں۔ ہو گیا ہوں کہ مجھے ایسا فرقہ
 پسند آنا چاہیے۔"
 "یاس کی بات! میں کہ عامہ میاں کا چہرہ کھل گیا تھا اور
 وہ ہلکی سے ہلے۔
 "سر! میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ جن سلوک
 سے کہنے سے کینا انسان بھی گوم ہو جاتا ہے۔ واقعی انہوں
 نے سچ کہا تھا۔"
 صائمہ بی۔ کراچی

سوال جواباً

"میں لڑچکی غالب ہوں۔ تقریباً انیس سال عمر
 ہے اور مجھے مناسب لادری، ترجیف اور کیلنگ کی
 ضرورت ہے اور دلکش تحریروں سے اس قدر اوقات ہے
 کہ بیان میں کر سکتی کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کہیں یہ حضرات
 شادی شدہ تو نہیں؟"
 "یہ حضرات شادی شدہ ہی نہیں بلکہ فوت شدہ
 بھی ہیں۔"

"اتفاق سے میں کافی بیماری بھر کر ہوں۔ وندش اود

ڈائننگ کے علاوہ جنہیں میں جینفری نوکٹیں سمجھا ہوں
 بہتر ہے جس کے لیے لیسن کوئی فرق نہیں پڑا۔ ابھی ابھی
 نے بتایا ہے کہ بار بار مالش کر لے سے وزن کم ہو جاتا
 ہے، کیا صحیح ہے؟"
 "و بالکل صحیح ہے" اس سے واقعی وزن کم ہو جاتا
 ہے مگر مالش کرنے والے کا۔"

"میرے خیال میں مغربی لباس کا سب سے تکلف
 جزو ثانی ہے۔ یہ قطعاً فضول معلوم ہوتی ہے۔ ادھر
 ہم ہیں کہ سب کے سب ثانی کے شوقین ہیں۔ ایسا کیلا
 ہے؟ کیا آپ ثانی کا ایک بھی نمونہ بتا سکتے ہیں؟"
 "و ثانی کا سب سے بڑا نمونہ یہ ہے کہ اسے اتار دے
 وقت بڑی فرحت محسوس ہوتی ہے۔"

"میری شادی کو کچھ برس ہو چکے ہیں۔ ویسے سب
 خیریت ہے لیکن رستے داروں پر اب تک بحث
 ہوتی ہے۔ بیوی بار بار یہی گویا کرتی ہے کہ آپ اپنے
 عزیزوں کو میرے رشتے داروں پر ترجیح دیتے ہیں۔
 ملا کہ یہی شکایت مجھے بیوی سے رہتی ہے۔ دیکھو
 دل لاشاد ایک دوسرے کی ماس پر تو لہجے بناتے
 کہ کیا کیا جاتے؟"
 "اگر آپ بیک وقتین دلا دیں کہ اپنی ماس کے مقابلے
 میں آپ کو ان کی ماس زیادہ عزیز ہے تو پھر انہیں
 کوئی کچھ نہیں رہے گا۔"
 (استفسارات و جوابات۔ از شفیق الرحمن)
 نازش ریحماں۔ گلشن جمال

نئی شادی

نیا شادی شدہ جوڑا گھر سے پھرے سال مسند
 پر گیا شوہر نے سال پر کھڑے ہو کر مسند کی طرف دیکھتے
 ہوئے افسانوی اور خواب انگ انداز میں کہا۔
 "لہو۔ آتی رہو۔ آتی رہو۔ آتی رہو۔ آتی رہو۔"
 نئی دہلی نے شوہر کے بازو سے گتے ہوئے جذبات
 سے پوچھ لیا۔
 "ہائے اللہ سرتاج! آپ کتنے کمال کے انسان

دین

جنوری 2011ء کے شمارے کی ایک منتخب

- سالانہ معروف شخصیات کا ایک دلچسپ سروے
- "نورنگر" و "سرم بادامی" سے شاہین شاہ مکی کا مصافحہ
- اداکارہ فضیلہ فیصلہ "دکے کے پائے" کے ساتھ
- اداکارہ کبیر "قاروق حسن" شان کے گمر کی ہانچی
- "ہولی" کے لیے آزاد ہیں تقریریں "قاریوں کے لیے دلچسپ سلسلہ"
- "اردو دہل" فیملیہ عزیز کا سلسلہ اداکار
- "دست کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا دلچسپ سلسلہ اداکار
- "کادیں" فیملیہ عزیز کا دلچسپ سلسلہ اداکار
- "سبیل آتش" سعیدہ واجہوت کا سلسلہ اداکار
- "فوجی افسانہ" کا دلچسپ سلسلہ اداکار
- "کشمیری لاکھی واری" سائیدہ صافقہ کا دہل اداکار
- "مراٹھ میں"
- "مکوشہ عاقبت" شگفتہ بھٹی کا دلچسپ سلسلہ اداکار
- "تاری کول بازی" آصف حسین کا سلسلہ اداکار
- "سبیلہ عالم" جریہ جمال، سولہ علی، شمس اور مرزا شکیل راز کے
- "المانے اور مشتعل دلچسپ سلسلہ"

ان شخصیات کے ساتھ گزشتہ

کرن کرپ "آپ کے ستارے"

• ہمارے آئینے میں زیادہ خوبصورت ہوا ہے
• ہمارے آئینے میں کی گند آئینے پر آکر لگی اور
• ہمارے آئینے میں کی گند آئینے پر آکر لگی اور
• ہمارے آئینے میں کی گند آئینے پر آکر لگی اور

نشان

ایک تو بہت سے ایک مشہور مصنف کا تعارف
ایک قانون سے گزرا گیا۔ وہ بولیں۔
"ارے ہاں آپ تو بہت مشہور آدمی ہیں مجھے آپ
کے سب ناول پسند ہیں۔ خاص طور پر وہ ناول تو بہت
ہی اچھا تھا۔ کیا نام تھا اس کا۔ یاد نہیں آ رہا۔ کس نے
بھی یاد نہیں آ رہی۔ بہت اچھا ناول تھا۔ کس نے
یاد نہیں آ رہا۔ ارے یہی وہی ناول جس کے نام میں
لڑکی سے ہانچی لکھی تھی۔ میں بھی اس کا ناول
ڈاؤن لوڈ کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور پٹنہ

شکر ہے

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے فضل و کرم
اور شکر ہے کہ ایک سال میں میں نے گزشتہ
نے روک لیا۔ اور بار بار گزشتہ میں آکر دیکھا اور ان
کی جیسوں کا بھی غصہ کر دیا۔ لیکن مجھے تو شکر ہے
کے گزشتہ کو تو شکر ہے کہ۔
"شکر ہے ان ظالموں کی نظر میری بلٹ میں ہے
ہوئے رولڈ پر نہیں پڑی۔ اگر وہ رولڈ دیکھ لیتے تو ہم
دونوں کو تار سے ہی رولڈ سے ختم کر دیتے۔
اس پر تو شکر ہے کہ بہت غصہ آ رہا اور بولا۔
"جب تیرے پاس رولڈ تھا تو تو نے ان کو گولیاں
کیوں نہیں ماریں؟"
"ارے یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ سوائے انہیں
دھڑکتے ہیں۔"

کی دم کاٹ دیتا ہوں۔
چنانچہ انہوں نے گھوڑے کی دم کاٹ دی۔
آٹے تو دوسرے گھوڑے کی دم بھی لٹی ہوئی تھی۔
پہلے دوست نے کہا: "اب کیا کریں؟"
دوسرا دوست: "میں اپنے گھوڑے کا ایک کان
کاٹ دیتا ہوں۔"
چنانچہ انہوں نے ایک گھوڑے کا کان کاٹ دیا۔
میں آٹھ گرجب انہوں نے دیکھا تو دوسرے گھوڑے
کا بھی ایک کان کاٹا ہوا تھا۔
دونوں بہت پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں۔ آخر
بہت سوچنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا۔
"چلو ایسا کرتے ہیں کہ گھوڑا تیرا دوسرا گھوڑا
میرا۔"
نازیہ اشفاق۔ لودھراں

طالب توجہ

سجاد صاحب کی خیرات و سخاوت کی بڑی شہرت
تھی۔ ایک روز ایک اجنبی ان کے پاس پہنچا اور گھر
آگئے ہیں بولا۔
"جناب سجاد صاحب! میں آپ کی توجہ ایک
انتہائی عزیز اور مصنف ذرا کے لیے کی طرف منڈول
کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامیاب و فلاح پانچواں
اس کی بیوی اور نوچنے انتہائی کمپری کی حالت میں
دن گزار رہے ہیں۔ چھ ماہ سے انہوں نے مکان کا کرایہ
بھی ادا نہیں کیا۔ اگر چار دن کے اندر خدا انہوں نے
کرایہ منڈو تو اس کو کڑا پیسہ ملیں گا۔ انہیں مکان سے
نکال دیا جائے گا۔ کرایہ کی رقم چھ ہزار روپے بنتی
ہے۔"
"بڑا افسوس ہوا یہ سب سن کر۔" سجاد صاحب بولا۔
"میں ضرور ان کی مدد کروں گا۔ ویسے بانی صاحب آپ
کون ہیں؟"
"میں بد قسمتی سے ان کا مالک مکان ہوں۔ اجنبی
نے جواب دیا۔
"سیدہ نسبت ذہرا۔ کبر و پکا
آئینہ
شرنگہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بولی۔

ہیں۔ لہذا میں بھی آپ کا کہا مانتی ہیں۔ کہے جا رہی
ہیں۔ کہے جا رہی ہیں۔

مزاحیات

کسی نے نہ کی جن کے میٹر کی ریڈنگ
تکلی میں ایسے مکان اور بھی ہیں
لفظ بلی جو بجلی کا آیا تو کیا غم
تعامات آء و تقاضا اور بھی ہیں
شہنشاہ۔ بزمان

بجلی

ایک رات بجلی علی گئی۔ سردار جی نے کہا۔
"مگر یہ کم تنگ تو ہوا۔"
"کر دی نا سرداروں والی بات۔ تنگ چلاؤں گی
تو دم بجلی بجھ جائے گی نا۔ سردار جی نے ناک چڑھا کر کہا۔
ماہ نور علی۔ کراچی

بات چیت

سیٹر صاحب سے ایک فلاحی تنظیم کے خاندان
چندہ مانگنے آئے تھے۔ سیٹر صاحب نے انہیں کامیابی
سیکرٹری کو بتایا۔
"میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔ تم کسی بدلے، انہیں
خال دو۔" سیکرٹری نے فون بند کر کے خاندانوں سے
کہا۔
"سوری۔ اس وقت سیٹر صاحب آپ سے نہیں
مل سکتے۔ ان کی کمر میں سخت درد ہے ادا انہوں نے
ڈاکٹر کو بلایا ہے۔"
"آپ سیٹر صاحب کو فون دے دیں کہ ہم ان سے
صرف بات چیت کر کے آتے تھے۔ کتنی بڑے ہیں۔"
ایک خاندان سے نرم لہجے میں کہا۔
شمینہ تاج، زبیرہ راجا۔ کراچی

عقل مندی

دودو دوستوں نے دو گھوڑے لیے۔
پہلا دوست: "اب میں پتا کیسے لگے گا کہ ہمارا
کون سا ہے اور میرا کون سا؟"
دوسرا دوست: "آپ سے کہتے ہیں میں اپنے گھوڑے





رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص اپنے وارث کو ترک دینے سے بھاگے گا (اپنی وصیت کرے گا جس سے جائز وارث کو حصہ نہ ملے گا) اس کے اصل حصے سے گھٹے (تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس کی جنت کی کپڑا سے عروم فرملا دے گا)۔"

حضرت ابو ہریرہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدھی ستر سال تک ایک لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے پھر جب (مرنے وقت) وصیت کرتا ہے تو وصیت میں انصاف کرتا ہے۔ اس طرح اس کا انجام بڑے کام پر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے اور ایک آدھی ستر سال تک بڑے لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے پھر (مرنے وقت) وصیت میں انصاف سے کام لیتا ہے تو اس طرح اس کا انجام ایک کام پر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔" (ابو ماجہ)

مہمان نوازی،

ایک دفعہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا: "کھانا لائے۔" آپ نے یہاں سے کھانا لیا اور آپ کو پیش کیا۔ آپ نے فرمایا: "پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے صحابہ کو) فرمایا: "اس آدمی کی کون سی بات تم سے زیادہ ہے؟" ایک انصافی نے کہا: "میں۔"

وہ (انصافی) اس آدمی کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ (ان دونوں پر صدمے کے احکام نہیں ہوں گے) انصافی صحابی نے اپنی بیوی سے کہا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان کی عزت و تکریم کرو۔"

وہ کہنے لگے: "ہمارے پاس صرف بچوں کے لیے کھانا ہے۔"

اس پر انصافی نے کہا: "اے آؤ، چراغ جلاؤ اور بچوں کو کھا کر ان کو مائیں توں لادو۔"

پس اس (انصافی کی بیوی) نے کھانا تیار کیا۔ چراغ بجایا اور اپنے بچوں کو ملا دیا۔ پھر وہ چراغ جھٹک کر کے لیے انھیں تو اسے بچھا دیا۔ وہ دونوں اپنے مہمان کو (بچوں کی حرکت سے) بے گھر رہنے کے لیے کو روک دیا۔ کھانا کھا رہے ہیں۔ (مہمان نے کھانا کھا لیا) اور وہ دونوں بھاری رات بھر کے لیے۔ جب صبح ہوئی تو وہ (انصافی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (مہمان کو لے کر) گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آج رات اللہ تعالیٰ تمہارے (اس) کام کی وجہ سے تمہارا (اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔) ترجمہ: اور اگرچہ وہ بھوکے بھی ہوں تو اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اور میں نے اپنے آپ کو بھوکے سے بچالیا تو یہی لوگ فلاں پالنے والے ہیں؟"

بددعا،

نقل ہے کہ کسی شخص نے حضرت ابو الدرداءؓ کو تکلیف پہنچائی۔ آپ نے کہا: "یار اللہ! اس شخص کو تیرا ہی عذاب دے اور مال بیکر عطا فرما۔" اس طرح حضرت ابو الدرداءؓ نے اس شخص کو بددعا دی کیونکہ جب یہ چیزیں کسی کو ملتی ہیں تو اس کو تکبر، غفلت، آخرت سے غافل بنا دیتے ہیں اور وہ ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔ (اس کے لیے ہلاکت اور تباہی ہے)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک درہم دھرتی ملا کر بروکھ کر دھرتی کے کراسے درہم، نو روہ چھین کر جب تک سرے پاس سے نہیں جاتے گا کہ مجھے کسی قسم کا منع نہیں پہنچا سکتا۔"

مومن اسیر ہوتا ہے،

حضرت حن بلریؓ فرماتے ہیں۔

"مومن دنیا میں اسیر کی طرح ہوتا ہے جو اپنی گردن آزاد کرانے کے لیے مدد جدر تارہا ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ سے باگڑ نہ مل جائے اسے کسی چیز کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا۔"

(مجاہد النسخ - 125)

شمس شمس در زمان

کامیابی کے لیے خصوصیات،

مشہور مغرب کے کسی نے لکھا: "کامیابی اور فخر مندی کے لیے ایک انسان میں کئی خصوصیات ہونی چاہئیں۔"

برکت کے حامل ہونا۔
وہ جسے اس کا شہادت سدا سا جواب ہے۔
ایک ایسا انسان جس کے افعال پر ہمیں ہونے لگے ہیں۔
شہ مندی سے دوچار نہیں ہوتیں اور اس کے خیالات ہلکنڈی اور اشتراک نہیں جلتے۔ ایک نایک دن ظفر مند ہو کے رہے گا۔"

نذیر سلیم - کراچی

بڑے لوگ بڑی باتیں،

"زندگی کی عظمت علم میں نہیں، عمل میں پتہاں ہے۔" (فخاس وینی بیلے)
زندگی کے بارے میں ایک چیز یہ ہے کہ اگر آپ ماسوائے بہت سے لوگوں کے کہہ اور قبول کرے سے انکار کر دیتے ہیں تو آپ اکثر اس کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

(ڈبلیو سمرٹ)

انسان وہی کہہ جاتا ہے جو کچھ وہ اعتقاد رکھتا ہے۔

(ایمنون چیک ہو)
حبیب، فغانس ہرگز تاش زکوس بلکان کی اصلاح کریں۔
(ہنری فونڈ)
لوگوں کی صحبت ایک ایسی حقیقی دنیا ہے جس میں ان کی خوشی اور بطور ایک ریاست ان کی تمام طاقت کا انحصار ہے۔

(جنس و سرائیلی)
محض ایک ہی کامیابی وجود پذیر ہے۔ آپ اس قابل ہوں کہ اپنی زندگی اپنی طرز پر گزار دیں۔
(کرسٹوفر موریلے)

کوئی بھی شخص بہتے ہوئے پانی کی ندی میں سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے مگر انسانوں کی دنیا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ (جاہانی کبادت)

وہ دوست جو آپ کو بھٹاتا ہے... آپ کو تخلیق کرتا ہے۔
(روبین ورنالڈ)

ستیدہ نسبت زہرا کبر و دریا

ہے سچ - مگر...

یہ اس ماڈن دود کی ایک واضح کڑوری ہے کہ ہم اپنی خواہشات اور ذریعہ ریاست میں فرق نہیں سمجھ سکتے۔

ہم سوچنے کے لیے زندہ نہیں بلکہ ہم اس لیے سوچتے ہیں کہ زندہ رہ سکیں۔

ان لوگوں سے عبرت پکڑو، جو دوسروں سے عبرت نہیں پکڑتے۔

کام سے غلطی، غلطی سے تجربہ، تجربہ سے عقل، عقل سے خیال اور خیال سے نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔

یہ بے شک بہت ورن تک سوچو لیکن سوچنے کے بعد تمہارا فیصلہ اعلیٰ ہونا چاہیے۔

گڑا شاہ - کبر و دریا

ہر حال میں شکر کرو،

حضرت ابراہیمؑ تجارت کی عمر سے فلسطین جاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ فلسطین گئے ہوئے تھے۔ آپ کے فرزند حضرت اسماعیلؑ نے آپ کی جگر موجودگی

میں شادی کر لی۔ جب آپ گھر تشریف لائے تو حضرت اسماعیل کو حیرت زدہ پایا۔ آپ نے اسماعیل کی بیوی سے گھر کا حال احوال دریافت کیا۔ جواب میں انہوں نے مصیبتوں اور پریشانیوں کا دروازہ شروع کر دیا۔ جب آپ واپس تشریف لائے تو پہلے وقت حضرت اسماعیل کی بیوی کو تاکید کر گئے کہ جب اسماعیل آئے تو اس سے کہہ دیں کہ آپ گھر کی چوٹ تبدیل کر لیں۔ یہ چوٹ صحیح نہیں ہے۔

جب حضرت اسماعیل گھر تشریف لائے تو آپ کی بیوی نے والد محترم کا بیچا یا جسے سن کر آپ نے خود اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور دوسری شادی کر لی۔

دوبارہ جب ابراہیم گھر تشریف لائے تو حضرت اسماعیل کو اس مرتبہ بھی غمزدار پایا۔ آپ نے حضرت اسماعیل کی دوسری بیوی سے گھر کا حال دریافت کیا تو اس نے لالہ لکھ کر لیا ابراہیم تجارت کے لیے روانہ ہونے کے تو پہلے وقت حضرت اسماعیل کی دوسری بیوی کو تاکید کر گئے کہ جب اسماعیل آئیں تو کہنا کہ اب چوٹ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔

غزوہ اتر - کراچی

گراہو القہر اٹھا کر کھانا

حضرت معقل بن یسار سے روایت ہے۔ وہ کھانا کھا رہے تھے کہ انے میں ان (کے ہاتھ) سے ایک لہر گر گئی۔ انہوں نے غصے آٹھایا اور اسے جو گرد و خراب و چیز ہٹ گیا تھا۔ دور کیا۔ پھر وہ لہر کھایا۔ زمینداروں نے ایک دوسرے کو اشارے کیے کہ (دیکھیں یہ کیا کر رہے ہیں) انہیں کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ کو درجہ صاحب (آپ) کو درست رکھے آپ کے لہر اٹھانے کی وجہ سے زمیندار ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہیں جبکہ آپ کے سامنے یہ کھانا موجود ہے پھر گرا ہوا لہر نہ اٹھانے تو کیا حرج تھا، خواجہ ان لوگوں کے مذاق کا شائبہ بنے۔

انہوں نے فرمایا میں ان غیروں کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی مدیث پر عمل کرنا ترک نہیں کر سکتا۔ ہم تو جب کسی کا لہر گرا تا تھا، اسے حکم دیا

کرتے تھے کہ اسے اٹھا کر اس پر تکی ہوئی چیز ڈھکا، خیار وغیرہ (خود کرے اور اسے کھائے) اور اسے شیطان کے لیے نہ رہے دے۔ (ابن ماجہ)

کرن، مدد کو۔ کراچی

توبہ

وہ اگر اپنی گھراپے مکمل کا باعث نہ ہو تو توبہ کا وقت ہے۔

وہ اگر مستقبل کا خیال ماضی کی یاد سے پریشان ہو تو توبہ کر لینا مناسب ہے۔

وہ توبہ منظور ہو جائے تو وہ گناہ دوبارہ سرزد نہیں ہوتا۔

وہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ توبہ شکنی ہے۔

وہ توبہ کا حیلہ خیر غرض بھی کی علامت ہے کیونکہ ہوا ہے گناہ کو گناہ نہ سمجھے وہ بد قسمت ہے۔

وہ نیت کا گناہ نیت کی توبہ سے اور عمل کا گناہ عمل کی توبہ سے معاف ہوتا ہے۔

وہ اگر انسان کو اپنے خطا کار کا گناہ گار ہونے کا احساس ہو جائے تو اسے مان لینا چاہیے کہ توبہ کا وقت آ گیا ہے۔

وہ اگر انسان کو یاد آئے کہ کامیاب ہونے کے لیے اس نے کتنے جھوٹ بولے ہیں تو اسے توبہ کر لینی چاہیے۔ (داعف علی و داعف)

سعد بن ابوب۔ میان چوں

روشنی

حضرت ابراہیم رحمہ نے موسیٰ بن یسار کو ان کے انتقال کے بعد غائب میں دیکھا اور ان سے اللہ تعالیٰ کے سلوک کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ "جس سے مراد ہوں، امر اور حیا قبول کا حساب دے رہا ہوں۔ اور ایک سو فیصد کے بدلے میں قید ہوں۔ جو میں نے مستحاری حق اور واپس نہیں کی تھی"۔

پھر انہوں نے دریافت کیا۔

"کون سے قیروں میں زیادہ روشنی ہے؟"

آپ نے فرمایا: دنیا میں مصیبت زندگی کا قہر میں انتہائی روشنی ہے"

آسیر و حکم - مزد باگ

چند باتیں زندگی کی

زندگی میں ہر خواہش پوری نہیں ہوتی مگر بعض چیزیں بغیر خواہش کے بھی قبول ہوتی ہیں۔

ہر جن کی نیت میں ایک دفعہ بھی کھوٹ آئے تو وہ مادی زندگی سفر میں رہتے ہیں۔ زندگی ان کے لیے مسافت بن جاتی ہے۔ وہ کہہ دو والی مسافت۔

ہر دوستی اور پاسے کی قدرت اور پتہ ہی ان کی خرابی ہے نہ کہ حدود و محاسن۔

ہر چیز یا گھوٹلے گراہو نہیں اٹھا سکتی اسی طرح آپ اپنے مضطرب وجود کو نہیں سنبھال سکتے۔

این آئی۔ بکر۔ مسطہ بود

علم

حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا۔

"علم کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا: علم یہ ہے کہ اگر کوئی تم پر غلہ کرے تو اسے معاف کر دو۔ اگر کوئی تعلقات توڑے تو اسے توبہ کر دو۔ کوئی تمہیں غم کر دے تو تم اسے نواز دو۔ حالات انجام ہو تو غم و دور سے کام لو۔ خطا کا سامنے آجائے تو سوجھ بوجھ کی خطا بڑی سے یا کمزور رہو اور غصے میں بھی کوئی ایسی بات نہ کرو کہ بعد میں پچھتاؤ پڑے۔

سمیرا حیات۔ دینار خود

تیز و مسافر

حضرت سعدیؒ اپنی جوانی کی عواقد بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں سفر میں تھا۔ جوانی کے جوش میں نہایت مستعدی اور تیزی سے چلا رہا لیکن بالآخر مکان کا ظہر ہوا اور میں ایک پہاڑی کے سائے میں لیٹ کر غفلت کی نیند سو گیا۔ میرے پیچھے اسی راستے پر ایک داعف مسند بونچا بھی سڑک روکتا تھا۔ اس نے مجھے غفلت کی نیند سوتے ہوئے پایا تو شانہ ہلا کر کہا۔ بیدار ہو اور مہیاں سے روانہ ہو جا۔ یہ تمام ایسا نہیں کہسے فکر ہو کر سو جائے۔ میں نے کہا کیونکر چلوں؟ مجھ پر تو سخت تھکاوٹ

طاری ہے۔ دو دن کا سفر ایک دن میں طے کرنا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ میری بات سن کر لوٹے گئے۔

"شاید تو نے داناؤں کا یہ قول نہیں سنا کہ ترک کرک کر چھوٹے"۔

میانہ روی ہر حال میں بہتر ہے۔

خوش نصیب

خوش نصیب وہ نہیں ہے اقتدار مل گیا بلکہ وہ جس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی قوم کی تقدیر بدل دی۔

(المفسر)

اقوال جبران

- کچھ بے راستوں کو خرگوش سے زیادہ سمجھتے ہیں۔
- بلی ہوئی رات بھی فطری غمزہ رات سے نہایت نہیں پاسکتی۔
- اگر جھوٹے کے سامنے گاؤ گے تو وہ اپنے پیٹ سے تمباکو اگانا لے گا۔
- ایمان، دل کے مزار میں ایک سرسبز شاداب لہر ہے جہاں دلائل کے قافلے نہیں پہنچ سکتے۔
- تم ایک نہیں دو ہو۔ ایک تاریکی میں بیدار اور دوسرا روشنی میں غافل۔
- اگر تم دیکھتے ہو جسے روشنی جاہر کرتی ہے اور وہی سننے ہو تو سننے ہو۔
- تم دیکھتے ہو نہ سننے ہو۔
- ظہم ششاد۔ سیریان



شاعری کی بلتی ہے

دعا باشتی

اداسم شاموں میں یا خوش گوار موسم کی حسین جلوں
میں کوئی یاد دل میں پھول تیار کیلے یاد دہن کر دوح
میں بچے گاڑے تو حاس دل شاعری کا سہارا لیتے ہیں۔
میری بڑی بہن اناجب شامہ ہیں۔ ان ہی کی ہاسیکو
سے آغاز کروں گی۔

ہمارے درمیان خاموشیوں کا وقفہ تھا
ہوا تھی۔ گرد تھی
اور جگر کی تہا زت تھی

نامعلوم شاعر یا شامہ کی یہ نظر مجھے اور آ کی دونوں
کو بہت پسند ہے۔ آپ کو اگر معلوم ہو تو شاعر کا نام ضرور
بتائیے گا۔
مالک میری گڑیا کے
سب رنگ سلامت رکھنا
مجھے درگت ہے
کچھ رنگ تو بارش کی لگی سی
پھیلاؤں میں بہ جاتے ہیں
اک ذرا سی دھوپ پڑے تو
اڑ جاتے ہیں
مالک میری گڑیا کے
سب رنگ سلامت رکھنا
مجھے درگت ہے

سليم کوثر ہم دونوں کے پسندیدہ شاعر ہیں خدا
دیکھیے کیا نصرت لے کر آئے ہیں۔
سے جو دل میں ہے انکھوں کے حوالے نہیں کرنا
خود کو کبھی خوابوں کے حوالے نہیں کرنا
اس عمر میں خوش فہیاں اچھی نہیں ہوتی
اس عمر کو خوابوں کے حوالے نہیں کرنا

اور خدا دیکھیے کیا خوبصورت انداز سے
ہر جہت کے حالات موافق نہیں پھر بھی
دل تیری طرف داری میں تنگ بہت ہے

یوسف ظفر ان چھوٹے انداز سے خواہش کا اظہار
کرتے ہیں۔
کبھی تم ملو تو
مسائل کو اٹھایا ہوا چھوڑ کر
چلیں اور سچ جن میں ہیں بھوک
بھولے ہمارے زمانے کی یا میں کریں
اور اک دوسرے کے مددگار ہیں
اپنے نقش پہچان کر، موجودیت رہیں
اور کسی کی صورت رہیں جو بکریاں
فنا بارہ نکوی سے میرا تعارف ہوا اور دل کو اچھا
لگا۔ آپ بھی دیکھیے
اوپر ہاتھ اٹھا کر تیرے انتظار میں
رہتے کو گھر بنائے زمانے گزر گئے
انتظار ملے گا ذکر شری محفل میں نہ ہو تو یہ زیادتی
ہے

مشق کیسا کہ بھر و سا بھی نہیں تھا شاید
اس سے میرا کون دشت بھی نہیں تھا شاید
ناگ اڑتے ہوئے بازوؤں میں دیکھا اپنے
میں کبھی گھر سے نکلتا بھی نہیں تھا شاید
زلیخت کرسٹ کے سب انداز سے اذیت
مجھ کو مرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا شاید

اور جنہو کس کرسٹ کا ذکر کر رہے ہیں۔ خدا
ملاحظہ کیجیے۔

بہت مسکراتے بہت روتے ہیں
ہم اپنے میں یونہی نہیں کھوٹے ہیں

بہنیں یاد اتنی بڑی عمر میں
کسی راست اکرام سے سوتے ہیں

بخوی سے کبیا پوچھا ہے ہیں
وہی دانے کا قیس گئے جو بولے ہیں

شعور آدمی نا تو اب ہے مگر
پڑے بوجھ کم سخت نے دھوٹے ہیں

منو جیل کی شاعری ایک خوبصورت اور پُر اثر
دول کو بکھڑے والا راز ہے۔ یہ میری بہن کہتی ہیں۔
میں خبر ہی نہیں کیسے سر بچا لے
غلاب ہاں سے سہا ہے تو گھر بچا لے

تمام عمر تعلق سے متعلق ہی ہے
تمام عمر اسی کو مگر بچا لے

ہر اہمیت اس پر گہری طویل خاموشی
یہی تو وصف میرے ہمسر بچا لے
زاد آفاق کو حضور پر چھا کر اچھا لگا۔
میں اس کے شہر میں زیر قلاب بول دیں
عجیب شخص ہے اس کو ذرا خیال نہیں

میں وہ گزرا ہوا ماحول کہاں سے لادوں
دل کو وہ رنگ وہ خوشبو وہ ہوا میں ملے

ساز بہتی کبھی خاموش نہیں وہ ملکتا
ٹوٹ بھی جائے تو کچھ اور صدا میں مانگے

شاہد بیل قریشی شاعری کا ایک خوبصورت نام۔
اور انہیں میرے مایوں ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔
سے زمین دل یہ روشن چراغ عشق کی خاطر
فور بہتاب کے رنگین مہند چھوڑے ہیں

اب کچھ متفرق اشعار۔

مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا
(عجل الیسا)
سے اس ترک رفاقت پر پریشان تو ہوں لیکن
اب تک کے جبرے ساتھ یہ جرت بھی بہت ہے
(ایرون شاکر)

خدا اور داستوں میں تلاش کر کے خاک مجھے ہیں
کہاں یہ جا کر ہے ہونے ہو سکاں سے ہم دھوٹا میں ہم

(ہمزاد مازب)
کیا اعتبار اس کو جو۔ ہاسی نہ ہیں میں
وہی ناگزیر خبرا جو نہیں سے سوتی میں
(سہ ساگ شامہ)

کے خبر تھی کسی اور کے گلے گلے کے
جبری نہاد میں بچوں کی طرح دونا تھا
(اراضی مجید)

آخر میں اپنا تعارف۔
میرا نام دعا باشتی ہے۔ فیصل آباد سے تعلق
ہے۔ کمپیوٹر سائنس میں میٹرک کا انکزام دیا ہے اور اب
ان شالہ اللہ آئی کام کا اضافہ ہے۔ پرائیویٹ اسکول
میں ٹیوٹک کرتی ہوں جو کہ ابھی انکزام سے فارغ ہو کر
شروع کی ہے۔ اس ایک شعر کے ساتھ امتحان۔
یہاں خاموش نظروں کا نظار کون بتلاے
بہت گہرے مستند کا گتہ لاد کون بتلاے
پلو ہم دیکھتے ہیں خود کو اب ہر باد کے بھی
کو ان بربادیوں میں بھی ہمارا کون بتلاے



ملک کی یون میں دلچسپی

فریب، شمع شاد
بر سال تیری یاد کے صحرے کے نام تھا
بر سال تیری دید کی چاہت رہی نہیں
ماٹ، چھوٹ
لوگوں نے جن رات نے سال کا کیا
ہم اپنے گھر میں تیرے لیے سوچتے رہے
عفت جیل
رہے کی یاد ہیں اُس کی خوش مزاجی بھی
ملا ہے جب بھی خوش فہیوں میں دل گیا
وراشہ
ہم خود ہی چلی کا سبب تھے
اُس کا ہی تصور سارا کب تھا
اب اس کے ساتھ سے تو کیا ہوا
بیلے بھی کوئی ہمارا کب تھا
سفر اکر
جگر کا ناک تو دھڑکاں کر دیتا ہے
سوئے جیسے شخص کو پستل کر دیتا ہے
پیرے عشق میں شاید کوئی بھی ہو
تیرا حق تو اب بھی پاگل کر دیتا ہے
فریا آفت
دو ہی لفظوں کا تھا وہ افسانہ
جو سننا کر خاموش ہو جیتے
ابتداء پر کہ تم کمر چاٹا تھا
انتہاء پر کہ تم اکو کھو بیٹھے
صبا طالع
اک تقریب میں کوئی ملا تھا یاد رہا
آگہ چمکا چھوٹتی تھی، سانس لگا تھا یاد رہا
نسبت گیلانی
ہندوئی کتابوں میں اُڑتی ہوئی حلیاں ڈال دیں
کس نے صوفی کی جلی ہوئی آگ میں اُڑیں ڈال دیں

نور محمد
ملک نہیں کہ کچھ لوگ بدل جاتے ہیں
کچھ لوگ وقت کے ساتھ ساتھ بدل جاتے ہیں
ان خالی باتوں کو غور سے دیکھ
کس طرح گیارہوں سے لوگ نکل جاتے ہیں
عزیزانِ راجپوت
کھلکی نہیں ہے یہ صدیوں کی مسافت ہے
کسی کی یاد کا سحر، عفت ہم سفر مری
وہی ہر وقت سوچوں پر کسی کی یاد کا پیرہ
وہی دن رات کا بیٹا بچت، ہم سفر مری
نما، انور
میں تو سائل تھا پلت بھی تو کیسے پلتا
وہ بھی مہر کی طرح آیا توں بھر پورا
پاؤں بگلائے، چلا آیا تو مری پات
میں تو بدل تھا بیش ہی سے بکھر پورا
نذر محمد
اک دو گسے کر دوں میں اُڑ گیا ہے
اک دو دے کہ گایا ہے دل کو
کوئی رشکوہ نہیں اب تو اس سے بے نیاز کا
شاید کہ اب مہر آگیا ہے دل کو
شازدانا
وقت گزرا تو یہ ملاں ہوا
ختم اک اور زندگی کا سال ہوا
کتنی شدت سے کوئی یاد آیا
آن بیتا بڑا محال ہوا
بینش
نئی رتیں، نئے خواب ہیں اور باتوں کے سلسلے
سال کوکے رنگ ہیں تیری گلاب زلفوں کے سلسلے
کبھی دن بھر تھے سوچنا کبھی رات بھر تھے پگانا
تیری یاد ہے میں ہوں اور تیری کی شان کو سلسلے

سورنادانی
تانیال محمد بالا
ہر صحت کو پھیلے ہے محبت کی فتن
دراپیرے اخبار کا کس صحت کو پھیلے
نئے سال کی دلہنیز
تجھ کو ترے مامی کا کوئی خواب سنائے
سید احمد
تجھ کو کھم کا بیلے تو بتایا نہیں جاتا
میں بیلے تو سورن سے بھایا نہیں جاتا
اب تم ہو مقابل کو کچھ پارنا ہوگا
تم کو تو میری جان اہرایا نہیں جاتا
نور شاکر
جنوری کی سردیوں میں اک آتش دان کے پاس
گھنٹن نہایتا، گھنٹے شرارے دیکھنا
جب بھی خدمت سے تو گوشہ کشی میں
یاد مامی کے پرانے گوشوارے دیکھنا
خاسلم اولوں
سردیوں کا موسم چٹا برقی ہوا میں ہیں
سال تو آج کا ہے، جنوری کی شاہیں ہیں
اوسٹون میں ہے یونے ماہ و سال زمرہ ہیں
پلے آؤ کہ صدیوں سے تری ہوئی نگاہیں ہیں
رمل شاہ
جب بھی جی میں آتا ہے میرے پاس ملتی ہو
اے شب نہتیاں کیا تیرا گھر بار نہیں ہے
کرن افضل
یوں ہی اُداس رہا تو دیکھنا اک دن
تمام شہر میں نہتیاں بچھا دوں گا
وہ دود ہی نہ رہا تو نہ اے تیرا حیات
گناں بھی نہ تھا میں تجھے بھلا دوں گا
آسیہ مایہ
مجھے تھا زلم گھر میں بکھر گیا محبت
وہ ریزہ ریزہ تھا اور اپنے اختیار میں تھا
ماٹ محمد
ایک نگاہ برقی، اک بول پھر سا
آدمی جہیں مرنا صرف خن پہننے سے

سیدہ نسبت زہرا
کس سے اس صبح آواز کی خوشبو کا کسے کی
تو اس کے ساتھ بدلے گا دل برباد کا موسم
نہ کوئی تم خزان کا کسے نہ خواہش ہے سہل و سحر
ہمارے ساتھ ہے اتحاد کسی کی یاد کا موسم
گیلائی سسرز
بھری دُنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی بڑی ہے ابھی
نورہ انور
ازل سے ہے صحت جتنو کا سفر ہے پیش پا ہوں تو
کے جبر کس کو دھونڈتا ہے میری طرف لائیاں بند
گر یا شاہ
مٹی کی جگ سانس کی خوشبو میں اُڑ کر
بھیکے ہوئے سبزے کی ترانی میں پلٹے
بونہوں کی چھا چھو سے جن کا نہ رہا ہے
اور صحت ہوا افسان کی لے میرے جانے
انور احمد
وہ ہے ارادہ سہی شیلوں میں رہتا ہے
کہ میرا دل عقیدوں میں رہتا ہے
الاؤں کے د مہر کی سردیوں میں
تیرا خیال میرے دل کے طاقتوں میں رہتا ہے
شکیلہ فزی
تہا دی بیگنی پگھلے میں نے بار بار پوچھا
کہ جتنے اور جلائے میں بھلا کیا لطف آتا ہے
بس اک جھوٹی آنکھ کے واسطے برباد ہو جانا
خودی کے زعم میں انسان کتنے دکھا تھا آپ
سورق کی شخصیت
ماڈل
فلوگرز
میک اپ
ذرا گل
موسی رضا
دوڑ بھونکی چارلو



جواز

راحت فتح علی خان بھارتی فلمی موسیقی کی ضرورت بن چکے ہیں۔ اس لیے اب اکثر ویڈیو پروڈیوسر وہ جانتے ہیں۔ اپنی ”وہاں“ موجودگی کا جواز دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں ”میں خوش قسمت ہوں مجھے اپنے تیار استاد نصرت فتح علی خان مرحوم کی طرح پہچانا جانے لگا ہے۔ مجھے شہرت اپنے ملک میں ملی لیکن جو مقبولیت بھارت میں ملی وہ اس سے پہلے میرے نصیب میں نہیں تھی۔ وہاں فنکاری کی زیادہ قدر کی جاتی ہے (آسمان پر بٹھا کر زمین پر لانا بھی وہ خوب جانتے ہیں) ان کی فلمی صنعت اور موسیقی دنیا بھر میں سنی جاتی ہے۔ تاہم مجھے اپنی مٹی سے پیار ہے۔ اس لیے وہاں کی نمائندگی حاصل کرنے کے لیے میں نے کوئی شہرت کٹ اختیار نہیں کیا۔ الحمد للہ میری ٹیکسٹ پاکستانی ہیں اور مجھے ان کی

وفات پر فخر ہے۔ میں وہاں بھی بحیثیت پاکستانی پہچانا جاتا ہوں۔ میری گائیکی پر تو بلی ٹھا کرے تک نے میری تعریف کی ہے۔ جو میرے لیے اعزاز ہے۔“ (شہرت، دولت کی چکاچوند ایسے ہی سب کو متاثر کرتی ہے کہ دشمن دوست کی تمیز بھول جاتی ہے)

کامیابی

پاکستانی کھیل مملکت حالات کی طرح ڈانواں ڈول رہتے ہیں۔ تاہم کرکٹ دنوں چین کے شہر گوانگ ڈو میں منعقد ہونے والے ایشین گیمز میں پاکستانی دستے نے مختلف کھیلوں میں کامیابی کے حصے کاڑ کر تاریخ رقم کی ہے خصوصاً ”کرکٹ اور باکس“ میں پاکستانی ٹیم نے شاندار کامیابی سے پاکستانی عوام کے دل جیت لیے ہیں پاکستانی خواتین کی کرکٹ ٹیم نے فائنل میں بنگلہ دیش کو دس وکٹ سے شکست دے کر گولڈ میڈل حاصل کیا ہے۔ جبکہ مردوں کی ٹیم تیسری پوزیشن پر رہی ہے پولیپ مارے ہے کہ ایشین گیمز میں کرکٹ کا کھیل پہلی مرتبہ متعارف کروایا گیا تھا۔ پھر عالمی کرکٹ کے خزانوں میں یہ کامیابی ہوا کے تازہ مجموعے کی مانند محسوس ہوئی۔ دوسری جانب ہاکی ٹیم نے تین سال بعد ایشین گیمز کے فائنل میں ملائیشیا کو 2-0 سے شکست دے کر گولڈ میڈل حاصل کیا ایشین گیمز میں 45 ممالک کے 14 ہزار انتہاء پس نے 42 مقابلوں میں شراکت کی مختلف کھیلوں میں پاکستان نے 17 مقابلوں میں حصہ لیا اور ہر شعبے میں کوئی نہ کوئی میڈل حاصل کیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ

اکھ ممت ضرور رنگ لاتی ہے۔ چاہے رستے میں کیسی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں۔ چین ممکن ہے کہ یہ کامیابی ورلڈ کپ مقابلوں میں مملکت میں اہم کردار ادا کر پائے۔

دعوا

بعض فنکار اپنے آپ کو ہر فن مولا گروانتے ہیں۔ اسی لیے شوہر کے ہر شعبے میں طبع آزمائی ضرور کرتے ہیں۔ اسپ شاد رخ خان بابر ٹیوا اور کار سحر اودھی کو ہی نیچے جو پریم خود خود کو ہر شعبے کے لیے فٹ سمجھتے ہیں۔ اس لیے اداکاری، میزبانی حتیٰ کہ اشتہارات میں بھی نظر آتے ہیں یا فلمیں آپ انہیں فلموں میں بھی دیکھیں گے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں۔

”میرے خیال میں انسان ایک وقت میں کئی کام کر سکتا ہے۔ دراصل اللہ نے ہمارے اندر جو صلاحیتیں دی ہیں ہم انہیں جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے (اگر واقعی صلاحیتیں ہوں تو میں نے اپنے اندر بھانکا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں شوہر میں بہت کچھ کر سکتا ہوں) وہاں تک کہ یہ کیا کیوں نہیں ہے؟ تاہم یہ فیملی ایسی بھی آسان نہیں ہے۔ ویسے بھی ہر کام میں مشکل پیش تو آتی تو ہے جس تک سوال فلموں میں کام کرنے کا ہے تو میں یہ بات دہوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا مستقبل بہت شاندار ہے۔ بس چند اچھے ہدایت کار اور پروڈیوسرز کے دوبارہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔“ (دعویٰ سے کامیابی کے قلعے فتح ہوتے تو رو تا کس



بات کا تھا

خوش بختی

علاقہ کیانی دوسروں سے زیادہ اپنی مرضی سے کلام کرتی ہیں اس لیے انی وی پر کم کم نظر آتی ہیں۔ البتہ ہر مرتبہ ان کی آمد جو نکلنے والی ضرور ہوتی ہے۔ ان دنوں وہ میوزک کے ساتھ اپنی گھریلو زندگی میں بھی مصروف ہیں۔ اس مصروفیت میں بھی انہوں نے شعیب منصور کی فلم ”بول“ کے لیے بطور خاص کلام کیا ہے اس حوالے سے وہ کہتی ہیں۔ ”میں اپنے ملک اور اپنی چیزوں کو اہم سمجھنے پر یقین رکھتی ہوں۔ اسی لیے بہت ساری آفرز کے باوجود میں نے بھارت میں کام کرنے کو فروقت نہیں دی۔ اگر کام میری مرضی کا ہو گا تب ہی مجھے قبول ہو گا۔ شعیب منصور کی فلم میں کام کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ کام میرے شوق پر مبنی ہے یعنی گلوکاری مجھے آج کل کا کاگاتے ہوئے فلمایا گیا ہے شعیب منصور نے فلم کے لیے بہت ممت

ہوتا (ملی صاحب! آپ کو ابھی بھی ہندو ذاتیت کا اندازہ نہیں ہوا؟) جس تک سوال و نامک کی ناز باحرکات کا ہے۔ ہمارے ملک میں اس سے بڑے بڑے مسائل توجہ طلب ہیں ہمیں اس بے کار کے موضوع کو زیر بحث لا کر وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔ (صحیح کہا آپ نے پاکستان کا تشخص اور نام آپ کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے جو آپ کو اس پر اعتراض ہو)

☆ کارگل جنگ میں شکست ہوئی تو مشرف اور اس کے ساتھی مجرم جرنیلوں نے نواز شریف کے گویا پاؤں پکڑ کر انہیں امریکہ بھیجا کہ کلنٹن آپ کے دوست ہیں ہمیں پھانسی (عبداللہ طارق سیل) آج ہم پوری طرح امریکہ کے شکنجے میں ہیں اور بظاہر اس سے نکلنا ممکن ہی نہیں ہے اب صورت حال یہ ہے کہ کوئی بھی اور کسی کی بھی حکومت آجائے حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے۔ (پرسش احوال حیدر اختر)

☆ رچرڈ ہسٹوکی نے افغانستان کے اسپتال میں اپنے علاج کے دوران زندگی کے آخری لمحات میں پاکستانی سرجن سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "جنوبی ایشیا میں قیام امن اور خطہ کی بہتری کے لیے ہمیں افغانستان میں جنگ روکنا ہوگی۔"

☆ موجودہ حالات پر غور کرتا ہوں تو اکثر یہ خیال آتا ہے۔ وہ فوج جو ذلت سے ہتھیار ڈال کر 2 سال قید رہی جن کو میں نے ہندو فوجیوں سے ڈنڈے اور لاتوں کھاتے دیکھا تھا اور جو واحد طور پر میرے کام سے مستفید ہوئی۔ اس نے اپنے محسن کے ساتھ جو سلوک کیا۔ وہ اس ملک کا سیاہ ترین باب رہے گا۔ نیکیناوتی میری تھی۔ میں لایا تھا اور پاکستان نے ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کیا تھا ہم نے این پی پی اور این ایس جی (NSG) پر دستخط بھی نہیں کیے تھے پھر بھی ایک کم ظرف و کلیفٹرنے مجھے ذیل کرنے کی کوشش کی۔ ناکام رہا اور خود ذلیل ہو کر چلا گیا مگر ملک کو تباہ کر گیا۔

(ڈاکٹر عبدالقدیر خان)

کی ہے مجھے یقین ہے کہ اس کا اثر بھی انہیں ضرور ملے گا۔ جس تک سوال میری ذاتی زندگی کا ہے تو میں اپنی ازدواجی زندگی سے بے حد مطمئن ہوں۔ میرے شریک حیات شوہر سے زیادہ میرے دوست ہیں۔ پھر میرے بچے نے میری زندگی میں رنگ بھریا ہے ہیں۔ (خوش قسمتی اسے کہتے ہیں)

بدنام اگر ہوں گے تو۔۔۔ علی سلیم خود کو بہت لبرل ثابت کرتے ہیں اور عموماً "بڑی سے بڑی باتوں کو چیلنجوں میں اڑا دیتے ہیں۔ لیکن کیا کریں کہ "بیک ہاس" پروگرام کی عکس بندی کے دوران وہ ہندو انتہا پسند جماعت شیو سینا سے اس حد تک جنگ آئے کہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "پاک ہندوستان کی دوستی میں سب سے بڑی رکاوٹ شیو سینا ہے جو یہ نہیں چاہتی کہ پاکستان سے بھارت کے تعلقات میں بہتری آئے۔ مجھے "بیک ہاس" کی 26 اقساط کے دوران بھارتی عوام سے بے پناہ محبت ملی۔ ان کی برداشت سلیزم دیکھ کر مجھے شدت سے خواہش ہوئی کہ کش! میں نے اپنے کیریر کا آغاز مل سے کیا



پناز کے لمبے بچے ہوئے آمیزے میں ق کر فٹ
اسٹمک کے ساتھ سرو کریں۔

چینیولی فرائیڈ فٹ

ضروری اجزا :

مچھلی 1 کلو
لیمون کارس 1
کئی لال مرچ 1
ہلدی پاؤڈر 1
نمک 1
زیر پاءؤڈر 1
انجوائن پاؤڈر 1
ٹاریل پاؤڈر 1
ٹاٹ دھنیا 1
گرم مسالا پاؤڈر 1
ہری مرچ 1
تیل 1
ترکیب :
تھننے کے لیے

لال مرچ، ہلدی پاؤڈر، نمک، زیر پاءؤڈر، انجوائن،
ٹاریل پاؤڈر، ٹاٹ دھنیا، گرم مسالا پاؤڈر، لال مرچ،
ہری مرچ کو پیس لیں۔ اسے لیمن کے رس میں
ملا لیں۔ مچھلی کو دھو کر کسی جالی میں رکھ دیں۔ تیار کیے
ہوئے سالے کو مچھلی میں اچھی طرح ملا لیں۔ مسالا
لگانے کے بعد مچھلی کو تین سے چار گھنٹے کے لیے فریج
میں رکھ دیں۔ ایک کڑائی میں تیل گرم کریں اور مچھلی
کو اس میں ڈال کر دھیمی آگ پر ق کر لیں۔ گرم گرم پیس
کریں اور مزید اڑانے سے لطف لیجئے۔

ترکیب :
مچھلی میں گرم کریم، اورک ہسن پیس، گرم مسالا
پاؤڈر، جلد تری پاؤڈر، ٹاٹا ہوا دھنیا، ہری مرچیں، اچھی
طرح ملا کر۔ کباب کی شکل میں نکالیں، ہٹائیں۔ فرائی
پین میں تیل گرم کریں۔ دونوں اطراف سے سنہری
بائل ہونے تک ق کر لیں۔ چاٹ مسالا چمڑک کر پیش
کریں۔

فٹ اسٹمک

ضروری اجزا :

مچھلی (ون لیس) 1
ہسن 1
اورک 1
پناز 1
لیمن 1
سویا سوس 1
رائی کا پیس 1
پسی ہوئی دار چینی 1
کئی ہوئی قلی مرچ 1
نمک 1
تیل 1
سرکہ 1
ترکیب :
ایک کلو
4 جوئے (کوٹ لیس)
ایک درمیانہ کھڑا (چل لیس)
4 عدد (رس نکال لیں)
کھانے کے دو چمچے
کھانے کا ایک چمچ
چائے کا ایک چمچ
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ
ایک چوتھائی پالی
کھانے کا ایک چمچ

ایک پیالے میں اورک، ہسن، لیمن کارس، رائی
کا پیس، سویا سوس، سرکہ، کئی ہوئی قلی مرچ، تیل،
نمک اور پسی ہوئی دار چینی ڈال کر اچھی طرح سے
ملا لیں۔ اس میں چوتھائی پالی تیل ڈالیں اور یکجان
ہونے تک پھینٹیں۔ مچھلی کے ٹکڑوں پر اچھی طرح
سے یہ آمیزہ ملیں اور مہرے میں پیس کر گرم ہوئے
کرل پین میں کرل کر لیں۔ جب ایک جانب سے
مچھلی کرل ہو جائے تو دوسری طرف سے آمیزے کی تہہ لگائیں۔
مچھلی کے ٹکڑے کو پیس دیں اور تیار ہونے پر اٹار لیں



اولاد آدم کی ابتدا

(40860 قبل مسیح)

جنت میں آدم و حوا کا رشتہ محض ایک رفیق کا تھا یا میاں بیوی کا اس بارے میں کہیں کوئی صراحت موجود نہیں۔ تاہم اس امر پر کم و بیش تمام مذہبی کتب مورخین اور محققین متفق ہیں کہ آدم و حوا کی ازواجی تعلقات نہ صرف ان کے زین پر انارے جانے کے بعد قائم ہوئے بلکہ اولاد آدم کی ابتدا بھی اسی واقعہ کے بعد ہوئی۔

آدم کو زین پر انارے جانے کا سال 41160 قبل مسیح تسلیم کیا جائے تو حوا سے ان کے ملن کا سال 40960 قبل مسیح بنتا ہے کیونکہ روایات کے مطابق وہ دو سو سال دوتے رہے توبہ کرتے اور ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ آدم و حوا کے ہاں پہلی اولاد ان کے ملن کے مزید سو سال بعد ہوئی تھی چنانچہ اس طرح اولاد آدم کی ابتدا کا سال اندازاً 40860 قبل مسیح قرار پایا ہے۔

شیث الہی سے حوا، جڑواں بچوں کو جنم دیتی تھیں جن میں سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئی۔ آدم کی پہلی اولاد قاتل تھا جسے قاتیل بھی کہا جاتا ہے جبکہ اس کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام یونہا رکھا گیا اس کے بعد جو جڑواں بچے پیدا ہوئے ان میں سے لڑکے کا نام ہاتیل اور لڑکی کا اقلیمبا تھا۔

ان کی آپس میں شادیوں کا جو طریقہ کار ملے کیا گیا وہ یہ تھا کہ ایک ساتھ پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کی

شادی نہیں کی جاتی تھی بلکہ ایک لڑکے کی شادی دوسری بار پیدا ہونے والی لڑکی کے ساتھ ہوتی تھی لیکن توارخ کے مطابق قاتیل اور ہاتیل دونوں ہی اپنے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکیوں سے شادی کے خواہش مند تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق قاتیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی زیادہ خوب صورت تھی اور وہ اسی سے شادی کا خواہش مند تھا کیونکہ ہاتیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی بد صورت تھی۔

بعض توارخ میں ہے کہ ہاتیل کو یہ خوف تھا کہ قاتیل نے اگر اس کی جڑواں بہن کے ساتھ شادی کر لی تو اقلیمبا کی ملکیت میں موجود مال و متاع اور بھیڑ بکریاں بھی اس کے قبضے میں چلی جائیں گی اور یہی خوف قاتیل کو بھی تھا۔ دونوں نے جب اس مسئلے کو اپنے والد کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے مشورہ کیا کہ دونوں بھائی اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی پیش کریں۔ جس کی قربانی منظور ہو جائے اسے اپنے ارادے کے مطابق کرنے کا اختیار ہے۔

دونوں نے ایسا ہی کیا۔ قاتیل اپنے کھیت کے پھل کا بدیہ لایا اور ہاتیل نے اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پھلوں سے بچے اور ان کی چربی پیش کی۔

اس زمانے میں قربانی یا نذر کی قبولیت کا الہامی دستور تھا کہ اسے کسی بلند جگہ پر رکھ دیا جاتا تھا اور آسمان سے آگ نمودار ہو کر اسے جلا دیتی تھی فقدا حسب دستور آگ نے ہاتیل کی نذر کو جلا دیا یعنی اس کی قربانی قبول کر لی۔ قاتیل اپنی یہ توجہ پروا نہ کر سکا چنانچہ اس نے اپنے بھائی ہاتیل کو قتل کر دیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ نسل انسانی کا سلاسل ایک عورت کے حصول کے لیے ہوا۔ لیکن قتل کے بعد

قاتیل جیران تھا کہ اس کی نفس کا کیا کرے کیونکہ ابھی تک نسل آدم موت سے دوچار نہیں ہوئی تھی اور اسی لیے حضرت آدم تے موت کے بارے میں کوئی حکم الہی نہیں سنایا تھا۔ ایک اس نے دیکھا کہ ایک کوئے نے زمین کرید کرید کر گڑھا کھودا جس سے قاتیل کو یہ معلوم ہوا کہ اسے بھی اپنے بھائی کی لاش کے لیے گڑھا کھودنا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ دو کوئے آسمانوں سے آئے جن میں سے ایک نے دوسرے کو مار دیا اور گڑھا کھود کر اسے دبا دیا۔ قاتیل نے یہ دیکھا اور اسی طرح کیا۔

ہاتیل کے قتل کا واقعہ ترن مجید میں بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قاتیل نے ہاتیل کو عراق کے کسی جنگل میں موت کے گھاٹ اتارا جبکہ کچھ لوگ اسے شام کے جنگلات جاتے ہیں۔ دمشق کے شہل میں جبل قاسیوں پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو قاتیل ہاتیل کہلاتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اس قتل سے سخت صدمہ ہوا اور روایتوں میں ہے کہ باقاعدہ فرشتے تعزیت کرنے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئے۔ جس مقام میں یہ ملاقات ہوئی وہ بھی جبل قاسیوں میں ہی ہے۔

توارخ میں یہ ذکر نہیں کہ قاتیل کی شادی اس کی بہن سے ہوئی یا ہاتیل کی بہن سے لیکن تورات میں کم از کم کچھ نسلوں تک اس کی اولاد کا تذکرہ سرحال موجود ہے۔

حضرت شیث علیہ السلام

حضرت آدم کے تیسرے بیٹے کا نام شیث تھا۔ ابن کثیر کے مطابق شیث کے لفظی معنی "علیہ خدا" ہیں۔ بعض توارخ کے مطابق ان کی ولادت ہاتیل کی موت کے بعد ہوئی تھی۔ اس لیے انہیں اللہ کا عطیہ قرار دیا گیا۔ البتہ یہ صراحت موجود نہیں کہ حضرت شیث کے ساتھ کوئی جڑواں بہن پیدا ہوئی تھی یا نہیں۔ بعض روایت میں ہے کہ قاتیل اور شیث کی

معاہدہ 30 برس کا فرق تھا۔ حضرت شیث علیہ السلام کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ روئے زمین کے وہ واحد انسان ہیں جن کی شادی جنت کی حور سے ہوئی تھی۔ بعض کتب میں اس حور کا نام اقلیمبا بیان کیا گیا ہے لیکن بعض روایات کے مطابق یہ اقلیمبا نہیں۔ اقلیمبا تھیں جو ہاتیل کے ساتھ پیدا ہوئیں۔

حضرت شیث نے 912 سال کی عمر پائی۔ ہندوستان کے شراب و حیا میں ایک قبر کو حضرت شیث کی قبر بتایا جاتا ہے تاہم اس بارے میں کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں۔ ان کی کئی اولادیں ہوں گی تاہم تارخ میں ان کے صرف ایک ہی بیٹے کا نام درج ہے جسے اسلامی توارخ "اتوش اور ہاتیل" اتوش لکھتی ہیں۔ اتوش یا اتوس نے 920 (بعض روایات میں 905 سال) عمر پائی۔ سیرت ابن ہشام کے مصنف ہشام بن محمد کے بقول عرب یہ شکل بولتے ہیں کہ گلی ہمارے باپ اتوش سے شروع ہوئی اور عہد چھٹی ہمارے باپ شیث کے زمانے سے حرام ہوئی۔

اتوش کے بیٹے کا نام قہبان تھا جس نے 910 سال کی عمر پائی۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے بت اس کے بیٹے کے دور میں مانے گئے اور سب سے پہلے حضرت شیث کا بت بنا کر اس کی پرستش شروع کی گئی۔

حضرت ادریس علیہ السلام :- ہاتیل کے مطابق حضرت ادریس علیہ السلام جب پیدا ہوئے تو ان کے والد یزدی عمر 132 سال تھی۔ آپ کے کئی بہن بھائی تھے لیکن ان کے نام کہیں نہیں ملتے۔ حضرت ادریس نے 365 سال کی عمر پائی اور پلا خراشد تعالیٰ نے آپ کو چوتھے آسمان پر اٹھالیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر معراج میں چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات فرمائی تھی۔

ایک غالب روایت کے مطابق حضرت ادریس علیہ السلام کا وطن وجہ و فرات کا وہ آب تھا۔ یہ علاقہ

ادارہ خصوصی تصویریں



سر دیوں کا استقبال کیجیے

ہو مہم سرا کا کفارہ ہو چکا ہے۔ یہ موسم کئی تیار یوں
مٹلا "نزلہ" نظام اور کھانسی کو بھی ساتھ لے کر آتا
ہے۔ دن میں جیسے دھوپ اور رات میں خنکی سے جسم کا
وفاقی نظام متاثر ہو جاتا ہے۔ جسم کی قوت مدافعت مستحکم
رکھنے کے لیے جسم اور ماحول کے درمیان توازن کا استعمال مفید ہوتا
ہے۔ گرمیائی موسم تو بڑے گرمیوں کا موسم اور شدید کھول کر
پیشے سے اتفاق ممکن ہے۔

سر دیوں کے لیے انتہائی کامیاب کا پہلا نسخہ انفلوینزا یا دہائی
فلو ہے۔ اس سے شناخت کے لیے آپ چائے پکاتے وقت
اس میں ذرا آبی اور کاربونیٹڈ ڈال دیں اور صبح
شام سے استعمال کیجیے۔

سر دیوں میں موسم کھانسی بھی طویل پکڑتی ہے۔
کھانسی کی شکایت گرتے گرتے تو اور دک کا عرق نکال
لیں اور اسے ہم وزن شد میں ملا کر ایک چائے کا ایک
چمچ صبح شام دیں۔ ان شاء اللہ آرام ہو جائے گا یا پھر
شد ہو گا سا گرم کر کے اس میں سفید الائچی پیس کر ملا
دیں اور ایک ایک چمچ صبح شام پلائیں یا پھر ایلے ہونے
انہی کے کی زردی لیں اور شد میں ملا کر پیچے یا بڑے چند
روز تک کھائیں تو سخت کھانسی میں افادہ ہو جاتا ہے۔

چائے توڑے کو چھلکا تارے کے بعد چھلکا شد کے
ساتھ کھائے سے بھی کھانسی میں افادہ دیکھا گیا ہے۔
اس کے علاوہ سفید خشخاش اور مصری برابر مقدار
میں لے کر پیس لیں اور دن میں دو تین بار چھلکا
کھاتے رہیں۔ اس سے کھانسی سے شفا ہو جاتی ہے۔
سر دیوں میں ایک مسئلہ جلد پر خشکی کا ہو جاتا بھی

موسم تیار کیا اس نے مقرر اس میں ایک مقابلہ منعقد
کرانے کا اعلان کیا۔ ہر شہری کو اس ٹورنامنٹ میں
شریک ہونا تھا۔ کھس نے اپنے قاصد کروڑ کے
ذریعے ہزاروں اور کرشن کو بھی ٹورنامنٹ میں بلایا۔ جو نئی
دونوں میدان میں داخل ہوئے ایک باہل اور شد زور
باہمی انہیں اپنے چھوٹے سے کچل ڈالنا اگر دونوں
بھائی اس سے بچ سکتے تو چانور اور مشینک ٹائی دو
پیلوں انہیں مقابلے کی دعوت دیتے اور کشتی کے
برائے دونوں کو مار ڈالتے۔

اسٹینڈم کے دروازے پر ایک بہت بڑی کمان رکھی
گئی تھی جسے کرشن نے ٹپک جھکنے میں اٹھا کر وہ
ٹکڑے کر دیے۔ مخالفین نے کرشن کو گرفتار کرنے کی
کوشش کی لیکن ناکام رہے اور دونوں بھائی کا اتحاد
انداز میں اندر داخل ہوئے۔ منصوبے کے مطابق پہلے
پاکل باہمی کو ان پر چھوڑا گیا۔ باہمی نے کرشن کو اپنی
سوخت میں پکڑ لیا بعد میں کرشن نے باہمی کا راستہ توڑ کر
اسی کے ہیٹ میں گھونپ دیا جس سے وہ موقع پر ہی سر
گیا۔ اسی طرح کرشن اور ہزاروں نے دونوں پیلوں کو
بھی بڑی طرح شکست دی۔ کھس اپنے منصوبے پر
یوں بلی پھرتے دیکھ کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے چانور
تھم دیا کہ برید ان سے آنے والے تمام افراد کو گرفتار
کر لیا جائے لیکن کرشن نے اپنی گوار نکالی اور پھرتی
سے وہیں پہنچ گیا جہاں کھس کھڑا دکھلاتا حالور کر رہا
تھا۔ کرشن نے کھس کو پاؤں سے پکڑا اور ٹھیکہ ہوا
میدان میں لے آیا اور چشم زدن میں اپنی گوار سے
اس کی گردن کاٹ ڈالی۔

پیش گوئی پوری ہو گئی اور کھس 'دوبی کے
آٹھویں بے کرشن کے ہاتھوں مار گیا۔ اگر زمین کی نظر
بندی ختم کر کے اسے دوبارہ تخت پر بٹھایا گیا اور یاد دہانی
رشتی 'لوہو اندھا ک' دوسرے اور مگر اقبال کے جو
لوگ کھس کے قلم و حتم سے شک آکر مقرر اسے
چلے گئے تھے واپس آئے۔



سورخ سے گرنے والا دودھ ہتھیاریوں کا ٹورنامنٹ کر رہی
جاتا ہے وہ راوہا کو یہ بھی کہیں کہ تم نے شرارتی بچہ
پیدا کیا ہے۔
کرشن نے گوگل میں بڑی پریشانی اور رتھیں زندگی
گزارتی تھیں جسے کہ کرشن باہمی بہت اچھی جانتا تھا۔
چنانچہ جب اس کی باہمی کی مدد کرنا تھا فضا میں
گھبریں تو گویا خود بخود اس کی طرف پھٹی جلی
آئیں۔ کرشن ان کے ساتھ خوش رہتا اور انہیں شک
بھی کرکے ہندو شعراء اور ادیبوں نے کرشن کی ان حرکتوں
کو کرشن کی "راس لیل" کے عنوان سے قلم بند کیا
ہے۔ یوں تو کرشن تمام گویوں سے دل بھلایا کرتا تھا
لیکن راوہا ٹائی گویا اسے بے حد پسند بھی اور وہ اس پر
خاص توجہ دیتا تھا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ کرشن
راوہا سے پیار کرتا تھا۔ دونوں کی محبت کے حوالے
سے بھی کئی داستانیں ہندو ادب میں لکھی جا چکی ہیں۔
کرشن نے یہ دودھ کو بھی بے حد پسند کیا۔ کرشن کے
ایک بھگت میر لال نے اپنے کرشن کی شرارتوں پر بہت سی
نظمیں لکھیں۔ ان میں سے ایک نظم "میتا سور" میں
میتا سور کا کہنا ہے کہ "میتا سور" ہے وہ مشہور ہے اس میں بتایا
گیا ہے کہ کرشن اپنی بیٹی دودھ کے سامنے صفائی
پیش کرتا ہے کہ وہ گویوں کے کھن کی چوری کا زہن دار
نہیں۔

کرشن کی کہانیاں گوگل سے نکل کر مقرر آتک جا
پہنچیں اور لوگوں کو پتا چل گیا کہ وہی دوبی کا آٹھواں بیٹا
ہے جس کے ہاتھوں کھس کی موت کی پیش گوئی کی
گئی تھی۔ لوگ کرشن کی شرارتوں کی کہانیاں سنتے
رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب کرشن اپنے
ہاتھوں کھس کی موت کے کھٹا تارے لگے گا۔ کھس
کو بھی اب یقین ہو چلا تھا کہ کرشن ہی اس کی موت کا
زہن دار ہو گا چنانچہ اس نے ایک "تکیم العجیبہ نبل"
یا کھل گھوڑے اور دوسری بلاؤں کو کرشن کے پیچھے بھیجا
لیکن کرشن نے ان سب کو مار ڈالا۔

ہر طرف سے ناکام ہو کر کھس نے ایک اور

کرنے کے لیے توازن و اعتدال کے ساتھ ان استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

پر سکون رہیے

یہ بالکل طے ہے کہ ذہنی دباؤ اور خفشار سے سردی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے ہر سکون رہنے سے بھی سردی کم لگتی ہے۔ ذہنی دباؤ کی صورت میں خون اعضاء سے صحت گردی کی طرف چلا جاتا ہے۔ ذہنی دباؤ سے بچئے۔ مراقبہ اور گہرے سانس کی ورزشوں سے کام لیجئے۔ ایک جگہ بیٹھ کر کڑھنے سے بہتر ہے کہ آپ کسی کام میں مصروف رہیں۔

پانی پینا

جسم میں پانی کی کمی سے خون کی مقدار اس کے گاڑھا ہونے کی وجہ سے کم ہو جاتی ہے اور اس طرح باریک رگوں میں اس کی رسد ٹھننے لگتی ہے۔ اس لیے ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ آپ دیرینہ بخیر چلے گئے صراحتی کا ٹھنڈا پانی پئیں۔ ہاں ہلکی سبز چائے دن میں ایک مرتبہ گرم شاد پھول کی کھالی کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ بغیر چینی کے گرم دودھ میں تھوڑی سی ہنسی ہوئی الائچی کا اضافہ کر کے بھی یہ کی دور کی جا سکتی ہے۔ وزن میں اضافے سے بچنا ہو تو بغیر پانی کا دودھ استعمال کریں۔ پرانے وقتوں میں خاص دودھ میں گڑ، سوٹھ اور تھوڑی سی کھلی مرچ شامل کر کے پیا جاتا تھا۔ اس سے جسم میں حرارت پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ اکثر صورتوں میں سردی سے آنے والا بخار بخیر آ کر اتر جاتا تھا۔ عرف عام میں اس مرکب کو کاڑھا کہتے ہیں۔ اس کی افادیت آج بھی برقرار ہے۔

ان تدابیر پر عمل کر کے آپ ٹھنڈے ہاتھ اور سرد پاؤں کی شکایت سے نجات پا سکیں گے۔ ان جانوروں میں انہیں اختیار کر کے صحت بخش موسم کا ٹھنڈا پینا چاہیے۔

نہیں ہو کہ اس کا ایک عام سبب دراصل خون میں فولادی کی ہوتی ہے۔ اس کی کمی کی وجہ سے خون پوری مقدار میں آکسیجن جذب نہیں کر سکتا۔ جس سے جسم میں گرمی پیدا نہیں ہوتی۔

یہاں یہ بتانا بھی مناسب ہو گا کہ بعض چین کمر کے استعمال سے بھی درجہ حرارت گر جاتا ہے۔ ہر نوع اس کیفیت سے نجات فراہم مشکل نہیں ہے۔ عام طور پر مریضوں کے مقابلے میں خواتین سردی سے زیادہ شاک ہوتی ہیں۔

حقیقت سے ثابت ہو چکا ہے کہ اسی روز تک فولادی غذاؤں کے استعمال سے خواتین میں سردی کی برداشت میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔ یہ بھی اعتراف ہوا کہ فولادی کی کمی سے خیند بھی صحیح نہیں آتی ہے۔ جسم میں فولادی کی دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مچھلی، مٹی، وائس اور ہرے پتے والی سبزیاں باقاعدگی کے ساتھ کھائی جائیں۔ کیونکہ فولاد قدرتی حالت میں آسانی کے ساتھ ہضم اور جذب ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں پالک کا ساگ فولاد کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ فولادی کی دور کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے بہت زیادہ نمون کرنا چاہئے۔

قدرتی فولاد حاصل کرنے کے لیے تازہ پالک 100 گرام باریک کتر کر فرنی چین میں تھوڑے سے تیل کے ساتھ ہلکی آگ پر پکائیں۔ جب ساگ کو ہلکا پک جائے، تھوڑا نمک اور مرچ شامل کر کے اسے تھپایا روٹی کے ساتھ کھائیں۔ اس طرح پکا ہوا یہ ساگ بڑی تیزی سے جسم میں فولادی کی دور کر دیتا ہے۔ اسی طرح خشک خوبالی کے باقاعدہ استعمال سے بھی خون میں فولادی سطح میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جسم میں فولاد کے جذب ہونے میں (وٹامن سی) بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سنترے کا رس اس کا بہترین ذریعہ ہے۔ پاکستان میں قدرت مہیاں ہے۔ جانوروں کے تھانڑی میں ہمیں بکثرت کیڑے فروڈز گریب فروٹ اور لیٹوں جیسے چل عطا کرتی ہے۔ جانوروں کا مقابلہ